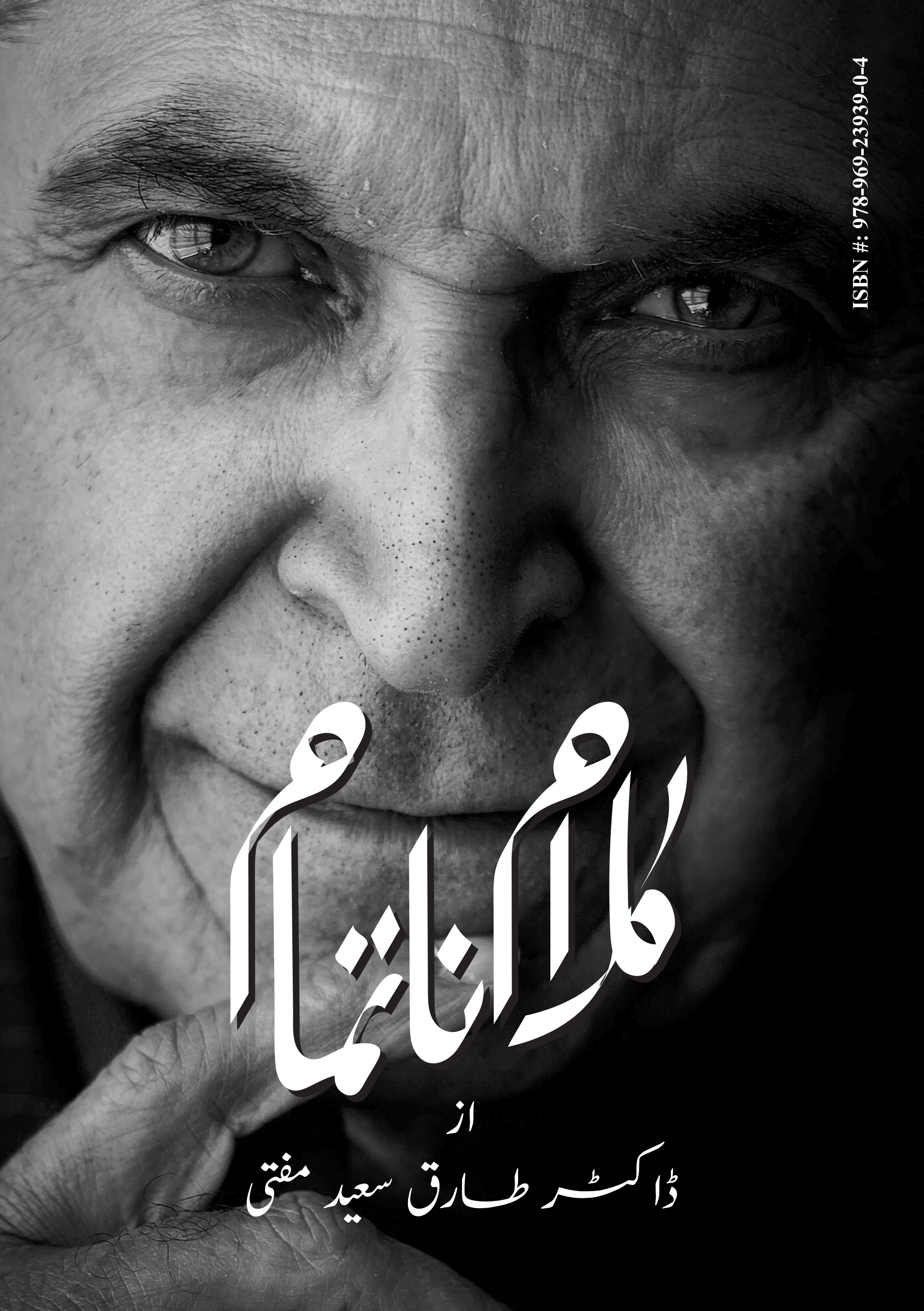


کلامِ ناتمام

از

ڈاکٹر طارق سعید مفتی

ISBN #: 978-969-23939-0-4

کلام ناتمام

از

ڈاکٹر طارق سعید مفتی

پروفیسر (ایمیریٹس)، خیبر میڈیکل یونیورسٹی و رحمان میڈیکل کالج، پشاور

مشیر تعلیم رحمان میڈیکل انسٹیٹیوٹ، پشاور، پاکستان

مصنف: ڈاکٹر طارق سعید مفتی

پروفیسر (ایمیریٹس)، خیبر میڈیکل یونیورسٹی و رحمان میڈیکل کالج، پشاور

مشیر تعلیم رحمان میڈیکل انسٹیٹیوٹ، پشاور، پاکستان

اشاعتِ اول: ۲۰۲۳ء

آی ایس بی این (ISBN): 978-969-23939-0-4

مطبع: خیبر میل پرنٹنگ پریس، پشاور، پاکستان

سرورق: ڈاکٹر عمیر ودود

اشاعت : سنڈیکیٹ آف رائیٹرز پشاور

انتساب

میرے خاندان اوران سے منسلک تمام اہل وعیال،

میرے دوست احباب اورمیرے اچھے و برے وقتوں میں کام آنے والے ساتھیوں کے نام

جن کی یادیں ہمیشہ میرے دل ودماغ میں رچی بسی ہیں۔

حافظہ ساتھ ہے تو یادوں کی بارات ہے

احساس مرنہ جائے تو پہلوئے یار آس پاس ہے

اظہار تشکر

بعد از خدائے بزرگ میں ان تمام دوست احباب کا انتہائی ممنون ہوں جنہوں نے مجھے اپنی زندگی سے متعلق لکھنے پر راغب کیا۔ خصوصی طور پر محترمہ سمیرا، محترم عبدالواحد میر اور پروفیسر سعید قریشی، ماڈرن ایج کالج گروپ ایبٹ آباد کے اصرار پر میں نے یہ تحریر کرنے کا فیصلہ کیا۔ میں اُن تمام احباب کا بھی مشکور ہوں جنہوں نے میرے استفسار پر مجھے قیمتی معلومات سے نوازا۔ میں محمد سجاد، آفیسر رحمان میڈیکل کالج اور عدیل احمد، سیکریٹیریل آفیسر، پشاور انسٹیٹیوٹ آف میڈیکل سائنسز بھی ممنون ہوں جنہوں نے اس کتاب کی نہ صرف کمپوزنگ کی بلکہ کئی غلطیوں کی نشان دہی بھی کی۔ میں مسودے کی ترتیب وتدوین کے حوالے سے اپنا قیمتی وقت دینے پر محمد عامر خان (آر یو آفیسر، آر ایم آئی) کا بھی تہہ دل سے مشکور ہوں۔ اس کتاب کی اشاعت سے متعلق قیمتی مشوروں اور کاوشوں کے لئے اپنے ایک چاہنے والے دوست اور صحافی امجد عزیز ملک کا بھی ممنون ہوں۔ میں خصوصی طور پر اپنے بھائی ڈاکٹر خالد مفتی کی قیمتی آراء کا بھی شکرگزار ہوں۔ جس کے باعث اس کتاب کے مسودے میں مزید ترمیم وتصحیح کی گئیں۔ میرے کئی ساتھیوں نے اس کتاب کا جائزہ لے کر مجھے اپنے قیمتی مشوروں سے مزین کیا۔ وہ سب قابل داد ہیں۔ آخر میں میں ان تمام شخصیات کا مرہون منت ہوں کہ جنہوں نے اپنی آراء لکھ کر اس کتاب کو زینت بخشی۔

باب نمبر	فہرست مضامین	صفحہ نمبر



۔۔۔ ورنہ ہر جا جہانِ دیگر تھا

پشاور کے محلے قدیم کا کشال میں میرے ایک دوست سعد اللہ خان رہتے تھے بہت ہی مُحبتی اور بلا کے پڑھے لکھے تھے میں نے کئی نایاب کتب ان کی لائبریری میں دیکھی تھیں میں ایک دن انہیں اپنے دوست محمد یوسف عاصی سے ملوانے گنج گیٹ کے محلہ کوٹلہ خام لے جارہا تھا، میں مینا بازار کی بغلی گلی کی طرف مڑ گیا اور چوڑی گران سے ہوتا ہوا مسجد دلاور خان کے آگے سے گزر کر گلیوں سے گنج کی طرف بڑھنے لگا ایک موڑ پر سعد اللہ جان نے مجھے روک کر کہا ''شاہ جی آپ ایک دن اس شہر کے جانے پہچانے شخص ہوں گے'' میں ہنس پڑا اور پوچھا اچانک یہ خیال کیسے آیا، کہنے لگا میں دیکھ رہا ہوں کہ اس شہر نے ابھی سے آپ پر اپنی گلیوں کے راستے کھول دیئے ہیں ابھی تو پشاور آئے ہوئے آپ کو بہت کم دن ہوئے ہیں، سعد اللہ خان کی خوش فہمی یا محبت مجھے اس وقت بہت یاد آئی جب میں اپنے دوستِ عزیز اور معروف ومقبول معالج ڈاکٹر طارق مفتی کی خودنوشت کا مسودہ پڑھنے بیٹھا، صرف ایک شہرِ پشاور تک بات محدود نہیں یہ جواں رعنا تو دنیا بھر میں جہاں جہاں بھی گیا جس شہر میں بھی قیام کیا شہر اس کے لئے اپنے راستے کھولتا رہا اور کامیابیاں اور کامرانیاں مسلسل اس پر سایہ فگن رہیں، اور اب جب وہ بیتے دنوں کو یاد کرنے بیٹھا تو بیتا ہوا سارا وقت جیسے اس کے کانوں میں سرگوشیاں کرنے اس کے پاس آبیٹھا، اور طارق مفتی ایک باکمال تخلیق کار کی طرح اپنے دھوپ چھاؤں ماضی کو کاغذی پیراہن پہنانے لگے، ویسے تو انہوں نے یہی لکھا ہے کہ وہ سکول سے کالج کے زمانے تک ڈائری لکھتے رہے مگر بعد میں یہ عادت ترک کردی لیکن طارق مفتی کی تحریر اس بات کی چغلی کھا رہی ہے کہ وہ پڑھنے کی طرح لکھنے سے بھی جڑے رہے ہیں، پھر ان کا طرز تحریر بلا کا شگفتہ ہے اور وہ اپنی کہانی کو کسی بھی لمحہ خشک اور بے مزہ نہیں ہونے دیتے، اور یہ کام وہ لفظوں کی نشست وبرخاست سے بنائے گئے اور پڑھتے ہی دل میں اتر

جانے والے فقروں سے لیتے ہیں اور پڑھنے والے جوان کی کہانی میں کھوئے ہوتے ہیں اچانک ہی ان کے ہونٹوں پر تبسم لے آتے ہیں طارق مفتی اپنی مجلسی زندگی میں بھی ہمہ وقت اپنے ہونٹوں پر ایک دھیمی دھیمی سی دل موہ لینے والی مسکراہٹ سجائے رکھتے ہیں ان کی یادداشتیں پڑھتے ہوئے ایسا لگتا ہے کہ وہ اپنی دھیمی اور گدا گداتی مسکان اپنی تحریر پر چھڑک دیتے ہیں جس کی وجہ سے اس خودنوشت کے میڈیکل کی دنیا کے سنجیدہ اور عام قاری کے لئے بظاہر خشک قصے بھی پڑھنے والے کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا دیتے ہیں لیکن ان کی تحریر کتنی بھی شگفتہ ہو کتنے بھی ہلکے اور مزاحیہ پیرایہ میں اظہار کیا جارہا ہو گویا پشاور کے سنہرے کل کی بات ہو یا پھر ہندکو زبان کے چٹخارے دار روزمرہ اور محاورں کا بیان ہو جن پر دل کھول کر ہنسنا پڑتا ہے مگر یہ بھی اتنا ہی سچ ہے طارق مفتی کی تحریر میں ایک زیریں لہر اداسی کی بھی ساتھ ساتھ چل رہی ہوتی ہے کہ کل کا وہ دلبر و دلدار اور طرحدار پشاور کہاں کھو گیا ہے، اس خودنوشت کے ساتھ میں نے جتنا وقت بھی گزارا میں ایک لمحہ بھی اس کے سحر سے نہیں نکل سکا، کسی غزل کے اچھے اشعار کی طرح میں نے قدم قدم پر رک رک کر ان نثر پاروں کو بار بار پڑھا جو پڑھنے والے کو آگے نہیں بڑھنے دیتے حالیؔ نے لگتا ہے اسی خودنوشت کے بارے میں کہا ہے ''دلکش ہر ایک قطعہ صحرا ہے راہ میں'' ہر صفحہ پڑاو کا متقاضی ہے بلکہ اس خودنوشت میں طارق مفتی کے بے ساختہ لکھے ہوئے پر تاثیر فقرے بار بار مجھے نظیریؔ نیشاپوری کا شعر یاد دلاتے رہے

زِ فرق تا قدمش ہر کجا کہ می نگرم
رشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجا ست

اس خودنوشت میں بھی بنیادی کردار اسی شہر طرح دار پشاور کا اور اس کے گلی گلیاروں، کوچہ و بازاروں اور مٹتے ہوئے آثاروں کا ہے جن میں طارق مفتی کے بچپن کی معصومانہ شرارتیں اور لڑکپن کے لاابالی پن سے لے کر جوانی کے کھلنڈرے پن تک کے سارے قصے کر ایک داستان ہوشربا بنا دیتے ہیں، پشاور کے سنہرے دور کا قصہ پڑھتے ہوئے تو یوں لگتا ہے کہ جیسے قدیم قصہ خوانی کے کسی قہوہ خانہ میں کوئی مشاق

داستان گو مسافروں کی تھکن اتارنے کے لیئے کہانی سنا رہا ہے، میں پڑھتے ہی دل میں اترنے والی اس تحریر کا طارق مفتی کی خودنوشت صرف اس لئے کہہ رہا ہوں کہ وہ اسے اپنی آپ بیتی قرار دے رہے ہیں بلکہ وہ تو ہر آپ بیتی کو ''ادھ بیتی'' قرار دیتے ہیں کہ کوئی بھی بلاکم وکاست اپنی کہانی سنانے کا متحمل نہیں ہو سکتا کیونکہ اس میں ایک نہیں کئی ایک سخت مقامات آتے ہیں، لیکن یہ کتاب بیک وقت خودنوشت بھی ہے سفرنامہ بھی اور تذکرہ بھی ہے، سفرنامہ انگلینڈ کا ہو یا سڑک کے راستے حج کا بے پناہ مشاہدہ کی وجہ سے ویڈیو فلم کی طرح آنکھوں کے سامنے چلتی پھرتی تصویریں بناتا ہے، اصفہاں کے اس حمام کا قصہ تو ''اے تھنگ آف بیوٹی۔۔۔'' کے ذیل میں آتا ہے جب کم روشنی میں سب اکٹھے نہا رہے تھے مگر تیز روشنی میں گیلے تولیے کو خشک تولیہ سے بدلتے ہوئے طارق مفتی نے وہ لمحہ بھی اپنی تحریر میں کیپچر ڈ کرلیا جب اس عمل میں گیلا تولیہ اس کے بدن سے کھینچ لیا گیا اور خشک تولیہ بھی بروقت ان کے ہاتھ نہ آسکا، یوں اس حمام میں سب نہیں وہ اکیلے ہی ننگے کھڑے تھے، اس طرح کے شوخ فقروں سے ہر قدم پر آپ کو گدگداتے رہتے ہیں وہ قصہ انگلیند میں لیٹر بکس کا پھلیکا ہو یا پھر حج کے موقع پر شیطان کا انسان کی دسترس میں آنے کا مریضوں کا احوال بیان ہو یا ڈاکٹرز مارکیٹ کا قصہ ان کا ذکر اتنی خوبصورتی سے کیا ہے کہ بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے، بعض واقعات تو بے اختیار آنکھوں میں دھواں بھر دیتے ہیں جیسے جب وہ گھر کے لئے اپنی کمائی سے فریج خرید کر لائے تھے تو لکھتے ہیں کہ جب تک فرج رہا میری والدہ ہر آنے جانے والے کو بتاتی رہیں کہ یہ اس کا بیٹا لایا ہے، سچی بات یہی ہے کہ اس تحریر کو بار بار پڑھنا مجھے بہت اچھا لگا کیونکہ ہر بار مجھے میرؔ کی طرح یہ احساس ستاتا رہا کہ

سرسری تم جہاں سے گزرے
ورنہ ہر جا جہانِ دیگر تھا

ناصر علی سیّد
مارچ 2023 کی 21ویں صبح

کلام ناتمام

سیانوں کا کہنا ہے کہ اپنی زندگی کی کتاب تحریراًبیان نہیں کرنی چاہیئے کیونکہ ممکن ہے کہ چند قارئین تو آپ کی کتاب کو ذوق وتجسس کی بناء خصوصی طور پر پڑھیں گے کچھ اپنے ذکر والے حصہ کو شوق سے پڑھیں۔ بعض از راہ تفنن آپ کو تختہ مشق بنانے کے لئے مخصوص واقعات کو ازبر کریں مگر غالب اکثریت چند سطریں بطور خوردہ چکھ کر آپ بیتیوں کو شیلف کی زینت بنا دیں گیں۔ بہرحال میرا ماننا یہ ہے کہ اگر آپ بیتی تاریخ کے سمندر میں ایک قطرہ کے برابر ہی کیوں نہ ہو تو بھی لکھ لینی چاہیئے تاکہ واقعات کی بہتر سند رہے۔ مسئلہ صرف یہ ہے کہ ہمیں وہ سب بخوبی یاد رہتا ہے جو بھولنا ہوتا ہے۔

ہائی سکول کے دور سے ہی میں اگر روزانہ نہیں تو ہفتے یا مہینے میں چند دن ڈائری لکھا کرتا۔ یہ سلسلہ میڈکل کالج کی تعلیم اور کچھ عرصہ بعد تک جاری رہا۔ڈائری ایک انتہائی نجی دستاویز ہوتی ہے اور میں نے اپنی ڈائریاں حتیٰ الوسع احباب کی نظروں سے اوجھل رکھیں۔ 1973ء کے اوائل میں حج کے سفر واپسی کے دوران دو عزیز دوستوں کے درمیان کچھ ناچاقی ہونے پر میں نے اپنے ڈائری میں دونوں کے صحیح یا غلط ہونے سے متعلق اپنی رائے قلم بند کی۔ دوست جلد ہی آپس میں گھل مل گئے اور رات گئی بات گئی۔ کچھ سفر گزرنے کے بعد ان میں سے ایک دوست نے اتفاقاً میری ڈائری کھول کر پڑھ لی اور میرے کسی جملہ معترضہ پر آگ بگولہ ہو گیا مجھے دیکھتے ہی چڑھائی کر دی۔ تب سے آج تک میں نے باقاعدہ ڈائری لکھنے کی عادت ترک کر دی۔ پہلے دور کی یہ انتہائی قیمتی ڈائریاں میری غیر موجودگی میں میری فیملی کی رہائش گاہ تبدیل ہونے کی نذر ہو گئیں۔ اور اس طرح بہت سی قیمتی یادیں بھی ہوا ہو گئیں۔

زندگی میں خصوصی، مشہور اور باکمال لوگوں کی متعلق لکھی ہوئی کئی آپ بیتیاں، جگ بیتیاں اور سفرنامے پڑھنے کا موقع ملا جن میں قدرت اللہ شہاب کا شہاب نامہ، مستنصر حسین تاڑ کے سفرنامے مثلا نیویارک کے سو رنگ، سفر شمال کے، ایپل (Apple) کے سٹیو جاب (Steve Job) کی بائیوگرافی، گاندھی کے پچیس سال، ایوب خان کی فرینڈز نا ٹ ماسٹرز وغیرہ۔ مگر شاید ہی ایک عام، غیر معروف اور کم کمال رکھنے والے شخص کی آپ بیتی پڑھی ہو۔ ممکن ہے کہ میں نے اس وجہ سے بھی اپنے متعلق کچھ لکھنے کی جرات نہ کی ہو۔ مگر پھر کئی سالوں کے مشاہدے، تجربے اور تجزیے نے میرے ذہن میں یہ بات ڈال دی کہ ہر شخص کی زندگی کے کئی واقعات باعث فیض بھی ہو سکتے ہیں۔ نیز تاریخ دان تو کسی مخصوص زاویے اور پیرائے میں اکثر و بیشتر وقت گزر جانے کے بعد کہی سنی، تحریر شدہ اور خصوصی نیت سے نوشت کالم یا کتابوں کے سہارے واقعات کے تانے بانے بنتے رہتے ہیں۔ جو کبھی تو صحیح اور کبھی محال بہ خیال ہوتے ہیں۔ اگر عام لوگ اپنی زندگی میں گزرے واقعات لکھنا شروع کر دیں تو تحقیقی نقطہ نظر سے بہتر تاریخی مواد اُن کے زمانے سے متعلق مل سکتا ہے۔

یہاں وضاحت کرتا چلوں کہ دیگر مصنفین کی طرح میں بھی اپنی آپ بیتی کا زیادہ حصہ بیان نہیں کر سکتا۔ وجوہات میں ذاتی کمزوریوں کو چھُپانے کے علاوہ دوسروں کیلئے فتنہ برپا نہ کرنا ہے۔ (کیونکہ فتنہ واجب القتل ہے)۔ اس لئے اب احساس ہوتا ہے کہ آپ بیتیاں اکثر نامکمل کیوں ہوتی ہیں۔ میری رائے میں ان کا نام "آدھ بیتی" ہونا چاہیئے بہرحال جو ممکن بن پڑا اس نظریے سے لکھ دیا۔ اُمید ہے کہ قارئین میری سوچ کے انداز اور تحریر میں رہ جانے والی کوتاہیوں کو درگزر کریں گیں۔ یہ کتاب میری ذاتی یادداشتوں اور مخصوص احساسات پر مبنی ہے ممکن ہے دیگر لوگوں کا مشاہدہ، تجزیہ اور زاویہ نظر ان واقعات اور بیانیوں کے متعلق کچھ الگ ہو جس کا انہیں حق حاصل ہے۔

7 اکتوبر 2017ء بروز ہفتہ میں ایک دیرینہ اور مُشفق دوست عبدالواحد میر سے ملنے ڈیڑھ

بجے دن اُن کے ماڈرن ایج بوائز سکول اینڈ کالج، ایبٹ آباد پہنچ گیا۔ اسی اثنا اُن کی بیگم سمیرا واحد جو اُن کی معاون پرنسپل بھی ہیں بمعہ بیٹیوں مونا، زون آ گئیں۔ میرے ایک مہربان پروفیسر سعید قریشی بھی موجود تھے۔ کھانا ہم نے اُن کے سکول کیفیٹیریا میں حسب سابق اِکھٹا کھایا اور وہیں پرانی باتیں یاد کرتے ہوئے محترمہ سمیرا نے یہ تجویز پیش کی کہ میں واقعات دہرانے کی بجائے اب ان کو قلم بند بھی کر دوں۔ یہیں سے لکھنے کی تحریک نے جنم لیا اور یوں آج میری یادداشتیں آپ کے زیرِ نظر ہیں۔ مجھے اُمید ہے کہ آپ اس کے بعض گوشے پڑھ کر محظوظ ہوں گے۔

بقول شاعر

دیمک زدہ کتاب تھی یادوں کی زندگی
ہر ورق کھولنے کی خواہش میں پھٹ گیا

طارق مفتی

19 فروری 2023ء

باب نمبر 1

پیدائش

میری تاریخ پیدائش کیا ہے اس بارے میں مجھے درست علم نہیں البتہ اس پر سب متفق ہیں کہ میں صبح کاذب کے وقت پیدا ہوا جس کی بناء پر میرے ماموں میاں اسماعیل قریشی نے میرا نام طارق یعنی صبح کی دستک دینے والا ستارہ رکھا۔ پورا نام طارق سعید اور گھریلو نام ٹیپو سلطان رکھا۔ میرے بچے اب مجھے ڈیڈی کہتے ہیں اور اہل خاندان میں لالاگل کے نام سے پکارا جاتا ہوں۔ میری والدہ کے مطابق میں سردی کے موسم میں پیدا ہوا۔ میرے والد نے سکول داخل کراتے وقت میری تاریخ پیدائش 10 مارچ 1948ء لکھوائی۔ مارچ کا مہینہ بھی پشاور میں اکثر سرد ہوتا تھا۔ میری والدہ نے کبھی اس بارے میں صحیح یا غلط ہونے کا ذکر نہیں کیا۔ البتہ میرے ماموں اسرار کرتے رہے کہ میں دسمبر 1947ء کے آخری دنوں میں پیدا ہوا۔ کسی سٹیج پر میں نے خود ہی فیصلہ کیا کہ میری تاریخ پیدائش یکم جنوری 1948ء ہے اور اسی تاریخ پیدائش کو ہی جنم دن کے طور پر مناتا رہا ہوں۔ واللہ علمً باالصواب۔

باب نمبر2

میرے شہر

میرے بچپن کا شہر پشاور

میں جس شہر پشاور میں پیدا ہوا وہ مقامی زبان میں پشورا اور پشتو میں پیخور کے نام سے جانا جاتا ہے۔مغلیہ دور میں اِسے پھولوں کا شہر بھی کہا جاتا رہا ہے۔ یہاں میں پلا بڑھا اور عمر عزیز کا آخری حصہ بھی اب یہیں گذار رہا ہوں۔ پشاور پاکستان کا چھٹا بڑا شہر اور موجودہ خیبر پختون خوا (سابق صوبہ سرحد) کا دارالخلافہ بھی ہے۔ درہ خیبر اسے افغانستان اور وسطی ایشیائی ریاستوں سے منسلک کرتا ہے۔ پشاور سے متعلق باتیں میری غیر محسوس یاداشتوں ، تاریخ سے متعلق تدریسی معلومات اور امریکہ میں مقیم ایک لکھاری، سرجن وانسانیات (Humanities) سے متعلق ڈاکٹر سید امجد حسین (المعروف آغہ جی) کا 2016ء میں تاریخ پشاور کے حوالے سے پشاور عجائب گھر میں دیا گیا ایک اہم لیکچر شامل ہے۔

موجودہ اندرون شہر پشاور سولہ دروازوں والی دیوار کے حصار میں دو ڈھائی سو سال سے واقع رہا ہے۔ دیوار شہر کے باہر کچھ نئی آبادیاں بھی میرے بچپن کی یادوں (1950ء کی دہائی) میں شامل ہیں۔

تقریباً ڈھائی تین ہزار سال پہلے پشاور ایک پہاڑی ٹیلہ (موجودہ تحصیل و گنج منڈی) واس کے پائیں وادی میں بل کھاتا ہوا دریا اور پیپل کے ایک درخت (پیپل منڈی وریتی کا کٹھہ) پر مشتمل تھا ۔باور کیا جاتا ہے کہ گوتم بدھ نے اس (پشاور) رخ اشارہ کیا تھا کہ بدھ مت یہاں سے پھیلے گا اور پھر چار سو سال بعد کنشکا بادشاہ نے شہر قائم کیا جس کا نام تب شہر پشاور نہ تھا۔ یہ پیپل کا درخت جو غالباً 90ء کی دھائی تک غلہ منڈی میں موجود تھا افسوس کہ ناہنجاروں نے اپنی تنگی دامان کو چھپاتے ہوئے اس نادر تاریخی علامت کو کاٹ پھینک دیا۔ کنیشکا کے دور میں چھ سوفٹ اونچی عظیم درسگاہ ''سٹوپا'' کے نام سے بنائی گئی جو

شاہ جی کی ڈھیری بیرون گنج گیٹ واقع تھی۔ اسکے آثار قدیمہ میرے ننھیال کے قبرستان کے پہلو میں آج بھی سیاحوں (خصوصی طور پر بدھ مت کو ماننے والوں) کا مرکز نگاہ ہیں۔ یہ شہر ماضی میں تجارتی قافلوں کے پڑاؤ کا مرکز ہوا کرتا تھا لہذا اسکی آبادی مختلف علاقوں کے لوگوں اور مختلف مذاہب کے پیروکاروں پر مشتمل تھی جب کبھی بھی افغانستان میں حکومتی انقلاب آیا تو مہاجرین کا رخ پشاور کی طرف ہوا۔ اس طرح وسطی ایشیاء اور افغانستان کی فوجوں کی باقیات بھی رہائشیوں میں شامل ہوتی گئیں

ہندکو زبان شاید لوگوں کی اسی مکس کھچڑی کا نتیجہ ہے۔ پشاوری ہندکو اپنا ایک مخصوص مرُ بیانا مزاج رکھتی ہے اور اس میں پنجابی، اردو، فارسی اور پشتو کی اصطلاحیں عام ملتی ہیں۔ میرے بچپن میں بہت کم پشتو بولنے والے پشاور کے رہائشی ہوں گے۔ شروع میں مضافات و دیگر علاقوں سے پشتو بولنے والے لوگ جب پشاور میں آباد ہوتے تو جلد ہی وہ ٹوٹی پھوٹی اور بعد میں اچھی خاصی ہندکو بولنا شروع کردیتے۔ میرے بہت سے سکول کے ساتھی فخریہ طور پہ ہندکو بول کر ہم سے داد تحسین وصول کرتے۔ پھر بھی چند الفاظ نہ بول سکنے اور سمجھنے کی وجہ سے پہچانے جاتے جیسا کہ ''متے''، ''وت''، ''کول''، ''منوں تہ تنوں''، ''اسبغول تے کچھ نہ پھرول'' ''جا او خلتے''، ''الم ترہ کیف''، ''لالے دی جان''، ''قاوا پلاوائیں'' وغیرہ وغیرہ۔ اب یہ زبان اردو کے حق میں مفقود ہوتی جارہی ہے۔ شکریہ ادا کرنا لازم ہے ہندکو دان ادارے کا جنہوں نے ''گندھارا ہندکو بورڈ'' 1993ء میں قائم کیا۔ اس ادارے نے ہندکو کی ترویج کو جاری رکھا ہوا ہے۔ منتظمین ایک ہفت روزہ اخبار بھی اسی نام سے شائع کرتے ہیں۔ اسکے علاوہ دیگر اشاعتیں مثلاً 'سرخیل' وغیرہ بھی ہیں۔ مرحوم ڈاکٹر ظہور احمد اعوان (پشوری) کی زبانی میں نے سنا تھا کہ جب وہ پی ایچ ڈی کے لئے لندن گئے اور صوتی اثرات والی مشین کے آگے اتفاقیہ کسی دوست کے ساتھ ہندکو بولے تو مشین نے اسے صوتی پیمانے پر اتنا بلند قرار دیا کہ ظہور اعوان کے گورے سپروائزر نے انہیں پشاوری ہندکو پر پی ایچ ڈی کا تحقیقی مقالہ لکھنے کا مشورہ دیا۔ ہندکو شاعروں کے سرخیل اور انیسویں صدی میں پشاور کے باسی 'سائیں احمد علی' تھے جو چاچا یونس کی گلی کے قریب کہیں رہائش پذیر

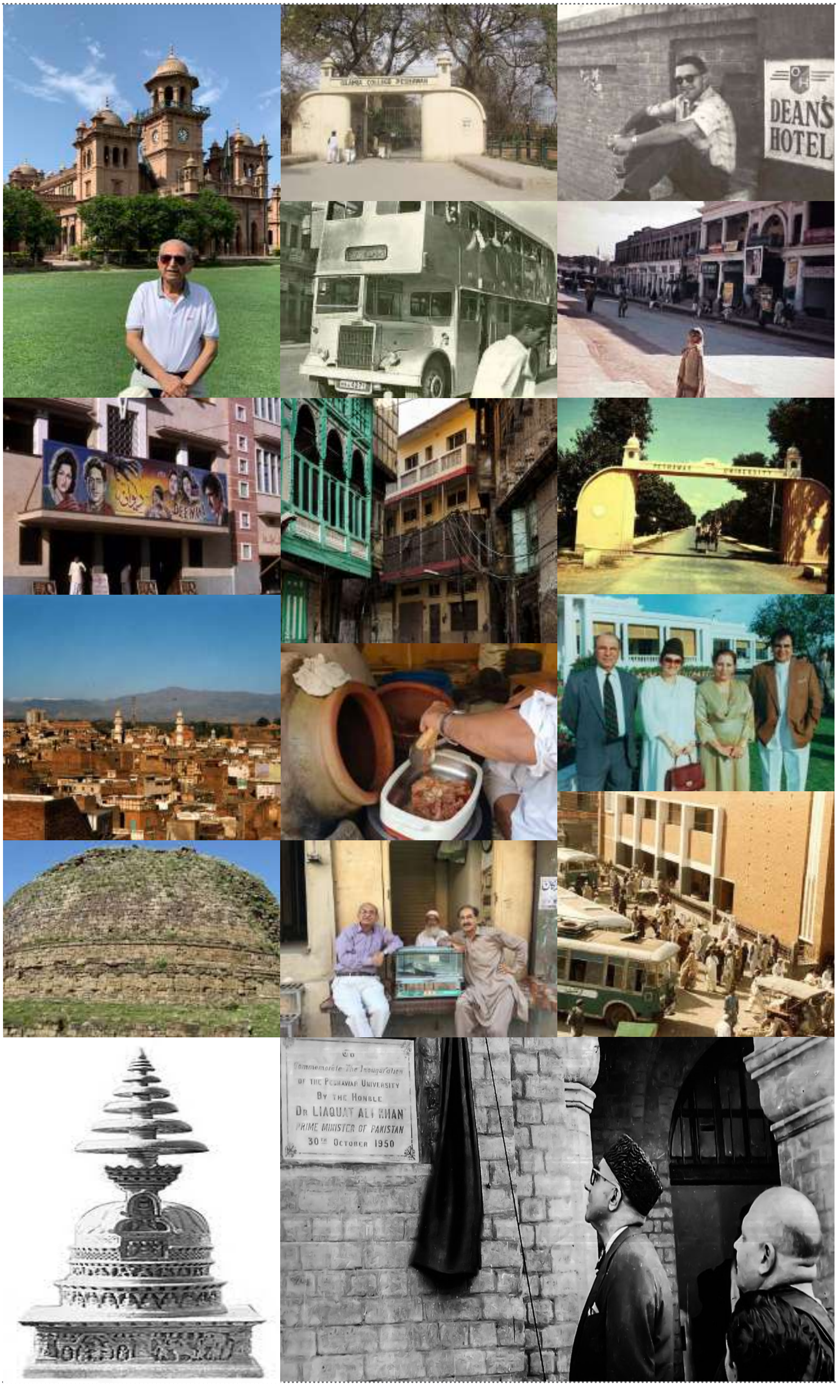
تھے اُن کا کچھ کلام اب ''گنجینہ سائیں'' کے نام سے موجود ہے۔شہر کا مرکز چوک یادگار بُدھ دور کے پیپل کے درخت کے قریب واقع ہے۔ اس سے نکل کر بہت ساری چھوٹی بڑی سڑکیں بشمول قصہ خوانی بازار چاروں طرف پھیل جاتی ہیں۔ چوک یادگار انگریز کالونی انڈیا کے پہلے گورنر جنرل لارڈ وارن ہیسٹنگ کی یاد میں انگریزوں نے بنایا۔ پیپلز پارٹی کے ایک دور میں اس یادگار کے تاریخی چبوترے کو نا معلوم وجوہات کی بناء پر وقتی طور پر ہٹا دیا گیا تھا۔بچپن اور جوانی میں میرا اکثر چوک یادگار آنا جانا لگا رہتا تھا۔ یہاں ہونے والے کئی سیاسی جلسوں میں بھی شرکت کی ان میں سے ایک خان عبدالغفار خان (باچا خان) کا جلسہ بھی تھا۔یہیں پر سیرت النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جلسوں میں مولانا کوثر نیازی کو سنا اور بعد میں محلہ ریتی میں مقیم میرے مکرم آغا جی سید ظفر علی شاہ کے گھر میں دعوتوں پر ان سے بات چیت بھی ہوتی۔ میرے دوست اصغر علی شاہ و حاجی مختیار بھی موجود ہوتے۔گھنٹہ گھر پشاور چوک یادگار سے تحصیل گور گٹھری کی طرف تھوڑی اونچائی پر کھڑا اب بھی صحیح ٹائم پہ گھنٹہ بجا رہا ہے۔اس کے نیچے ارد گرد کی آبادی میں کریم پورہ، مچھلی مارکیٹ (مچھی ہٹہ) وڈا بازار،قوالوں اور میوزک بینڈ والوں کے بالا خانے،خواتین کی اشیاءخرید فروخت کا مشہور ''مینا بازار'' آج بھی سنہرے ماضی کی یاد دلا رہے ہیں۔ بازار قصہ خوانی پشاور میں 1930ء میں ایک جلوس پر گوروں کی گولیوں سے شہید ہونے والوں کی یادگاریں اب بھی موجود ہیں۔ کابلی دروازے سے باہر تین سنیما، پکچر ہاؤس، ناولٹی، تصویر محل اور کیسینو ریسٹورنٹ جو ہم نوجوانوں کی آماجگاہ ہوا کرتے تھے اب زمین بوس ہو چکے ہیں یہاں نئی آبادی قائم ہو چکی ہے۔

میرا یہ صاف ستھرا خوش دلوں کا شہر اب مضافات اور دیگر علاقوں سے آکر بسنے والوں کی بہتات سے اپنا رنگ کھو بیٹھا ہے۔ٹاواں ٹاواں پشاوری بولنے والا بھی مل جاتا ہے۔کاش کہ وہ سب پھر سے قائم ہو جائے اور شہر کی رونقیں بحال ہو جائیں۔ بقول عبدالحمید عدم

کون کہتا ہے عمر رفتہ کبھی لوٹتی نہیں

جا میکدے سے میری جوانی اٹھا کے لا


PICTURE HOUSE
FROM THIS CITY 200 MEN WENT TO THE GREAT WAR 1914-1919 OF THESE 7 GAVE UP THEIR LIVES
TAJ SON
Old Peshawar


DEAN'S HOTEL
To
Commemorate The Inauguration
of the Peshawar University
By the Hon'ble
Dr LIAQUAT ALI KHAN
PRIME MINISTER OF PAKISTAN
30th October 1950

ایبٹ آباد۔ میرا شہر آرزو

میجر جیمز ایبٹ کے نام سے قائم کردہ 1853ء کے ایبٹ آباد سے پہلے بھی آبادی اس وادی اورش میں موجود تھی جسکا زکر تاریخی اوراق اور خصوصاً انٹرنیٹ پر خاطر خواہ موجود نہیں ہے۔موجودہ ہزارہ انگریز کے تسلط سے پہلے مسلمانوں اور سکھوں کی لڑائیوں اور مزاحمت کی آماج گاہ تھی۔میڈیکل کالج طالب علمی کے دور میں سوشل ورک کے سلسلے میں راستہ بھول کر ہم گلیات کے ایک دور دراز علاقہ باغ پہنچ گئے۔جنگل میں ایک کچے مکان کے مالک سے مدد چاہی۔اس نے مکان کے اندر اپنے عمر رسیدہ اور اندھے دادا کو بتایا کہ وادی سے کچھ لوگ آئے ہیں جس پر اس نے بیزاری سے کہا کہ '' یہ انگریز یہاں بھی آ گئے''۔شاید اس کے آباؤ اجداد انگریزوں یا سکھوں سے بھاگ کر موجودہ وادی ایبٹ آباد سے پہاڑوں میں چلے گئے تھے۔

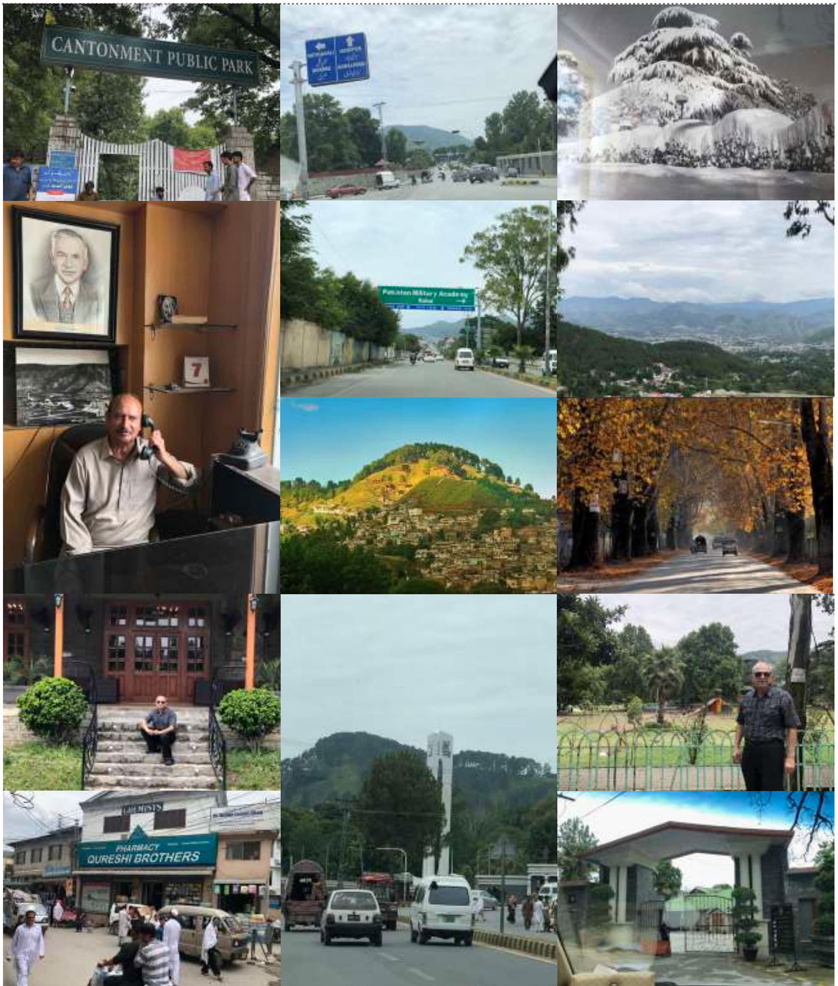
ہزارہ موٹروے حویلیاں ایگزٹ سے ایک خوبصورت بل کھاتی پہاڑی سڑک کھوتہ قبر اور سلہڈ سے ہوتی ہوئی ایبٹ آباد لاری اڈے پہ ختم ہو جاتی ہے۔ایبٹ آباد چاروں طرف سے پہاڑوں میں گھرا ہوا ہے۔ پہاڑیوں کے نام یہ ہیں۔شملہ پہاڑی، کوہ حبیبہ، کوہ سربن، میران جانی، کنج اور کیہال پہاڑی ہیں۔منٹگمری اور لائل پور شہر جن کے نام تبدیل کر کے ساہیوال اور فیصل آباد رکھ دیئے گئے کے بر عکس ایبٹ آباد کا نام آج تک نہیں بدلا گیا۔ بلکہ اب تو ایبٹ ہزارے کی ہندکو بولی کے لفظ کا تاثر دیتا ہے۔ایبٹ آباد کو City of Pines یعنی صنوبر کے درختوں کا شہر بھی کہا جاتا ہے۔تعلیمی اداروں کی وجہ سے اسے سکولوں اور کالجوں کا شہر بھی کہا جاتا ہے۔

ایبٹ آباد دو حصوں یعنی شہر اور کینٹ میں تقسیم ہے۔شہر ایبٹ آباد کی آبادی کنج، کیہال، ملک پورہ، رئیس خانہ اور صرافہ بازار پر مشتمل ہے۔جہاں تاریخی خیراتی رام بلڈنگ، گرجہ، شہزادہ صاحب دی مسجد اور سکھوں کا گوردورا ابھی تک موجود ہے۔اب مضفاتی گاؤں شیخ البانڈی، بانڈہ بٹنگ و بانڈہ سپاں بھی اس میں شامل ہو گئے ہیں۔ایبٹ آباد کینٹ میں FF، بلوچ، آرمی میڈیکل اور میوزک سنٹرز قابل ذکر ہیں۔جبکہ پاکستان ملٹری اکیڈیمی اور نواں شہر ایک علیحدہ وجود رکھتے ہیں۔اسی بازار میں ایک

شاخ لوہاراں بازار اور ایک شاخ سبزی منڈی کو نکلتی ہے۔لوئر ملک پورہ کی اونچائی چڑھتے ہوئے میرے استادمحترم اور مشہور فزیشن پشاور ڈاکٹر پروفیسر ناصرالدین اعظم خان کا موروثی گھر واقع ہے۔اپر ملک پورہ میں پاکستان کی تقسیم کے وقت مسلم لیگی لیڈر جلال بابا جو بعداز پاکستان مختلف حکومتوں میں وزیر بھی رہے کی رہائش گاہ بنام جلال بابا والا چوک، ڈاکٹر سعید احمد خان انچارج ڈاڈر سینیٹورم اور علی قلی خان ہاؤس (بیگم کلثوم سیف اللہ خان کے والد) کا وسیع گھر قابل ذکر ہیں۔اس سے اوپر شملہ پہاڑی شروع ہوتی ہے جہاں میری شروع کی یاد میں آبادی نہیں تھی۔ذوالفقار علی بھٹو نے یہاں پر فرنٹیئر ہاؤس کی بنیاد رکھی۔

تین یا چار سال کی عمر سے لے کر لڑکپن تک ہم جب بھی نتھیا گلی جو صوبہ سرحد کا گرمیوں کا دارلخلافہ ہوا کرتا تھا جاتے تھے تو ایک آدھ دن اور کبھی کبھار کئی ہفتے ایبٹ آباد میں گزار لیا کرتے تھے۔میں کئی سال ایبٹ آباد میں مقیم گرمیوں میں رہتا رہا۔کنج و کیہال، کینٹونمنٹ بازار، شیخ البانڈی، نوا ں شہر، شملہ پہاڑی اور چنار روڈ کی یادیں اس زمانے سے ہیں۔ایبٹ آباد آج کے مقابلے میں بہت محدود تھا۔ایبٹ آباد کے بازار ہرے بھرے تھے۔میں بازار میں ایک مشہور اور مشفق ڈاکٹر فتح اللہ اور نوید فوٹو گرافر قائم شدہ 1948ء کے پاس اپنے بڑوں کی وجہ سے جایا کرتا۔نوید فوٹو گرافر کے بعد کینٹ بازار میں مشہور زیدی فوٹو گرافر 1975ء میں قائم ہوا۔ایبٹ آباد کے دکانوں میں بہت معیاری اشیاء ملتی ہیں۔فردوس کیفے (جواب معدوم ہوگیا ہے) اور کاغان کیفے (موجودہ سویٹس شاپ) اپنے محسوس کھانوں کی وجہ سے سیاحوں میں مقبول تھے۔غلام حیدر، پال، ابراہیم ٹیلرز پاکستان بھر میں اپنے معیار کی بدولت پہچانے جاتے تھے۔ایوب میڈیکل کالج 1979ء کو بنا۔مختلف شہروں سے لوگ آکر ایبٹ آباد میں آباد ہوئے جس کی وجہ سے اس شہر کی تہذیب و ثقافت میں تبدیلی آئی اور اس کی آبادی بہت بڑھی۔ 1980 اور 90ء کی دہائی تک یہاں پر برساتی نالے پانی کی گزرگاہ تھے۔اب آبادی کی بڑھتری کی وجہ سے وہ برساتی نالے بند کر کے بڑے قطر کے سیمنٹ پائپ بند ہوجانے کی وجہ سے بارانی پانی تمام راستوں اور بہت ساری عمارتوں میں کھڑا ہوجاتا ہے۔

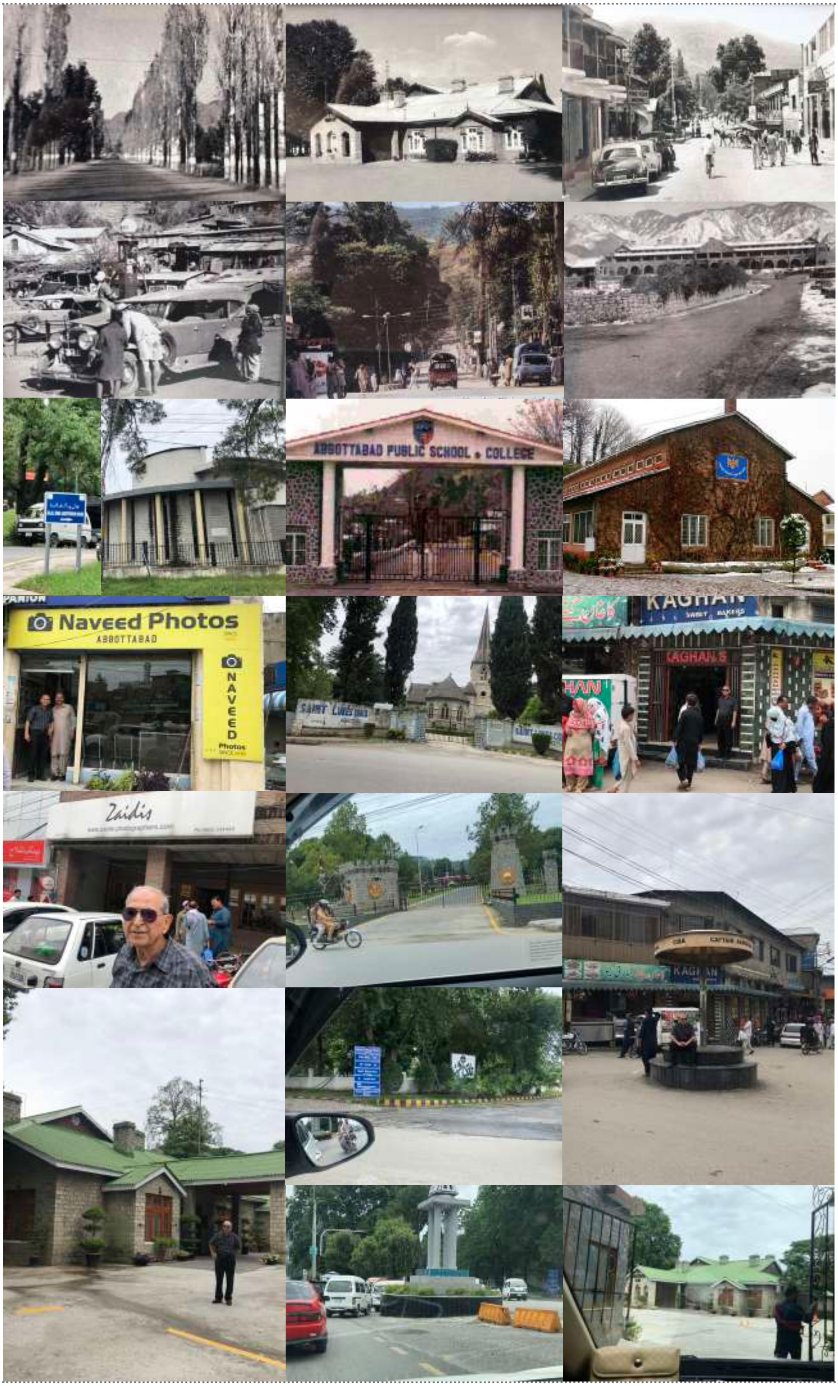
نواں شہر ایک تاریخی بستی مری روڈ سے واقع ہے جہاں سفید اور خوبصورت الیاسی مسجد بمع اپنے میٹھے پانی کے چشمے 1932ء سے اب تک سیاحوں کی آماج گاہ ہے۔میرے دوست عبدالواحد







الیاسی مسجد، نواں شہر، ایبٹ آباد


ABBOTTABAD PUBLIC SCHOOL & COLLEGE
Naveed Photos
ABBOTTABAD
NAVEED
Photos
KAGHAN
KAGHAN'S
Zaidis
KAGHAN

میر کے مطابق مسجد سے ایک فرلانگ دور ایک تاریخی جگہ کا نام چُورا اس لیئے پڑا کہ انگریز دور میں وہاں ایک مرد مجاہد کو توپ کے منہ کے آگے باندھ کر گولہ داغ دیا گیا تھا اور اس کے بدن کا چُورا اس مقام پر آ گرا۔

گرمیوں میں ایبٹ آباد اپنے خوشگوار موسم کی وجہ سے دور اور نزدیک سیاحوں کا مرکز نظر رہتا ہے۔سردی شدید ہوتی ہے۔ برف باری پہلے تو کئی بار ہوتی تھی اور اب موسم کی تفریح طبع نے اسے بہت کم کر دیا ہے۔1982ء اور چند دیگر سال مارچ اپریل اور مئی میں بھی میں نے برف باری دیکھی ہے۔آج بھی بارش کے بعد سردی محسوس طریقے سے واقع ہوجاتی ہے۔بقول کسے' جتھے مینہ او تھے سی ،یعنی جہاں ہو وہا سردی ہوجاتی ہے۔کسی فلم کے گانے کے یہ بول بھی اس بیان پر منطبق ہیں

سخت سردی پڑ رہی تھی تھا مہینہ جون کا
اور لیلہ نے پہن رکھا تھا گھگرا اون کا

انگلینڈ سے واپسی کے بعد 1981ء سے 2007ء تک مسلسل اپنی تعیناتی کی وجہ سے اور اب اپنے گھر واقع جناح آباد میں سکونت کی وجہ سے ایبٹ آباد سے منسلک ہوں۔اور اب بھی ذرا فرصت ملنے پر ایبٹ آباد روانہ ہوجاتے ہیں۔خلاصہ یہ کہ عمر کا بیشتر حصہ گزارنے کے اعتبار سے میں ایبٹ آباد کا باسی ہوں۔دعا ہے کہ اللہ ایبٹ آباد کی رعنائیاں قائم رکھے۔

باب نمبر 3

سکول سے پہلے

میری پہلی یاد کم وبیش تین سال کی عمر سے ہے جو کہ آدھی رات کو نانی کے گھر اکیلے تخت پوش پر ہلکی روشنی میں ڈر کے مارے بھاگ کر ساتھ والے گھر چلے جانا ہے جہاں تمام گھر والے کسی موقع پر اکھٹے ہوئے تھے۔(غالباً میرے بڑے ماموں جہان فانی سے رحلت کر گئے تھے)۔غیر محسوس طریقے سے کچھ نہ کچھ تعلیم تو ہو جاتی ہو گی مگر قرآنی قاعدہ و پاروں کے علاوہ دیگر باقائدہ لکھائی پڑھائی کرنا سکول سے پہلے مجھے یاد نہیں۔میں اپنی ماں سے قرآن نہ پڑھتا تھا اس لئے انہوں نے ہماری ہمسائی وایک بزرگ عزیزہ ''پھوپھو جی'' کے ذریعے مجھے قرآن (ناظرہ) پڑھوایا۔پھوپھو جی مجھے اپنے چار منزلہ گھر کے اندر کسی جگہ جب پڑھنے کا کہتیں تو میں زور زور سے قرآن پڑھتا جس سے ان کی بیٹیوں کو کوفت ہوتی اور مجھے سب سے اُوپر پانچویں منزل پر کوٹھے پر تخت پر بطور سزا بٹھا دیا جاتا۔میری اُستاتذہ یعنی ان لڑکیوں کی ماں میرے کان میں آ کر کہتیں ''پرواہ نہ کرو اتنا چلا کر پڑھو کہ آواز نیچے منزل تک اُن کو پہنچے'' اور میں اُسی طرح کرتا۔

ہر سال گرمی کے دو تین ماہ ہم آٹھ ہزار فٹ کی بلندی پر واقع، سابقہ صوبہ سرحد (موجودہ خیبر پختون خواہ) حکومت کے گرمائی ہیڈ کوارٹر نتھیا گلی منتقل ہو جاتے۔ہمارا گھر موچی ڈھارا میں تھا جو مین روڈ سے دو یا تین سو فٹ نیچے واقع تھا۔شروع سالوں میں مجھے گود اٹھا کر پگ ڈنڈیوں کے راستے روڈ تک لایا جاتا۔بعد کے سالوں میں میں اپنے بہن بھائی اور پھوپھی زادوں کے ہمراہ دور دور تک جنگلوں میں گھومتا رہا۔راستہ بھول جانا اور جنگلی جانوروں سے بھی آمنا سامنا ہونا عام تھا۔گروپ میں اکھٹے حرکت کی وجہ سے کوئی شدید واقع کبھی پیش نہیں آیا۔

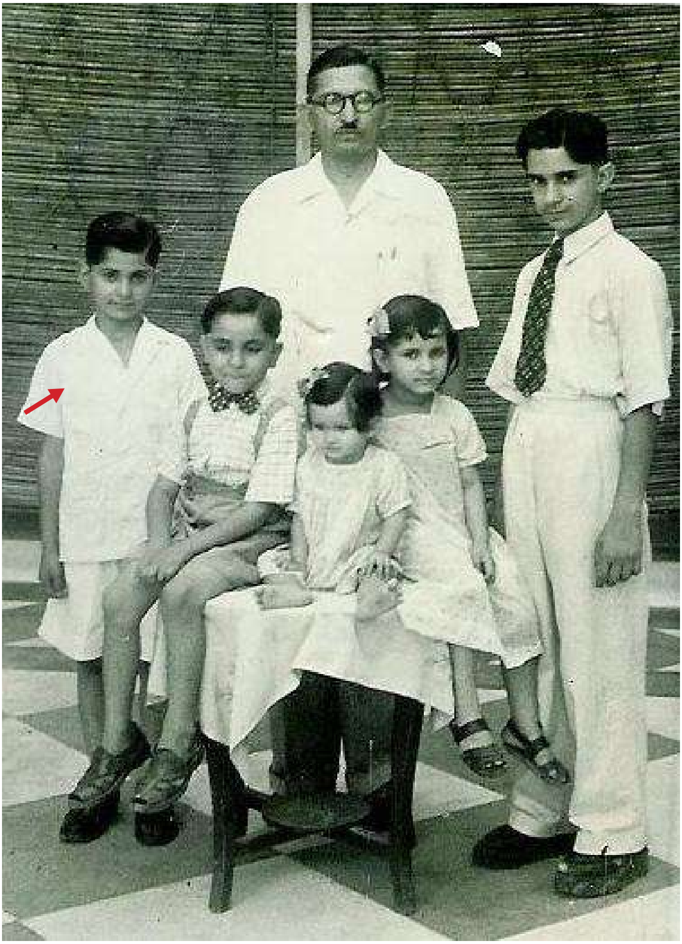
سکول سے پہلے کی تربیت میں اہم کردار میرے ماموؤں خصوصاً میاں اسماعیل قریشی کا ہے۔

میرا بڑا بھائی خالد مفتی تو رہتے ہی ویاں تھے۔مگر ہم دیگر دو بھائی بھی اکثر وہاں جاتے۔کھیل کود کے علاوہ انگریزی گرائمر و دیگر مضامین سیکھتے۔میرے بڑے بھائیوں کو شدید سزاؤں کا سامنا بھی کرنا پڑتا میں چھوٹا تھا اس لئے سزا بھگتنے سے بچ جاتا۔سب سے مشکل مرحلہ تب آیا جب میرے بڑے بھائی کے ہاتھ پاؤں سکول کا کام نہ کرنے کی وجہ سے باندھے گئے۔اُنہیں کہا گیا کہ اگر نہیں پڑھو گے تو بازار میں نان بائی کی شاگردی میں دے دیں گے۔اس بات سے ہمیں بڑا خوف آتا۔ہمیں بڑے ماموں اچھے کپڑے پہنوا کر اپنے ساتھ بڑوں کی محفلوں یا سیر وتفریح پر لے جاتے۔اس سے ایک غیر محسوس طریقے سے ہماری ذہنی، اخلاقی وآداب محفل ومُعاشرتی نشوونما ہوتی۔

ہر دو صنف کے بڑے چھوٹوں پر نظر رکھتے اور تربیت میں بھی حصہ لیتے۔محلہ کے دکاندار و دیگر لوگ ہمارے چھوٹے پن کے باوجود بہت تعظیم کرتے اور نانا کی وجہ سے اکثر چھوٹے میاں جی کہتے۔اندرون ہشتنگری میں درمیانی عمر کے چاچا غلام ربانی دودھ فروش ہوا کرتے تھے۔ہم اکثر ان سے دودھ دہی لاتے اور ان کی اصل حیثیت کا اندازہ نہ لگا پاتے۔ایک دن بازار میں کیا دیکھتا ہوں کہ فوج کی طرح وردی میں ملبوث ایک پلٹن (جیش) بڑی مستعدی سے مارچ پاسٹ کر رہی ہے۔اور اس کا کمانڈر (امیر) چاچا ربانی دودھ والا تھا جو اپنے ہاتھ میں تلوار لئے ہوئے تھا۔جبکہ اُن کے پیچھے بہت سے لوگ جن کو ہم "معززین" جانتے تھے مارچ کر رہے تھے۔خاکسار تحریک علامہ مشرقی نے شروع کی اور چلائی اور اسکے رکن ہر روز وردی پہنے بیلچے اپنے کندھوں پہ رکھے مارچ کرتے تھے۔اس کے علاوہ جیش کے اراکین دیگر فلاحی اور سماجی کاموں میں مصروف دکھائی دیتے۔مجھے اس کا اندازہ تب ہوا جب جھنڈا بازار جو ہماری نانی کی گھر محلہ عطائی خان اور کریم پورہ بازار کے درمیان واقع تھا میں آگ لگ گئی۔ خاکسار کارکنوں نے کمال جرأت اور محنت سے یہ آگ بالٹیوں میں ریت اور پانی استعمال کر کے بجھائی اور ساتھ ہی لوگوں کو بچایا اور انکی مرہم پٹی کی۔پچاس اور کچھ حد تک ساٹھ کی دہائی تک یہ لوگ نظر آتے رہے

اور پھر ان کا وجود ختم ہو گیا۔ علامہ مشرقی (انڈین سول سروس میں ملازم تھے) گورنمنٹ ہائی سکول نمبر ا پشاور شہر کے پرنسپل بھی تعینات رہے اسی سکول سے ہی میں نے تعلیم حاصل کی۔ انہوں نے تفسیر قرآن و حدیث بھی لکھی۔ کہا جاتا ہے کہ انگریزی میں ترجمہ نہ کرنے کی وجہ سے ان کو ریاضی میں تحقیق پر نوبل پرائز کے لئے نامزد نہ کیا گیا۔

ہم اسی زمانے میں ایک نئے گھر واقع E-485 سکندر پورہ جو کہ ہشتنگری اور نشتر آباد پشاور کے درمیان واقع تھا منتقل ہو گئے۔ 10 ستمبر 1973ء میرے ڈاکٹر بن کر انگلینڈ جانے تک ہم اسی گھر میں رہے۔ بچپن کی بہت حسین یادیں اس گھر سے وابستہ ہیں۔



Mufti Ihsanullah Family
Left to Right: Tariq Saeed, Ahmad Saeed, Nuzhat Liqa, Sarwat Liqa, Khalid Attaullah







Mah Liqa & Children
Left to Right: Khalid Attaullah, Ahmad Saeed, Tariq Saeed



Mamoo Ismail Qureshi
with Tariq Saeed



Grandma Ruqaya Begum
with Tariq Saeed

باب نمبر 4

تعلیم کے دن

فارورڈ پبلک سکول پشاور:۔

پرائمری سکول میں پہلے دن کا تجربہ زمین پر بچھی ٹاٹ پر بیٹھ کر چوک گنج منڈی سرکاری اُردوسکول سے شروع ہوا۔سکول ٹیچر شیر احمد صاحب نے آتے ہی لڑکوں کو ڈرانا دھمکانا اور ڈنڈے مارنا شروع کیا۔جس سے نفسیاتی طور پر سخت تناؤ میں آ کر میں سکول سے بھاگ گیا۔(اس زمانے تک گورے بھی ہمارے سکولوں کی ڈنڈے کے زور پر سیکھنے والی زبردستی تعلیم کے حامی اور داعی تھے)۔گھر آ کر ماں سے کہا کہ میں سکول دوبارہ نہیں جاؤں گا۔نیتجتاً میرے والد مجھے سفید قمیض ،ٹائی وشارٹ پہنوا کر پشاور میں نئی قائم ہونے والی ایک سکول ''فارورڈ سکول'' واقع بیرون آسامائی گیٹ ومتصل لیڈی ریڈنگ ہسپتال لے گئے ۔جلد ہی میں ایک ایسے کمرے میں تھا۔جس میں ہر طرف خوبصورت کھلونے تھے اور میں ان سے کھیل رہا تھاماحول اچھا تھا۔سکول داخل ہوگیا۔سکول کیسے آتا جاتا مجھے یادنہیں ۔البتہ سکول کے اندر کھیل کود اور شروع میں کھلونوں سے شغل اچھی طرح یاد ہے۔اب سوچتا ہوں کہ یہ اٹلی کی مانٹیسوری (Montessori) نامی تعلیمی ماہر کا شروع کردہ طرزِ تعلیم تھا جسے فارورڈ سکول کے مالک وبانی پرنسپل محترم شفیع صابر نے پشاور میں متعارف کروایا۔آج مانٹیسوری کا چرچا ہر جگہ عام ہے ۔ پرنسپل شفیع صابر کی شخصیت شکل وصورت اور رویہ ذہن پہ ابھی تک نقش ہے۔بطور انسان وبطور پرنسپل انہوں نے بہت عزت کمائی۔ان کے شروع کردہ سکول وکالج کی اب بہت سی شاخیں اعلی ومفید تعلیم مہیا کررہی ہیں۔اُن کی پوتی رحمان میڈیکل کالج میں میری ایم بی بی ایس کی طالبہ رہی ہے۔فارورڈ سکول میں تعلیم کے چار سال بہت پرلطف رہے۔مس راحت آغا اوران کی بڑی بہن سلطانہ انتہائی معزز ٹیچر تھیں۔اُن کے طریقہ تعلیم اور اُن کی شخصیت ذہن میں خوبصورت ،دلچسپ یادیں اُجاگر کرتی ہیں۔اُس سکول میں ڈنڈا یا سزا نام کی کوئی چیز

مجھے یادنہیں ۔نیلے رنگ کا ایک چھوٹا سویٹر مجھے کسی عزیز نے بنا کر دیا۔جس کے اُوپر سفید رنگ سے انگریزی میں طارق خوبصورتی کے ساتھ لکھا ہوا تھا۔اس کی وجہ سے میں سارے سکول میں ہر کسی کا مرکز نگاہ رہتا۔دوسری یا تیسری جماعت میں ایک جونیئر طالبہ جو میری عزیزہ بھی تھی جسے میں جانتا تھا نے کلاس چہارم کے ایک فربہ جسم بچے کی شکایت کی ۔میں نے اشتعال میں اُس کو گنے کا ٹکا زور سے مارا جس سے اُسکی بھنوؤں کے اُوپر پیشانی پر زخم آ گیا۔وہ میرا خاصا دشمن بن گیا۔مگر چونکہ میری ٹیچرز مجھ پر مہربان تھیں ۔مجھے کوئی سزا نہ ملی۔

گلہری کا جنازہ: ایک خاص واقعہ یوں ہے کہ جب سکول احاطہ میں واقع پیپل کے درخت پر دوڑ کر چڑھنے والی بڑی گلہری کسی حادثے کی وجہ سے مرگئی تو تمام اساتذہ اور سینئر طلباء نے مل کر باقاعدہ طور پر اُس کی تجہیز اور تکفین کی رسومات ادا کیں اور احاطہ سکول میں اسکو دفن کیا۔اس موقعہ پر چاول بھی پکائے گئے ۔یہ ہم بچوں کیلئے نہ صرف محظوظ کن ،دلچسپ اور عجیب تھا بلکہ غیر محسوس طور پر ہمیں ایک حقیقت سے بھی آشکارا کیا گیا۔کئی سالوں بعد ایبٹ آباد میں جب میرے ایک دوست نسیم گل خان مرحوم کی بیٹی کی بلی کے مرنے کا واقعہ ہوا۔غم سے بچی ہلکان ہورہی تھی ۔میں بلوایا گیا۔میں نے گلہری والے واقعہ کے پیش نظر نسیم گل خان کو باقاعدہ اہتمام سے بلی کو دفن کرنے کا مشورہ دیا۔اور یوں گلہری والے واقعہ کا ایکشن ری پلے ہوا۔اس سے کم ازکم ایک بات سمجھ آئی کہ جانوروں سے محبت بھی ایک ایسا جذبہ ہے جو کبھی چھپائے نہیں چھپ سکتا۔

اس کے علاوہ کلاس میں پریزنٹیشن دینے کا طریقہ بھی تھا۔اگرچہ اُس وقت آڈیو اور ویڈیو ملٹی میڈیا نہیں تھا۔لیکن بچوں کو کھڑا کر کے اُن سے غیر نصابی ونصابی دونوں موضوعات پر بولنے کو کہا جاتا تھا۔ ڈسپلن کے لحاظ سے وقت کی پابندی وڈریس کوڈ یعنی یونیفارم جو سفید قمیض اور گہرے ملائیشیا رنگ کی نیکر جبکہ لڑکیوں کیلئے ایک خاص نیلے رنگ کی قمیض وسفید شلوار وسردی میں نیلے رنگ کا سویٹر شامل تھا۔اساتذہ کا

لباس بہت ہی مہذب اور متاثر کن تھا مزید یہ کہ سکول کے بچوں کو کھلونوں کے ذریعے تربیت دی جاتی تھی۔

پرائمری سکول کے دور میں ہمارے ماموں میاں اسماعیل قریشی کو جب بھی موقع ملتا انگریزی گرائمر سکھاتے۔ طریقہ کار کیا تھا مجھے زیادہ یاد نہیں۔ مگر اُن کی وجہ سے ہم سب کی انگریزی کی بنیاد بہت مضبوط ہوئی۔ اسی طرح میرے چھوٹے ماموں میاں یوسف قریشی جو پیار اور خلوص کے مظہر تھے اور دینی تعلیمات اور معاشرتی آداب کو بڑی سادگی و روانی سے سمجھا دیتے تھے۔ اُن سے ہم نے حسن اخلاق سیکھا۔

گورنمنٹ ہائی سکول نمبر ا پشاور شہر:۔

1958ء میں فارورڈ سکول سے چہارم کرنے کے بعد میرے والد گورنمنٹ ہائی سکول نمبر ایک واقع جی ٹی روڈ لے گئے۔ پرنسپل صاحب نے پرتپاک استقبال کیا۔ پانچویں جماعت کے سیکشن اے میں ماسٹر جماعت علی شاہ جو میری نانی کے شاگرد بھی تھے مجھے لے کر ایک کلاس روم کے اندر لے گئے۔ سب طرف نسبتاً اندھیرا لگ رہا تھا۔ کیونکہ میں تو سفید قمیص اور خوبصورت لباسوں کا عادی تھا اور یہاں ہر کسی نے بمعہ میرے ملیشیاء کے گرے رنگ کے کپڑے اور نیلی ٹوپیاں پہن رکھی تھیں۔ کلاس میں بچے بھرے ہوئے تھے۔ ایک لڑکا جس کا نام یاد نہیں مانیٹر تھا اور ڈنڈا ہاتھ میں اُٹھائے باقیوں کو کنٹرول کر رہا تھا۔ کسی بات پہ اُس نے مجھے بھی ڈنڈا مار دیا۔ میں کلاس سے باہر بھاگا۔ ماسٹر جماعت علی شاہ مجھے بڑی مشکل سے کلاس میں واپس لائے اور مانیٹر کو برا بھلا کہا۔

پانچویں جماعت میں سکول ہی کے اُوپر والی منزل پر واقع گیلری میں ہماری کلاس ہوا کرتی تھی انگریزی کے اُستاد ماسٹر جی ایم جان (جن کا انتقال 2017ء میں ہوا) طالب علموں کو غیر نصابی سرگرمیوں میں مصروف رکھتے جن میں گانے، اداکاری، ثناء خوانی اور دیگر فنون شامل ہوتے۔ مجھ سے ہمیشہ ریڈیو پاکستان کی طرح انگریزی میں خبریں سنانے کو کہتے۔ اور میں کچھ یوں کہتا۔

"This is Radio Pakistan. Here is the news, read by Jehan Ara Saeed"

اس کے بعد وہ قہقہے مار کر ہنستے ۔کئی دفعہ کوئی دوسرا ٹیچر کلاس میں آتا تو پھر مجھے یہی کرنے کو کہتے اور پھر وہ دونوں ہنسنے لگتے ۔ مجھے کچھ معلوم نہیں پڑتا کہ کیوں ہنستے ہیں ۔کئی سال گزرنے کے بعد جب مجھے احساس ہوا کہ "جہاں آرا سعید" ایک عورت کا نام ہے۔ مجھے اس کی بجائے کسی مرد نیوز ریڈر کا نام لینا چاہیئے تھا۔تو میں نے خود بھی اپنے آپ پر ہنسنا شروع کر دیا اور آج تک ہنس رہا ہوں۔ پانچویں جماعت کا ایک اور واقعہ ہے کہ میرے بھائی خالد عطاء اللہ مفتی نے مجھے کہا کہ روزنامہ شہباز میں سے اقوال زریں یاد کرو۔ اگلے دن پتہ چلا کہ سکول میں بزم ادب کا جلسہ فٹ بال گراؤنڈ میں منعقد ہو رہا ہے۔ گراؤنڈ کے اونچے پلیٹ فارم پر کرسیاں لگی تھیں جن پر صدر محفل کے علاوہ میرا بھائی بطور جنرل سیکرٹری اور کچھ دوسرے عہدیداران بیٹھے تھے۔ جلسے کی کارروائی کے دوران اچانک سٹیج سے اعلان ہوا کہ "اب آپ کے سامنے کلاس پنجم کا طالبعلم طارق سعید مفتی اقوال زریں پیش کرے گا"۔ چند لمحے کیلئے میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ بہرحال سٹیج پر جانا پڑا۔ میں قد میں اتنا چھوٹا تھا۔ کہ سٹینڈ والے مائیک کو جب میرے منہ کے قریب لایا گیا تو وہ گر پڑا۔ بعد میں جب میں دسویں جماعت میں تھا تو اسی بزم ادب کا صدر بنا اور امامت حسین جنرل سیکرٹری کے عہدے پر فائز ہوا۔ گورنمنٹ سکول میں داخلہ کے بعد محسوس ہوا کہ اساتذہ مختلف سوچ کے حامل تھے۔ کلاس روم میں تعلیم خاصی حد تک روایتی تھی ۔ چند اساتذہ اپنے طور پر غیر نصابی سرگرمیوں کا انعقاد کرتے۔ ڈسپلن رکھنے کیلئے سختی کی جاتی تھی ۔ ڈنڈے کا استعمال عام تھا اور کئی دفعہ ڈنڈے اور تھپڑ پڑنے کی وجہ سے طلباء زخمی بھی ہو جاتے ۔ایک ماسٹر صاحب کے تھپڑ کھا کر میرے بہت سے کلاس فیلو بہرے بھی ہو گئے۔طلباء پر ہر وقت پرنسپل اور اساتذہ کا ڈر اور خوف طاری رہتا البتہ ایک بڑی خصوصیت یہ تھی کہ پڑھائی آج کل کے دور کے وضع کردہ انگریزی سکولوں کے نظام

سے کچھ زیادہ مختلف نہیں تھی۔ ہاں البتہ یہ ضرور ہے کہ جی ایم جان جیسی شخصیات کم ہی تھیں۔ انہی دنوں اُردو کے ایک ماسٹر ہم سے اُردو کی نوٹ بک میں گھر کا کام دیتے ہوئے صفحے کے حاشیوں پر خوبصورت رنگین گلکاری کرنے کو کہتے تھے۔ چاہے اصل اُردو کا کام ہم نے صحیح کیا ہو یا غلط لیکن گلکاری نہ کرنے پر سخت سزا ملتی تھی۔ مجھے کئی بار چینی کا پرمٹ لانے کو بھی کہتے جس کا اختیار میرے والد صاحب کے پاس تھا اور میں اُن کیلئے لے آتا اور اس طرح مجھے گلکاری نہ کرنے پر بھی اکثر معافی مل جاتی۔ ایک بار میرے والد نے انکار کر دیا۔ تب کیا تھا کہ مجھے گھر کا کام ڈبل ملنے لگا اور گلکاریاں بھی اُسی حساب سے زیادہ ہوگئیں اور یوں میں نے پھول بنانا سیکھ لئے۔ سکول میں میرا قریب ترین دوست شیقو (محمد شفیق) تھا۔ (اُس کا تفصیلی ذکر کہیں اور آئے گا) وہ میرے گھر کے قریب نشتر آباد میں رہتا تھا۔ پانچویں کلاس سے لے کر دسویں کلاس تک یوں سمجھیں کہ ہم جڑواں تھے۔ ایک ڈیسک پہ سب سے آگے بیٹھتے اور اگر نشست بدل جائے یا ڈیسک پیچھے ملے تو ہر جتن کر کے دوبارہ اکھٹے ہو جاتے۔ ایک دن شیقو نہیں آیا۔ میرے ساتھ ایک اور طالب علم بیٹھ گیا۔ ماسٹر جاوید صاحب کا پیریڈ تھا۔ وہ اکثر کام دے کر کلاس سے چلے جاتے تھے۔ طالب علم نے کہا کہ میں پانی پی کر آتا ہوں۔ میں اپنا کام کرتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد وہ واپس آ گیا اُس کی حالت ابتر تھی پسینے پسینے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں اور وہ لرز رہا تھا۔ میں نے پوچھا کہ کیا ہوا ہے تو گھبراہٹ میں کہنے لگا کہ بس کچھ کر آیا ہوں ''سه مے او کړل''۔ اتنے میں کلاس ماسٹر واپس آ گئے۔ اور میں کام میں مصروف ہو گئے۔ کچھ وقت کے بعد دو سپاہی پرنسپل کے ہمراہ کلاس میں داخل ہو گئے۔ طالب علم نے اُن کو دیکھا اور مجھے کہا ''خدائیے له ما بچ که۔ته او وایه چی زه چرته نه یم تلے''۔

یعنی'' مجھے بچالو اور کہو کہ میں کہیں نہیں گیا تھا''۔ سپاہیوں نے ماسٹر جاوید کو کہا کہ اس طالب علم پر قتل کا الزام ہے اور ہم اسے گرفتار کرنے آئے ہیں۔ پرنسپل بشیر حیدر نے ماسٹر جاوید سے کہا کہ تم کلاس چھوڑ کے تو

نہیں گئے تھے۔ظاہر ہے اُس نے کہنا تو ہی تھا کہ ''ہرگز نہیں''۔ ماسٹر جاوید نے پوچھا کہ" یہ کب ہوا؟" سپاہی نے جواب دیا"ابھی ابھی"۔ماسٹر جاوید نے تصدیق کی کہ یہ لڑکا تو کلاس سے باہر گیا ہی نہیں۔ سپاہیوں نے مجھ سے پوچھا کہ آپ کا ساتھی کلاس سے باہر گیا تھا۔ میں نے پکا منہ بناتے ہوئے کہا بالکل نہیں میں تو یہیں بیٹھا تھا۔ سپاہی چلے گئے۔ماسٹر جاوید نے بھی کوئی نوٹس نہ لیا۔گھنٹی بجی اور کلاس ختم ہوئی۔ یہ تفریح کا وقت تھا۔ساری کلاس بھاگ کر باہر چلی گئی۔میرے بنچ فیلولڑکے نے مجھے گلے لگ کر رونا شروع کر دیا۔میں نے پوچھا کیا ہوا ہے کہنے لگا "میں نے اپنے باپ کے قتل کا بدلہ لینے دشمن کو قتل کر دیا ہے۔میں تمہارا بہت مشکور ہوں کہ تم نے مجھے بچا لیا"۔ میں نے ڈر کے مارے یہ بات کسی کو حتیٰ کہ شیقو کو بھی نہیں بتائی۔ یہ غالباً ساتویں کلاس کی بات تھی۔

ایک اور واقعہ یوں ہے کہ انہی دنوں چرچا ہوا کہ ہمارا سکول ایک ڈرامہ " **ہوش میں آ انسان** " منعقد کرے گا۔ہم بھی ہفتے میں ایک یا دو بار سکول کی اُوپر والی منزل کے ہال میں جاتے تھے۔میرے بھائی خالد مفتی بھی اُس ڈرامے میں شامل تھے۔آخر کار ڈرامہ گورنمنٹ ہائی سکول نمبر ۲ (سابقہ خالصہ سکول) جو ہمارے سکول کے متصل تھا کے ہال میں پیش کیا گیا۔میرے والدین اور میں ڈرامہ دیکھنے گئے۔شہر کے دوسرے لوگ بھی موجود تھے۔ڈرامے کے شروع میں ایک بہت ہی زوردار آواز میں جب یہ شعر اس زوردار آواز میں پڑھا گیا

اُلجھے ہوئے کچھ اور زمانے کے طور ہیں
اِس رہ گذر میں ہوش کا دامن بچا کے چل

میں کانپ سا گیا۔اس ڈرامے میں آگے چل کے میرے بھائی کے کردار نے ایکٹنگ کرتے ہوئے سٹیج پہ گر کر مر جانا تھا اور جوں ہی یہ ہوا میں نے رونا چلانا شروع کر دیا۔

انہی سالوں میں ہم نے اپنے کچھ کلاس فیلوز جن میں جاوید صدیقی، ان کے بھائی پرویز صدیقی (مرحوم) اور یوسف سیٹھی شامل تھے نے جاوید صدیقی کے گھر واقع محلہ باقر شاہ میں ادبی محفلیں منعقد کرنا شروع کر دیں۔ کچھ لکھتے اور پڑھ کر سناتے۔ ہم میں سے کسی نے تجویز پیش کی کہ کیوں نہ ایک اخبار چھاپا جائے۔ ہمارے ایک کلاس فیلو کے والد چوک یادگار پشاور شہر میں اخبار و رسائل کا اسٹال لگایا کرتے تھے۔ انہی کی وساطت سے "شہباز اخبار" میں میرا کالم بھی شائع ہوا۔

سال 1961ء میں ملکہ برطانیہ و ڈیوک آف ایڈن برگ پاکستان کے دورے پر آئے انہوں نے پشاور کا دورہ بھی کیا جہاں انکا والہانہ استقبال کیا گیا۔ ڈیوک نے ہمارے سکول کے بڑے گراؤنڈ میں منعقدہ تقریب میں شرکت کرنا تھی۔ انگریزی اچھی طرح بولنے کی وجہ سے مجھے سپاس نامہ پیش کرنے کے لئے چنا گیا۔ ڈیوک تقریب کے لئے نہ آیا۔ بحر حال تمام طلباء کو رنگ برنگے تحفے ملے۔ ہر طالب علم کو ایک ڈبہ جن میں رنگ برنگی پنسل نما چیزیں تھیں، تقسیم کئے گئے انکے استعمال کی سمجھ کسی کو نہ آئی، اساتذہ کو بھی معلوم نہ تھا یہ کیا ہے؟ فیصلہ کیا گیا کہ بچے چکھ کر دیکھیں کہ شاید کھانے کی چیز ہو جب چکھا تو انتہائی برا ذائقہ تھا۔ بعد میں پتہ چلا کہ یہ کاغذ پر پینٹنگ کرنے کے لئے موم سے بنی پنسلیں تھیں جسے انگریزی میں Pestils کہتے ہیں۔ کلاس نہم میں پی ٹی ماسٹر شدید پی ٹی کرواتے تھے۔ پی ٹی سے بچنے کیلئے میں نے سول ڈیفنس کے زیر اہتمام ہونے والے سینٹ جان ایمبولینس فرسٹ ایڈ کے کورس میں اپنا نام شامل کروا دیا۔ میں بعد میں ٹیم کا کیپٹن بن گیا۔ دوران کورس ہمیں سخت تربیت دی گئی جس میں اپنے سے بھاری جسم والے زخمی لوگوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ ہاتھوں پر اُٹھا کر لے جانا، سٹریچر کے ذریعے زخمی مریضوں کو محفوظ مقامات پر منتقل کرنا اور کپڑے کے گول پائپ نما لمبی غار جسے شوٹ کہتے تھے کے ذریعہ آگ لگی اونچی بلڈنگ سے متاثرین کو کھلی جگہ سلائیڈ کر کے بچانا، مریضوں کی بنیادی مرہم پٹی کرنا اور سانس کی بحالی کرنا بھی شامل تھا۔ مقابلے میں ہماری ٹیم پشاور ڈویژن میں اول آئی۔ انعامات ملے۔ اس کورس کی وجہ

سے 1965ء کی پاک بھارت جنگ میں جب میں سول ڈیفنس فورس میں شامل ہوا تو ڈاکٹر شاہین جو ہمارے علاقے کے چیف وارڈن تھے نے مجھے سیکٹر وارڈن مقرر کر دیا۔ کندھوں پر سٹار کے علاوہ وردی پر ایک ترچھی بلٹ لگائی گئی۔ میرے بھائی خالد سعید گل بھی اس میں شامل تھے۔ سول ڈیفنس کے ڈائریکٹر صلاح الدین صاحب سے بھی شناسائی ہوئی۔ جو کئی سالوں بعد ایبٹ آباد میں دینی و علمی محفلوں میں دوبارہ ملاقات کا باعث بنی۔

اب ایک انتہائی اہم واقعہ کی طرف آتا ہوں جس نے میری زندگی کی روش تبدیل کی۔ ہوا یوں کہ کلاس نہم میں ماسٹر یوسف علی شاہ ہمیں سائنس اور ریاضی پڑھاتے تھے۔ انہیں غالباً بی ایڈ یا ایم ایڈ کے کورس کیلئے کراچی بھیجا گیا اور تمام سال ہمیں یہ مضامین نہیں پڑھائے گئے۔ اُنہوں نے جاتے وقت ہمیں اپنا پتہ لکھوایا اور کہا کہ آپ مجھے خط لکھ سکتے ہیں۔ میں نے بازار سے ایک خوبصورت رائیٹنگ پیڈ خریدا ایک خط انہیں لکھا اور چھ پیسے والے ڈاک کے لفافے میں ڈال کر بھیج دیا۔ کچھ دن بعد ایک پوسٹ کارڈ ملا جس میں ان کی طرف سے جواب لکھا تھا۔ "برخوردار طارق۔ میں آپ کی طرح ایک مالدار آدمی نہیں ہوں کہ خوبصورت رائیٹنگ پیڈ والے کاغذ پر جواب اور چھ پیسے کا لفافہ خرید کر بھجوا سکوں۔ لہذا تین پیسے کے پوسٹ کارڈ پر جواب دے رہا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ بڑی خوبصورتی کے ساتھ ماسٹر صاحب نے مجھے کفایت شعاری سکھا دی۔ کلاس دہم میں کسی وجہ سے جب ہمیں امتحان سے پہلے تیاری کے لئے چھٹیاں نہیں دی گئیں تو میں نے دیگر طلباء کے اُکسانے پر احتجاج کرنے کیلئے سب کو اپنی ٹوپیاں پھاڑ دینے کو کہا۔ ساتھ ہی ان سے وعدہ لیا کہ میرا نام کسی کو نہیں بتائیں گے۔ اس بارے میں بہت جلد اساتذہ اور پرنسپل کو پتہ چل گیا ۔ ماسٹر یوسف علی شاہ نے کہا کہ ابھی سب ٹھیک کرتا ہوں کلاس میں آئے پوچھا کس نے ٹوپی پھاڑنے کو کہا۔ کسی نے جواب نہ دیا۔ اُنہوں نے سب بچوں کو ہاتھوں پر دو دو ڈنڈے مارنا شروع کر دیئے۔ کئی چھوٹے لڑکوں نے ڈنڈے تو کھا لئے مگر میرا نام نہیں بتایا۔ مگر ہماری کلاس کے سب سے

بڑے اور جسمانی طور پر مضبوط طالب علم جسے ہم 'کنگ' کہتے تھے کی باری جب آئی تو اُس نے ڈر کے مارے میرا نام لے لیا۔ اب سب کو چھوڑ کر ماسٹر یوسف علی شاہ نے مجھے نہ جانے کتنے ڈنڈے مارے کہ میرے ہاتھوں پر نشان پڑ گئے۔ پانچ سال میں کبھی کسی نے مارا نہیں تھا۔ ساری کلاس چلی گئی میں ڈیسک پر سر رکھ کر سسکتا رہا۔ فیصلہ کیا کہ یوسف علی شاہ سے ٹیوشن نہیں پڑھوں گا۔ گھر گیا تو والد صاحب نے پوچھا کیوں نہیں؟۔ میں نے اُنہیں ہاتھ دکھائے۔ اُنہوں نے واقعہ مجھ سے سُنا اور فیصلہ صادر کیا کہ اسی اُستاد سے پڑھو گے۔ یوں اس قابل قدر اُستاد نے میری زندگی کو ایک نئی جہت دی۔ میں نے اپنی MHPE کی تحقیق کو والدین کے علاوہ ماسٹر یوسف علی شاہ کے نام سے منسوب کیا ہے۔

سکول میں اساتذہ مختلف لباس پہن کر آتے لیکن یہ لباس معقول وصاف ستھرا اور اکثر شلوار قمیض ہوتا۔ اساتذہ مختلف العمر تھے جو بہت سینئر تھے۔ اُن کے لباس پہننے کا انداز ان کی خصوصی پہچان تھی۔ اُستادوں کے مختلف نام رکھنا عام تھا۔ مثلاً ماسٹر عبدالسلام ترکی ٹوپی پہنتے۔ ان کو سب ترکی ٹوپی کے نام سے جانتے، بہت محترم، اعلیٰ اور ممتاز اساتذہ تھے۔ باوجود ان کے طرح طرح کے ناموں کے سب طلباء اُن کی بہت عزت کرتے اور ادب سے بات کرتے۔ دیگر چند اساتذہ میں گل افضل خان، عبداللہ جان، جان محمد، حمدانی صاحب، امیر حمزہ اور مفتی داؤد شامل تھے۔ یہ سب اساتذہ حقیقی معنوں میں طلباء میں بہت مقبول اور قابل قدر تھے۔ یہ بات میں آج ہی نہیں کہہ رہا بلکہ مجھے اور میرے ساتھیوں کو اُس وقت بھی اُن کے اعلیٰ مرتبت ہونے کا احساس تھا۔ پانچویں جماعت میں پرنسپل یا وائس پرنسپل کا نام سلیمان صاحب تھا۔ اور ان کے بعد پنجاب کے رہنے والے بڑے قدوقامت والے بشیر حیدر سرخ وسفید انگریزی لباس میں ملبوس ایک انتہائی بارعب پرنسپل تھے ان کے بعد پشاور شہر کے رہنے والے امداد حسین بیگ پرنسپل بن گئے وہ بھی اچھے خاصے قدوقامت کے تھے۔ سوٹ پہنا کرتے تھے۔

غیر نصابی تربیت کی اگر بات کی جائے تو سکول ڈرامہ وادبی سوسائٹی پرنسپل امداد حسین بیگ کے

زمانے میں عروج پر تھیں۔انہیں ہر ہفتے سکول کے درمیان والے کھلے صحن میں کوئی نہ کوئی شو کرانے کا بڑا شوق تھا۔ایک دفعہ ایک کرتب گر آیا اور اُس وقت ہماری چیخیں نکل گئیں جب اُس نے تین تیز دھار تلواریں اپنے منہ اور حلق سے گزارتے ہوئے پیٹ تک اُتار لیں۔مختلف شعبدہ بازوں کو باہر سے بلوا کر کرتب، جادوگری اور خصوصی فنکاری کے شو کرائے جاتے تھے۔نیم تعلیمی سرگرمیوں میں پی ٹی لازمی تھی۔ اگر چہ گیمز غیر لازمی تھیں۔مگر ہر کوئی کھیلتا تھا۔

اس کے علاوہ دیگر سرگرمیاں مثلاً فرسٹ ایڈ کورس یا بوائز سکاؤٹس بھی ہوتے تھے۔بزم ادب کی نشستیں سب سے زیادہ پُر اثر ہوتی تھیں۔سکول کی طرف سے تقریری مقابلوں میں حصہ لینا معمول تھا۔جس میں ایک بار میرے علاوہ امامت حسین اور ایک طالب علم، استاد گل افضل خان کی نگرانی میں گورنمنٹ کالج ایبٹ آباد کے تقریری مقابلے میں حصہ لینے گئے اور انعامات بھی جیتے۔

چونکہ شہر پُر امن تھا۔لہذٰا طلباء کے مختلف گروپس آپس میں بعد از سکول ملتے اور گلی کوچوں میں کھیلتے۔شاہی باغ پشاور میں فٹ بال و کرکٹ، ہاکی وغیرہ عصر کے وقت کھیلی جاتی۔وہاں صوبائی اور قومی سطح کے پروفیشنل مقابلے بھی ہوتے جس میں ہم بطور تماشائی جاتے۔چند طلباء باقاعدہ پروفیشنل ٹیموں میں ہوا کرتے تھے۔جس میں موجودہ بریگیڈیئر (ر) سعد الہادی و کرنل (ر) نجم الہادی دونوں بھائی عثمانیہ کلب سے کھیلا کرتے تھے۔میں ہاکی کھیلتا تھا۔شاہی باغ میں میرے علاوہ چند اور نوجوان جیسے جاوید شیروانی۔ حمید و سراج (مرحوم) پروفیشنل ٹیموں کے ساتھ ٹریننگ کرتے۔پولیس کی ٹیم کے مشہور قومی سطح کے کھلاڑی سخاوت علی سخی، مصطفی اشرف، کرنل امان اللہ اور بنوں سے پاکستان کی قومی ٹیم کے بریگیڈیئر عبدالحمید حمیدی اکثر کھیلنے آتے اور ان کی وجہ سے ہمارا کھیل بہتر ہوا بلکہ سیکھنے کا موقع بھی ملا۔شاہی باغ میں جم خانہ کلب کے اندر ٹینس کورٹ تھے۔یہ کلب ممبران کے لئے تھا جس کے عہدے دار مقامی ممتاز شخصیات ہوا کرتی تھیں۔ اس طرح یہ قطعی غلط نہ ہوگا کہ پرائمری اور سیکنڈری سکول دونوں میں تربیت کے لحاظ سے نصابی اور غیر نصابی

سرگرمیاں آج کے مقابلے میں کہیں زیادہ بہتر ہوا کرتی تھیں۔ میں نے 1963ء میں پشاور بورڈ سے میٹرک کا امتحان 646 نمبر لے کر اعزازی طور پر پاس کیا۔

ایڈورڈز کالج پشاور:۔

1963ء میں ایڈورڈز کالج میں داخل ہوا۔ ایڈورڈز کالج 1840ء میں قائم ہوا اور پشاور کا قدیم ترین کالج تھا۔ مشنری ہونے کی وجہ سے اسے گورے چلاتے تھے۔ میں گورنمنٹ سکول سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد جب ایڈورڈ کالج جیسے ماڈرن اور ناموراداے میں گیا تو کالج کی عمارات اور لان دیکھ کر مرعوب ہو گیا۔ جلد ہی کلاس میں انگریزی سکولوں سے آئے ہوئے طلباء کو الگ اور اردو سکول والوں کو الگ کر دیا گیا اردو سکول سے آنے والوں کو گرمیوں کی چھٹیوں میں انگلش کورس کرنا تھا۔ ایک انتہائی خوشنما، خوش لباس اور خوش اخلاق انگلش ٹیچر ضیاءالقمر جنہوں نے بعد میں اداکاری کے میدان میں بھی بڑا نام کمایا سٹائلش انگلش بول کر ایک ماہ میں ہمیں اچھا خاصا رواں کر دیا۔ میرے جیسے طلباء جنہوں نے اس کورس کا خاطر خواہ کا فائدہ اُٹھایا تو انگریزی بولنے کے حوالے سے بھی خاصا اعتماد آ گیا۔ کالج میں شروع ہونے کے چند روز بعد تعلیم میں میری تھوڑی سی عدم دلچسپی کی بناء پر مجھے پرنسپل فلپ ایڈمنڈ کے دفتر آنے کا بلاوا آ گیا۔ جونہی میں دفتر میں داخل ہوا۔ ایک زیادہ عمر کا انگریز کاغذ پر کچھ لکھ رہا تھا۔ میری طرف دیکھا تو میں نے کہا "I am Tariq Saeed Mufti"

اُس نے جواب میں کہا "Have you come to Die?"

میں نے فوراً اعتماد سے کہا "No sir, I have come to live"

اُس نے ہاتھ سے پین چھوڑ دیا اور ہنسنے لگا (بعد میں پتہ چلا کہ انہیں مسکرانے اور ہنسنے کی عادت ہی نہیں تھی) انہوں نے مجھے سمجھایا کہ یہ موت والا "Die" نہیں ہے بلکہ یہ دن والا "Day" ہے۔ میں ان کے آسٹریلوی انداز بیاں کو سمجھ نہیں پایا تھا۔ کچھ دیر گفتگو ہوئی وہ سمجھ گئے کہ میرا رجحان پری انجینئر نگ کی

طرف نہیں ہے۔ غالباً میرے والد کو وہ پہلے سے جانتے تھے۔ انہوں نے ٹیلیفون پر والد صاحب سے گفت گو کی اور پھر مجھ سے صلاح ومشورہ کرنے کے بعد مجھے پری میڈیکل کلاس میں بھجوادیا اور اس طرح میری زندگی کا ایک نیا سفر شروع ہوا۔ پرنسپل فلپ ایڈمنڈ آسٹریلین تھے۔ اوران کی اہلیہ ہاسٹلوں کی نگہبان تھیں اس کے علاوہ دیگر گوروں میں ایک انگلش ٹیچر مسٹر سکاٹ نیوزی لینڈ سے تھے۔ ایڈورڈز کالج کا مقابلہ اسلامیہ کالج پشاور یونیورسٹی سے ہوتا۔ گورنمنٹ کالج پشاور اُن دنوں نیا نیا بنا تھا۔ اور موجودہ پارلیمنٹ بلڈنگ میں قائم ہوا تھا۔ شاہی باغ پشاور کے قریب اس کی نئی بلڈنگ کی تعمیر شروع ہوئی۔ شروع میں اُس زمانے کے مقتدر ماہر تعلیم اسماعیل سیٹھی جو بعد میں وائس چانسلر پشاور یونیورسٹی بھی بنے گورنمنٹ کالج کے پرنسپل تھے۔ گورنمنٹ کالج کا معیار تعلیم جو بھی تھا عوام میں ایڈورڈزاور اسلامیہ کے برابر نہ سمجھا جاتا۔ تمام کالجوں میں ڈریس کوڈ باقاعدہ ہوتا۔ اسلامیہ کالج کی کالی شیروانی، ایڈورڈ کالج کا ہرا کوٹ اور گورنمنٹ کالج کا سرخ بلیزر ہوا کرتا تھا۔

طریقہ تعلیم روایتی تھا اور طلباء کو خود سے سیکھنے کے مواقع کم ہی ملتے لیکن تعلیم میں انتہائی نظم وضبط تھا۔ طلباء پر اساتذہ کی گرفت مضبوط تھی۔ اساتذہ اور طلباء کے درمیان بہتر تعلقات تھے۔ کئی بار اساتذہ اور طالب علم نصابی وقت کے علاوہ غیر نصابی وقت میں بھی ایک دوسرے سے تعلیمی ومعاشرتی روابط رکھتے۔ میرا اور شفیق کا خصوصی رابطہ لیکچرار مسٹر سکاٹ کے ساتھ تھا۔ انہوں نے ہمارے ہمراہ شادیوں وغیرہ میں بھی شرکت کی۔ اس کے علاوہ اختر صاحب جو پشاور سے تعلق رکھنے والے مشہور ٹیچر تھے وہ اردو بھی پڑھاتے تھے۔ لیکن اُن کا بنیادی کام فزیکل ایجوکیشن تھا کرکٹ ایسوسی ایشن کے عہدے دار بھی رہے اور ایڈورڈز کالج کی کرکٹ ٹیم کے انچارج بھی تھے۔ طلباء میں خاصے مقبول تھے۔ دوستانہ روابط رکھتے۔ ضیاء القمر جو نوجوان استاد تھے کا طلباء کے ساتھ بڑا دوستانہ آزادانہ رویہ تھا۔ چند اساتذہ اپنے رعب کی وجہ سے مشہور تھے۔ ان میں اُردو میں طہٰ خان، زوالوجی کے فاضل صاحب، انگریزی کے ذہین صاحب اور باٹنی کے

غلام نبی صاحب شامل تھے۔غیر نصابی سرگرمیاں مقبول تھیں۔مشاعرے، بزم ادب، ڈرامہ سوسائٹی اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ موجود تھی۔، وقفہ کے دوران کھیلنا عام تھا۔لہذٰا عمومی طور پر تعلیمی ماحول بہت اچھا تھا۔ایڈورڈز کالج میں گزارے ہوئے دو سال کے دوران چند ایک سینئر طلباء جن میں چیف پراکٹر نواب علی خان بھی شامل ہیں کی رہنمائی وسپورٹ سے اعتماد میں اضافہ ہوا۔ اس کے علاوہ میرے قریبی دوستوں میں محمد شفیق (ریٹائرڈ ایگزیگٹیو پی ایس او)، چنگیز حکیم خان (جومشہور سرجن و چیف ایگزیگٹیو، خیبر ٹیچنگ ہسپتال بنے)،ان کے بھائی جاوید خان اور مثل خان، مسعود جان (پروفیسر ریٹائرڈ)اعزاز علی شاہ (جو بعد میں پروفیسر نیوروسرجری رہے۔اور پشاور میں نیوروسرجری کا شعبہ بھی قائم کیا)اقبال احمد صدیقی اور مفتی سعید احمد (ریٹائرڈ سینئر نیشنل بینک آفیسر) شامل تھے۔ایڈورڈز کالج کے ماہ وسال میری تعلیمی نشوونما کے یادگار دن کہے جاسکتے ہیں۔ایڈورڈ کالج کا سب سے نمایاں پہلو ڈسپلن تھا جس کی خلاف ورزی کرنے والوں کے پیچھے پرنسپل فلپ ایڈ منڈ یا ان کی اہلیہ دوڑ رہے ہوتے۔ پڑھائی کے علاوہ وقفہ کے وقت کینٹین میں ٹیبل ٹینس کھیلنے والوں کا رش ہوتا،اس کے علاوہ لان کے ایک کونے میں بیڈمنٹن نیٹ بھی لگا ہوتا۔یہ بات ضرور تھی کہ جھجک کی وجہ سے بہت سارے اُردو سکول کے پڑھے ہوئے طلباء انگریزی سکولوں کے طلباء سے الگ رہ کر اپنی سرگرمیاں جاری رکھتے۔میں بھی شروع میں اس احساس کمتری کا شکار رہا لیکن جلد ہی اس پر قابو پالیا۔مجھے انگریزی سکولوں سے پڑھے شوکت حیات اور طارق رحیم جیسے طلباء سے کھیلنا اور تبادلہ خیال کرنا خوب یاد ہے۔میرے خیال میں سکولوں، کالجوں میں مختلف کلچر اور پس منظر سے آئے ہوئے طلباء کی ذہنی ہم آہنگی کی شدید کمی تب بھی تھی اور آج بھی ہے۔1965ء میں، میں نے فوج میں بھرتی ہونے کی کوشش بھی کی۔اس بار بھی آئی ایس ایس بی کلیئر کرنے کے بعد طبعی وجوہات کی بناء پر فوج میں شامل نہ ہوسکا۔ 1965ء ایف ایس سی میں کم نمبر آنے کی وجہ سے میں نے بہتری کیلئے ایک سال اضافی لگایا اور میڈیکل کالج میں داخلے کے لئے بہتر نمبر حاصل کئے۔

سکول اور کالج میں میرا رجحان:۔

اگر چہ سکول کے زمانے سے ہی میں اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کو بڑے شوق سے پڑھاتا تھا۔میٹرک ممتاز حیثیت سے گورنمنٹ ہائی سکول پشاور سے پاس کرنے کے بعد جب مجھ سے پوچھا گیا کہ میں کیا بننا چاہوں گا تو میں نے جواب دیا کہ میں سکول ٹیچر بننا چاہتا ہوں۔ ہر طرف سے میری خوب دھلائی ہوئی اور مجھے ایڈورڈز کالج میں پری انجینئرنگ میں رجحان نہ ہونے کے سبب (بعد میں پری میڈیکل) میں اس لئے داخل ہونا پڑا کہ بڑا بھائی پہلے سے پری میڈیکل کر رہا تھا۔ایف ایس سی کرنے کے دوران میں نے نویں جماعت کے ایک طالب علم اختر سعید کو باقاعدہ ٹیوشن پڑھانا شروع کی۔اختر کی فیملی کریم پورہ بازار پشاور میں رہتی تھی۔اس کے والد شیخ سعید صاحب پولیس (CID) میں آفیسر تھے۔وہ ہمارے بزرگوں کو اچھی طرح جانتے تھے۔میں اُنہیں نفیس کپڑوں میں ملبوس کلاہ باندھے سائیکل چلاتے دیکھ کر بہت متاثر ہوتا تھا۔اُنہوں نے خود مجھے اختر کو پڑھانے کو کہا جو میں نے تھوڑی جھجک کے بعد قبول کرلیا(اختر بعد میں ڈائریکٹر ایف آئی اے ریٹائر ہو کر آج کل راولپنڈی میں مقیم ہے)۔میں نے دوسری ٹیوشن اپنے بہت ہی عزیز اور قریبی دوست اصغر علی شاہ کے برادر نسبتی مسکین شاہ کو پڑھائی جو اُس زمانے میں آٹھویں جماعت کا طالب علم تھا۔ یہ میرے میڈیکل کالج میں تعلیمی شروعات کا دور تھا۔اس میں شک نہیں کہ پیسوں کی کمائی بھی شامل حال تھی مگر نفسیاتی طور پر اب میں یہ سمجھتا ہوں کہ مجھے پڑھانے کا شوق زیادہ تھا۔

خیبر میڈیکل کالج پشاور:۔

1954ء میں خیبر میڈیکل کالج پشاور(KMC)اس وقت کے وزیر اعلیٰ خان عبدالقیوم خان اور ڈائریکٹر جنرل ہیلتھ مسٹر ایم کے آفریدی کی کاوشوں سے معرض وجود میں آیا اور پورے پاکستان سے چنے گئے 50 طلباء کو 1955ء میں داخلہ دیا گیا۔ 1966ء میں مجھے خیبر میڈیکل کالج میں داخلہ مل

گیا۔میرے داخلے کے وقت طلباء کی تعداد 80اور بعد میں 100 کردی گئی۔

طلباءاوراساتذہ پینٹ شرٹ پہن کرآتے تھےاورزبان اردوو انگریزی استعمال ہوتی تھی۔سال اول کےاساتذہ میں اناٹومی کے طاہر حسن پروفیسراورہیڈآف ڈیپارٹمنٹ،ڈاکٹر افضل اور باچہ گل اسسٹنٹ پروفیسر تھے ڈاکٹر تاج علی ،ڈاکٹرنسیم اورڈاکٹر پروین Demonstrator ہوا کرتے تھے ۔باقی چاچااناٹومی لیبارٹری کے انچارج بادشاہ تھے جنہوں نے ہمیشہ طلباء کی مدد کی ۔بھٹی صاحب فوٹوگرافر تھےاوروہ ہمارے اناٹومی یا فریالوجی کے پوسٹر بنانے میں بھی مددگار ہوتے تھے۔میرے کلاس فیلوز میں ڈاکٹر چنگیز خان،اشفاق احمد،،شفیق الدین ،مقتدرشاہ،شانام باچہ،فریداللہ،منیراقبال،فدامحمد(ڈاکٹر پیرفدا)،عبدالصمد، بخت بیدار،امین جان پیرپیائی والے،اسدضیاء،قیوم مسعود،ناصرخان،مسعود پاشا،سلیم خان،مردان کے سلیم خان(موجودہ شفاء ہسپتال اسلام آباد)،خواتین میں شاہدہ درانی،زینت بتول، پروین،ناصیہ بیگم،سعیدہ مجید، خورشیداختر،فہمیدہ بخاری،زویہ حمیدالدین،خورشید جودت مجیداور چند دیگرشامل ہیں۔

اگلے پانچ سال پروفیشنل اورسوشل پختگی کی بنیاد بنے ۔فرسٹ ائیرایم بی بی ایس میں کلاس نمائندے (سی آر) کی حیثیت سے چُنا گیا۔اس سال پہلی باراناٹومی ڈائی سیکشن ہال میں لڑکوں اور لڑکیوں کی علیحدہ علیحدہ گروپ بندی کردی گئی۔طلباء کےاصرار پر میں نے یہ معاملہ ڈپارٹمنٹ کےاساتذہ کے ساتھ اٹھالیا۔جس کے بعد مجھے غیرمقبول قراردے دیا گیا۔کسی شرارتی ساتھی نے اس بارے میں ایک خط پرنسپل میجر جنرل اکرم خان کولکھ دیا جنہوں نے شاید ہیڈآف اناٹومی ڈپارٹمنٹ پروفیسر طاہر کوبھجوادیا۔ اُنہوں نے اس کا سخت نوٹس لیا۔مرحوم ڈاکٹر افضل صاحب جو بعد میں بہت عرصہ ہیڈآف ڈپارٹمنٹ رہے نے مجھے،منیراقبال(موجودہ ماہراطفال) اور چند دیگر طلباء کو بلوایا۔ہم سے کچھ جملے لکھوائے اور اعلان کردیا کہ لکھا ہوا خط طارق سعید مفتی کی تحریر سے ملتا ہے۔میں بے گناہ مارا گیا۔ پروفیسر طاہر سمیت دیگر تمام اساتذہ نے مجھے اس کا قصوروار گردانا کہ میں نے ہی وہ خط لکھا ہے۔ پھر جب میں نے مڑ کے

پیچھے دیکھا تو کسی ایک کلاس فیلو کو اپنے ساتھ کھڑا ہوا نہ پایا۔ پورا سال سزا بھگتا رہا۔ڈائی سیکشن ہال میں مردوخواتین کی تقسیم کو باقاعدہ طور پر منظور کرلیا گیا اور طلباء کا مقصد بھی حل ہوگیا مگر مجھے کوئی سٹوڈنٹ ٹیم اپنے ساتھ ڈائسیکشن ٹیبل پہ جگہ دینے کو تیار نہیں تھی۔تمام ٹیچر بھی مخالف تھے۔ مجھے زندگی میں دوسری بار احساس ہوا کہ لیڈرشپ کا چکر مناسب نہیں ہے۔نعرے لگانے والوں سے کوئی توقع نہیں رکھنی چاہیئے۔ برے وقت میں عوام کام نہیں آتی۔تب سے لے کر آج تک صراط مستقیم پر چلنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

اناٹومی ڈیپارٹمنٹ میں 25 - 20 طلباء کے بیٹھنے کے لئے اوپر نیچے دورویہ سیٹیں بنی ہوئی تھیں۔اوپر والی رو لڑکوں کے لئے اور نیچے والی لڑکیوں کے لئے مختص تھیں۔ان کلاسوں میں ہمیں ہڈیوں کے اوپر ڈیمو دی جاتی۔ چونکہ ہڈیاں کم اور طلباء زیادہ ہوتے تھے۔لہذا ایک ہڈی کا جائزہ بہت سے طلباء اکھٹے کرتے تھے۔کئی دفعہ لڑکے لڑکیوں کے ہاتھوں میں پکڑی ہڈیوں کو دیکھ کر سیکھ رہے ہوتے۔ ایک موقع پر میری شامت اعمال کہ میرے ساتھی طلباء نے مجھ سے ہڈی کا اشتراک نہ کیا۔تو میں نے نچلی بنچ پر بیٹھی کلاس فیلو کے ہاتھوں میں پکڑی ہڈیوں کو دیکھ کر سیکھنا شروع کردیا۔اس اثنا ہماری ڈیمانسٹریٹر (Demonstrator) صاحبہ مجھ پر برس پڑی کہ تمہاری نظریں غیر اخلاقی طریقہ سے جائزہ لے رہی ہیں۔ یا خدایا۔ میں یہ کس مصیبت میں پھنس گیا بہت یقین دہانی کے باوجود بات نہ بنی۔اور مجھے ایک کونے میں دیوار کی طرف منہ کر کے بطور سزا کھڑا ہونا پڑا اور یوں میرا فرسٹ ائیر شدید اخلاقی بدنامی میں گزر گیا۔غور کرنے پر اب دماغ میں آیا کہ نماز میں عورتوں کو مردوں کے پیچھے کھڑا کرنے کا مطلب یہ ممکن ہے کہ مرد عورتوں کو نہ دیکھ سکیں۔اسی طرح کلاس میں لڑکیوں کو اگر پچھلی اوپر بنچ پہ بٹھا دیا جاتا تو لڑکے لڑکیوں کو بغور نہ دیکھ سکتے۔

رٹا لگانا میری تربیت اور نفسیات میں شامل نہ تھا اس لئے اکثر مقامات پر نمایاں پوزیشن کے جھنڈے نہ گاڑھ سکا۔بعض کلاسوں میں ایسے ساتھی مل گئے کہ جنہیں مضامین سمجھانے اور سکھانے کا موقع

ملا۔شاید اُن کی دشواری انگریزی زبان کی سمجھ تھی یا ایک ساتھی کے کیس میں کاہلی کی عادت تھی ۔ مجھے یہ فائدہ ہوا کہ جو مضامین اُن کو سمجھائے وہ خود اچھے نمبروں سے پاس کر لئے جبکہ اُن کے نمبر کم آئے یا وہ فیل ہو گئے۔ ان میں ایک قریبی ساتھی زندگی بھر کے لئے خفا بھی ہو گیا۔ یہ بات میرے لئے سبق آموز ثابت ہوئی اور پھر بھی اب تک اپنے مخصوص طریقے اور مستعدی سے ہر وقت، ہر سطح اور ہر ماحول سے متعلق لوگوں کو سکھانے کی کوشش کرتا رہتا ہوں یہ رویہ میری زندگی کے مشن کا حصہ ہے۔

پہلے سال پیش آنے والے تعلیمی ماحول کی مشکلات کی وجہ سے میں ایم بی بی ایس سال دوئم میں دیگر طلباء کی نسبت پیچھے رہا۔ پہلے مرحلہ کے امتحان میں سوالوں کا جواب زیادہ اچھا نہ آتا تھا مگر میں اوٹ پٹانگ لکھتا رہا اور 26 صفحے تحریر کئے جب نتیجہ آیا تو میرے نمبر خاصے معقول تھے جبکہ میرے خیال میں مجھے اس پرچے میں فیل ہو جانا چاہیئے تھا۔ میں اپنے متعلقہ ٹیچر کے پاس چلا گیا۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ غالباً میرے حاصل کردہ نمبر میرے حل شدہ پرچے کو تول کر دیئے گئے تھے۔ اتنے بہت سارے صفحے پڑھ کر نمبر لگانا آسان نہ تھا۔ اگرچہ باقاعدہ طور پر طریقہ تعلیم کی خوبیوں اور خامیوں کا علم تو بہت بعد میں ہوا تاہم سال دوئم میں مضامین کی زیادہ سمجھ نہیں آئی۔ بائیوکیمسٹری جیسے خشک لیکچرز کے دوران طلباء کی کلاس کے اندر شرارتوں سے اب اندازہ ہوتا ہے کہ کلاس روم ٹیچنگ ایک بہت مشکل آرٹ ہے۔ تاہم مجھے بائیوکیمسٹری سے خاصی دلچسپی ہو گئی۔

تیسرے سال (سیکنڈ پروف جو موجودہ تھرڈ پروف ہے) میں Hospital attachment کے دوران ہمیں بہت کم توجہ ملی ۔نتیجاً ’’اکثر طلباء کی طرح میں بھی اس دورانیہ میں آوارہ گرد رہا‘‘۔ میرے حصے آنے والے پہلے مریض کی کہانی سن کر میں اپنے تمام دکھ درد اور زندگی سے گلے شکوے بھول گیا۔ پہلی دفعہ احساس ہوا کہ دنیا میں مجھ سے کم صحتمند، لاچار و مجبور لوگ بھی ہیں۔ سال سوم و چہارم ((2nd & 3rd Prof.میں پیتھالوجی کے لیکچر و لیبارٹری ورک کرنا تو مجھے یاد ہے مگر دیگر

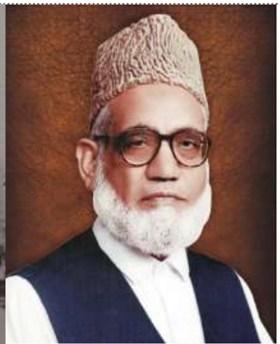
مضامین کا پڑھنا و سیکھنا بالکل مبہم ہے۔

ہسپتال ٹریننگ کے لحاظ سے کلینکل سالوں میں بھی ہر Batch کو برابر کی توجہ و ٹریننگ میسر نہ تھی۔ اگر چہ میرے ہم عصر اُس وقت کو آج بھی قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اساتذہ کی کمی کی وجہ سے ماسوائے چند دلچسپی رکھنے والے اور لگن رکھنے والے طلباء کے علاوہ باقی سب طفیلی اور حاصل مواقع کے بناء پر کلینکل ٹریننگ کر رہے تھے۔ گو کہ ہم سب 'گزشتہ وقت خوب بود' کا راگ الاپتے رہتے ہیں۔

فزیالوجی کے لیکچرار ڈاکٹر حنیف قریشی بہت ہی نفیس اور ہنس مکھ انسان تھے۔ فارماکالوجی میں ڈاکٹر واحد شاہ تھے۔ جو کھیل کھیل میں ہمیں فارما سیکھا گئے۔ کمیونٹی میڈیسن میں Demonstrator ڈاکٹر عنایت خلیل تھے۔ کمیونٹی میڈیسن کے ہیڈ آف ڈیپارٹمنٹ پرنسپل میجر جنرل اکرم خان تھے جو بذات خود لیکچر بھی دیا کرتے تھے ان کی کلاس میں ہم سب کی جان جاتی تھی اور ہم سب بت بن کر بیٹھتے یا پھر چھپ چھپا کر شرارتیں کرتے۔ اس کے علاوہ پیتھالوجی ڈیپارٹمنٹ میں پروفیسر شیر بہادر، ڈاکٹر اوپل، ڈاکٹر زیب النساء کی کلاسز لینا اور باتوں سے خوش ہونا یاد ہے۔ ایک سینئیر ٹیچر اسلم صاحب بہت متاثر کن استاد تھے۔ کلینیکل ٹیچرز میں ڈاکٹر ناصرالدین اعظم خان، ڈاکٹر رضا علی، ڈاکٹر SAR گردیزی، ڈاکٹر فیروز شاہ، ڈاکٹر ذکیہ منہاس، ڈاکٹر ممتاز خٹک، ڈاکٹر شفیق تھے۔ انکے علاوہ ENT میں ڈاکٹر اقبال، ڈاکٹر عالم خان آفریدی، EYE میں ڈاکٹر مظفر اقبال، Peadiatric میں ڈاکٹر اشفاق اور دیگر تھے۔ ڈاکٹر طارق نشتر، ڈاکٹر محمد کبیر اور ڈاکٹر سراج احمد نے ہمارے آخری سال دو میں کالج اور ہسپتال جائن کیا۔ ہم ان کے نئے انداز تعلیم سے خاصے متاثر تھے۔

ذوالفقار علی بھٹو کی سیاسی مہم کے عروج کے دور میں عنایت اللہ گنڈاپور ڈاکٹروں کے ساتھ مل کر جلسے جلوس میں شامل ہوا کرتے تھے۔ ڈاکٹروں کو فائنل ائیر کا امتحان میری تعلیم کا طویل اور مشکل ترین امتحان تھا۔ ملک کے بہت اعلی اور ممتاز پروفیسر ہمارے ممتحن تھے ان میں کنگ ایڈورڈز کے اختر علی خان





Prof. Muhammad Shafi Sabir
Founder of Forward Public School



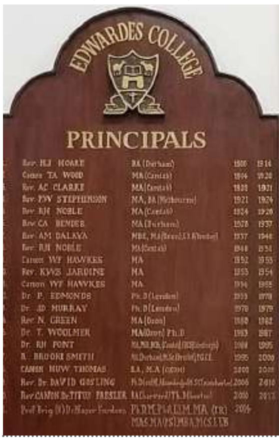


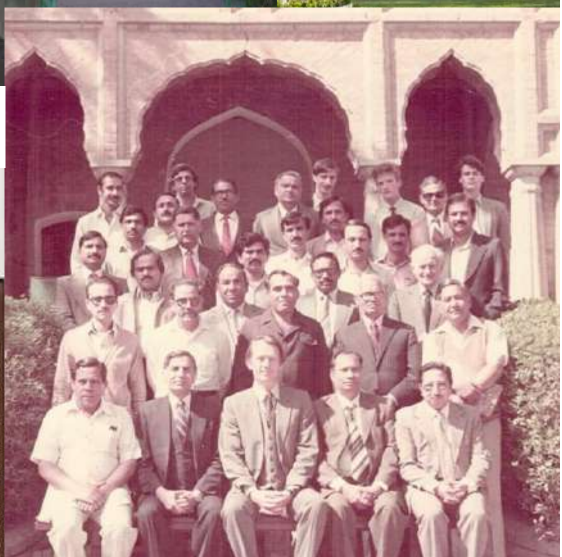






Principal
Edwardes College, Peshawar
(1955-1978)





Edwardes College, Peshawar: Faculty in 1986

Pioneer Teachers KMC











Kyber Medical College
MBBS Batch 1966-71



Batch of 1971 with Prof. Wahid Shah







Pricipal Maj. Gen. M. Akram Khan, Prof. Raza Ali & SAR Gardezi on KMC Annual Day (1969)







میڈیسن اور پروفیسر سردار علی شیخ سرجری میں ہمارے بیرونی ممتحن، پروفیسر ناصر الدین اعظم خان و پروفیسر رضا علی میڈیسن اور پروفیسر سید علی رضا گردیزی و پروفیسر فیروز شاہ سرجری کے اندرونی ممتحن تھے۔ گائنی میں اندرونی ممتحن تو پروفیسر ذکیہ منہاس اور پروفیسر ممتاز خٹک تھے مگر بیرونی ممتحن نہ میں نے دیکھا نہ ہی کسی کا نام یاد ہے۔ان سب کے معیار کی داد دینا پڑتی ہے کہ جس تحمل، بردباری اور ہنر مندی سے انہوں نے ہمیں اس امتحان میں جانچا۔ فائنل ائیر ایم بی بی ایس کا نتیجہ بمشکل تیس یا چالیس فیصد کے قریب ہوتا تھا۔ ہماری کلاس بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ میرے لئے یہ مرحلہ خیر سے گزر گیا اور میں نومبر 1971ء میں ایم بی بی ایس کا امتحان گیارہویں پوزیشن لے کر ڈاکٹر بن گیا۔میڈیکل کے مختلف مضامین میں نے کیسے پاس کیئے یہ خود بھی میری سمجھ سے بالاتر ہے! یہ الگ بات کہ میں اپنے آپ کو پاس ہونے کا اہل نہیں سمجھتا تھا۔طریقہ تعلیم اور مواقع آج کے دور میں زیادہ بہتر معلوم ہوتے ہیں۔ نیز آج کے طالب علم اوسطاً اُس زمانے کے طالب علم پڑھائی میں بہت بہتر دکھائی دیتے ہیں۔

باب نمبر 5

پیشہ ورانہ زندگی کے تربیتی مراحل

ہاؤس جاب لیڈی ریڈنگ ہسپتال پشاور:۔

1971ء میں فائنل ایئر کا رزلٹ نکلتے ہی ہاؤس جاب شروع ہوگیا۔ چونکہ میرے تقریباً تمام کلاس فیلو ڈاکٹرز 1971ء پاکستان اور انڈیا کی دوسری جنگ کی بناء پر فوج میں جبری سروس پر چلے گئے تھے۔ لہٰذا ہر ایک وارڈ کا بوجھ ایک ہاؤس آفیسر اور ایک رجسٹرار پر آن پڑا تھا۔ میں میڈیکل سی وارڈ کا اکلوتا ہاؤس آفیسر تھا۔ ڈاکٹر شاد محمد جو بعد میں مشہور ماہر امراض چشم بنے میرے رجسٹرار تھے اور پروفیسر ڈاکٹر طارق نشتر وارڈ کے انچارج تھے اُن کے ساتھ وارڈ راؤنڈ کرنے کے بعد تقریباً تمام کام ہم نے خود کرنا ہوتا تھا۔ دن رات مسلسل ڈیوٹی ہوتی، کئی چیزیں نرسنگ سٹاف سے سیکھیں۔ خصوصی طور پر رگ میں انجکشن لگانا تو اُنہی کی مرہون منت ہے۔ ایک بار آکسیجن سلنڈر رکھولنے کیلئے وارڈ بوائے یا نرس نہ تھے تو ایک خاکروب جو قریب سے گزر رہا تھا نے مجھے طریقہ سکھایا۔ میں بعد میں کئی عرصہ تک اپنے اس اُستاد محترم کو سلیوٹ کرتا رہا۔ اِسی طرح پیشاب کی نلکی (Urinary Catheter) لگانا بھی میں نے ایک وارڈ بوائے سے سیکھا۔ کئی دفعہ مریضوں کو نلکی لگانا مشکل ہو جاتا اور خون نکل آتا۔ اسے معمول سمجھا جاتا تھا ایسے مریضوں کو کسی سینئر ڈاکٹر کے پاس بھجوا دیتے۔ اس طرح نہ جانے کتنے لوگوں کی پیشاب کی نالی متاثر ہوئی ہوگی؟ یہ سب ہم بغیر کسی سینئیر کی نگرانی کے کرتے تھے۔ اسکی بنیادی وجہ سینئیر لوگوں کا فقدان تھا اور ویسے بھی سینئیر لوگ ہر وقت ہسپتال میں موجود نہیں ہو سکتے تھے۔ میڈیکل سی اور ڈی نئے وارڈ ٹی بی سنٹر کو خالی کر کے بنائے گئے تھے۔ میڈیکل ڈی میں ڈاکٹر شاہجہان آفریدی جو نشتر میڈیکل کالج کے فارغ التحصیل تھے ڈاکٹر سراج و ڈاکٹر الف خان کے ماتحت بطور ہاؤس آفیسر کام کرتے تھے۔ ڈاکٹر الف خان کئی بار پیشاب میں شوگر ٹسٹ کرنے کا عمل ٹسٹ ٹیوب وغیرہ کے استعمال سے وارڈ کی نرسنگ ٹیبل پر

ہی کرتے تھے۔ وارڈ کے مریضوں کے بنیادی ٹسٹ ہم خود وارڈ لیبارٹری میں کرتے تھے۔ پروفیسر طارق نشتر کا مجھ پر خصوصی اعتماد تھا۔ مجھے اُنہوں نے ای سی جی سیکھنے کی ایک چھوٹی سی کتاب دی جسے میں نے اچھی طرح سے پڑھا۔ دل کے ہر مشکل کیس میں میں اس کتاب سے استفادہ حاصل کرتا۔ اس ہاؤس جاب کے دوران ایک خاص مریض چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ سجاد احمد جو مشہور وکیل پیر بخش خان کے صاحبزادے اور جنرل حبیب اللہ (حبیب اللہ کالونی ایبٹ آباد والے) کے داماد تھے۔ وہ ہارٹ اٹیک کے باعث بولٹن بلاک میں پروفیسر طارق نشتر کی نگرانی میں داخل ہوئے۔ مجھے اپنی ڈیوٹی کے علاوہ بولٹن بلاک جو ایک پرائیویٹ بلاک تھا میں ان کی مسلسل دیکھ بھال کرنی پڑتی اور ساتھ ہی ان کی عیادت کرنے والی اعلیٰ شخصیات کا خیال بھی رکھنا پڑتا۔ یہ تجربہ بھی خاصا دلچسپ رہا۔ میں میڈیسن کی پریکٹس میں اس قدر اچھا ہو گیا کہ پروفیسر طارق نشتر نے مجھ سے وعدہ لیا کہ سرجری کی ہاؤس جاب ختم ہونے کے بعد میں اُن کے میڈیکل وارڈ کا رجسٹرار بنوں گا۔

سرجری ہاؤس جاب سے پہلے چند ماہ مشہور سرجن پروفیسر ڈاکٹر سید علی رضا گردیزی کے ساتھ گزارے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب امریکہ سے پاکستانی ڈاکٹر امجد حسین پشاور میں دل کی سرجری کا شعبہ کھولنے کی نیت سے بطور اسسٹنٹ پروفیسر آئے تھے لیکن نہ تو ان کی حوصلہ افزائی ہوئی اور نہ ہی شعبہ سے متعلق سہولیات حاصل تھیں۔ دل کے آپریشن تو کم ہی ہوئے ہوں گے لیکن ہرنیا و بواسیر کے آپریشن بھی اُنہیں کرنا پڑ گئے۔ یورالوجسٹ بلال احمد بھی میری ہاؤس جاب کے دوران سرجیکل بی وارڈ سے متعلقہ اسسٹنٹ پروفیسر رہے۔ مجھے اپنڈکس کا پہلا آپریشن یوں کرنا پڑا کہ جب مریض مکمل نشے کے بعد تیار تھا تو پتہ چلا کہ میرے سینئر ڈاکٹر صاحب کسی اور جگہ خصوصی مصروف ہیں اُنہوں نے مجھے ٹیلیفون پر زبانی ہدایات دیں اور آپریشن کر دینے کو کہا۔ ایسے میں آپریشن تھیٹر انچارج 'شیر بہادر' کی صورت میں میرے لئے ایک فرشتہ آ گیا جو بظاہر تو میری معاونت کر رہا تھا لیکن درحقیقت اُس کے بتائے ہوئے تمام

طریقے اختیار کر کے میں نے کامیابی کے ساتھ اپنا پہلا اپینڈیکس کا آپریشن کرلیا۔اس کے بعد تو بس میرا ہاتھ کھل گیا۔ ایک مرتبہ جب میں اور میرا سینئیر ہاؤس آفیسر ڈاکٹر عزیز گل (مرحوم) ایک بواسیر کے مریض کا آپریشن کر رہے تھے اور مریض آدھے نشہ کی وجہ سے ہوش میں تھا اور ہماری خوش گپیاں سن رہا تھا اس دوران شاید ہم نے آپریشن کے بعد ہونے والی پیچیدگیوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ بوجہ آپریشن پاخانے کی جگہ تنگ ہوسکتی ہے۔ وائے نصیب کہ اس مریض کو واقعی ویسا ہی ہوگیا۔ وہ پروفیسر گردیزی کے پاس فریادلے کر گیا۔ ہمیں اُوپر اُن کے دفتر میں حاضری دینا پڑی اور شدید برا بھلا سننا پڑا۔ مجھے کہا گیا کہ بازار سے لکڑی کے مولے (Obturators) بنا کر مریض کیلئے لاؤں تا کہ اگلے چند ماہ وہ اِس کے ذریعے اپنا مقعد کشادہ کر سکے۔

انہی دنوں رکشے کے سفر کے دوران میرا ایکسیڈنٹ ہوگیا اور میرے داہنے ہاتھ کی ہڈیاں مختلف جگہ سے ٹوٹ گئیں۔ میں پلستر کروا کر گھر جانے کی بجائے وارڈ چلا گیا اور اپنے سینئر سے کہا کہ میں وارڈ میں بائیں ہاتھ سے مریض کی ہسٹری لکھوں گا اور دیگر کام جو ممکن ہوئے کروں گا۔ وہ اس حق میں نہ تھے۔ بہر حال میں ڈٹا رہا اور یوں میں نے لفٹ ہینڈ سے لکھنا سیکھ لیا۔ مجھے پہلی بار پتہ چلا کہ میں دونوں ہاتھوں سے لکھ سکتا ہوں۔ بعد میں پروفیسر گردیزی کو ون یونٹ کے ٹوٹنے کی وجہ سے لاہور تبدیل کر دیا گیا اور یہ وارڈ پروفیسر مکرم خان کے حوالے کر دیا گیا۔ پروفیسر مکرم خان جو گلہڑ اور تھوک بنانے والے غدود کے خصوصی ماہر سرجن تھے ان سے بہت کچھ سیکھا۔ سیدھی بات کرنے والے تھے لہذا سب ان سے ڈرتے تھے۔ مجھ پر مہربان ہو گئے اور 1973ء میں میری حج سے واپسی پر بھی مجھے مزید چھ ماہ اپنی وارڈ میں سینئیر ہاؤس جاب دلوائی۔ سرجری میں ہاؤس جاب یقیناً مشکل اور مصروف ترین دورانیہ تھا۔ وکیل خان ہمارے رجسٹرار تھے انہوں نے مجھ سے آپریشن تھیٹر کی ایمرجنسی سرجری پر طبع آزمائی کروائی۔ جنرل سرجری کے علاوہ آرتھوپیڈک کے کام بھی کرنا پڑتے۔ ہفتے دو کے بعد چند گھنٹے گھر جانے کو ملتے جبکہ میرا گھر ہسپتال سے صرف دس منٹ کے فاصلے پر تھا۔

قافلہ حج کا ڈاکٹر:۔

ہاؤس جاب ختم ہوتے ہی آغاجی سید محسن علی شاہ (ریتی کے سید برادران میں سب سے بڑے بھائی جو نشتر آباد میں رہتے تھے) بذریعہ سڑک حج کے لئے قافلے لیجانا چاہتے تھے۔ یہ واحد سال تھا جب 1972ء میں ذوالفقار علی بھٹو نے زمینی سفر کے لئے قافلوں کی صورت میں حج کرنے کی اجازت دی۔ آغاجی کا بلاوا مجھے، اصغر علی شاہ اور مختیار جان کو آیا۔ اُنہوں نے حکم صادر کیا کہ اپنے اپنے فوٹو جمع کرائیں۔ وہیں پتہ چلا کہ انکا بیٹا اظہری (اظہر علی شاہ) اور بھتیجا ظاہر علی شاہ (جو بعد میں خیبر پختونخوا کے وزیر صحت بھی رہے) بھی ساتھ جائیں گے۔ مجھے ایمبولینس تیار کرنے کو کہا گیا۔ حاجی یعقوب (مرحوم) جن کا مستری خانہ فردوس سنیما کے سامنے گاڑیوں کی ورکشاپ میں تھا کے ساتھ بات چیت کی وہ بہت خوش ہوئے انہوں نے اپنی نئے ماڈل کی فورڈ بارہ سیٹر گاڑی جو روٹ پہ چلتی تھی کو ہماری حوالے کر دیا۔ ہم نے سیٹیں نکلوا کر لکڑی کا ایک لمبا بستر نما بنچ اُس میں فٹ کر دیا۔ دواؤں کے لئے ڈھکن والا خانہ اور چند دیگر لوازمات جو کہ ایمبولینس کیلئے لازم ہوتے ہیں تیار کروا کر اچھی خاصی ایمبولینس بنوالی۔ ایک ڈسپنسر قدرت شاہ جنھوں نے ڈسپنسر کا کورس کیا ہوا تھا اور پولیس سروس میں تھے (بعد میں ڈی ایس پی ریٹائرڈ ہوئے) بھی ہمارے ٹیم میں شامل ہو گئے۔

سفر حج سے فوراً پہلے جب ہم سعودی کرنسی لینے بازار گئے تو ہمیں صرافوں نے کہا کہ ریال لینے کے بجائے روپے لے جائیں کیونکہ وہاں ایک روپے کے بدلے ایک ریال آسانی سے مل جائے گا۔ ڈالر نو یا دس روپے کا تھا۔ ہمیں اپنے پیسے اس لئے لے جانے پڑے کہ حج اپنے پیسوں سے کریں۔ اگر چہ ہمارا زیادہ تر خرچہ فری تھا لیکن اُس زمانے میں یہ باور کیا جاتا تھا کہ سرکاری پیسوں سے حج نہیں ہوتا۔ جوانوں کی یہ ٹولی 250،250 بڑی عمر کے لوگوں کی اکثریت والے دو قافلوں کو لے کر پشاور سے سفر حج پر روانہ ہوئی اور پاک افغان سرحد طورخم پر چیکنگ کیلئے رکے۔ اُس وقت تک یعقوب (جو ایمبولینس ڈرائیور کے

طور پہ شامل قافلہ تھے) نے میرے اور قدرت شاہ کے علاوہ کسی کو اپنی ایمبولینس میں نہیں چھوڑا تھا۔ تاہم چونکہ اسی اثناء میری اس سے خاصی گپ شپ ہو چکی تھی اس لئے میرے اصرار پر اُس نے اصغر علی شاہ اور مختیار جان کو ایمبولینس میں سفر کرنے کی اجازت دیدی۔ اُس کے بعد یعقوب ہمارے ساتھ گھل مل گیا۔ بڑا جانان آدمی تھا اور ہمیشہ کے لئے ہم سب کی اس سے مثالی دوستی رہی۔ تمام راستہ ہنسی خوشی سگریٹوں کے کش اور دھوئیں میں گزرتا۔ رات کو کسی شہر میں پڑاؤ ڈالتے اور دن میں سفر کرتے۔ زیادہ تر مریض پڑاؤ کے دوران دیکھنے پڑتے۔ کبھی کبھار کوئی مریض ایمبولینس میں برائے علاج و آرام لیٹ بھی جاتا۔ حاجی مختیار چونکہ کسی زمانے میں ڈاکٹر عبدالرؤف جو کہ مشہور ڈاکٹر عبدالمجید کے بیٹے تھے کے پاس ڈسپنسر بھی رہے تھے اس لحاظ سے ہم نے اُنہیں اپنی ایمبولینس میں رہنے کا قانونی اور اخلاقی جواز فراہم کر دیا۔ ہمارے قافلے میں ہر مسلک کے لوگ بشمول شیعہ و سنی شامل تھے۔ قافلے کا رہبر ایک سینئیر سرکاری افسر اور ممتاز اہل تشیع سردار سجاد تھا۔ پڑھا لکھا ہونے کی وجہ سے جلد ہی اس سے ہمارے قریبی مراسم قائم ہو گئے۔

ہم طورخم کے راستے افغانستان میں داخل ہوئے اور کابل شہر میں پڑاؤ ڈالا۔ کابل میں خوب لطف اندوز ہوئے۔ قافلے میں ریتی بازار کے ''حافظ جی'' بہت قابل احترام، زندہ دل اور مزاح سے بھر پور شخصیت تھے ہم ہمیشہ شرارت کی تاک میں لگے رہتے۔ کابل کے ایک بازار میں ہم نے انہیں چیلنج کیا کہ حافظ جی سامنے کھڑی دو خواتین سے بات کر کے دکھائیں تو مانیں۔ حافظ جی فوراً روڈ کراس کر گئے ٹوٹی پھوٹی فارسی میں کچھ بات چیت کے بعد دونوں خواتین کو بمع ان کے بھائی ساتھ لے آئے اور ہم سب سے گپ شپ کرنے لگے۔ حافظ جی کے اس ایکشن کے بعد ہم ان کے مرید ہو گئے۔ حج کے باقی سفر میں بھی اُن کے شگوفوں سے محظوظ ہوتے رہے۔ ان کے دو بچے ریتی بازار میں آج بھی کاروبار کرتے ہیں۔ بہر حال کابل کے بعد قندھار سے ہوتے ہوئے اسلام قلعہ کے راستے اصفہان (ایران) داخل ہوئے

وہیں ہم نے ایک حمام میں ترکش باتھ لیا۔نسبتاً ہلکی روشنی میں تمام لوگ اکھٹے ننگے غسل کر رہے تھے اور واپسی پہ اپنے گیلے تولیے باندھ کر لاؤنج میں آتے اور وہاں ایک بندہ اپنے دونوں ہاتھ سے بڑا خشک تولیہ کھول کر دیتا تاکہ لوگ اس خشک تولیے کو لے کر لپیٹ لیں جبکہ حمام کا دوسرا اہلکار اُن کا گیلہ تولیہ پاؤں کی طرف سے تیزی سے کھینچ لیتا۔ مجھ سے اہلکار کا دیا ہوا تولیہ صحیح پکڑا نہیں گیا اور گر گیا۔اتنی دیر میں اہلکار نے پھرتی سے گیلا تولیہ میرے پاؤں کے قریب سے کھینچ لیا تھا۔اب میں بالکل ننگا لوگوں سے بھرے ہوئے روشن ہال میں باعث عبرت کھڑا تھا۔ بہت شرمندگی ہوئی۔دوستوں نے خوب مذاق اُڑایا۔زمین سے خشک تولیہ اہلکار نے مجھے اُٹھا کے دیا اور یوں مزید خفت سے جان بچی۔

اصفہان ایران میں ہمارا پہلا پڑاؤ تھا۔روضہ امام رضاؑ اس شہر کی پہچان ہے۔چاندی کے جالی والے مزار کے اُوپر بڑے بڑے فیروزے لٹکے ہوئے تھے۔ایک طرف بیت المال تھا جس میں لوگ عقیدت سے پیسے پھینک رہے تھے۔چند لوگوں نے بٹوے بھی پھینک دیئے۔کئی ایرانی خواتین نے اپنے زیور تک اُتار کر پھینکے۔ہم نے بجا سنا تھا کہ ایران کی حکومت اکثر امام رضا کے روضے کے بیت المال کی مقروض رہتی ہے۔وہیں پر ہم نے حج سے واپسی پر عاشور کا دن بھی گزارا۔اہل تشیع بڑے منظم طریقے سے قطاروں میں آکر سینہ زنی روضے کے صحن میں ٹولہ در ٹولہ کرتے اور چلے جاتے۔شام کو مختلف شہروں میں پڑاؤ کے بعد ہم ایمبولینس میں سیر سپاٹے کو نکل جاتے۔ایران میں ہم دوست پڑاؤ کے قریب اکثر مقامی لوگوں کے گھروں میں مقیم ہو جاتے۔ایک بار ایک بچے کو پیسے دیئے کہ ہمارے لئے دودھ کی بوتلیں لے کر آئے۔دودھ لانے کے بعد اُس نے پیسے واپس کئے تو ہمارے خیال میں یہ پیسے کم تھے۔ابھی ہم اُس سے اس سے پوچھ ہی رہے تھے کہ پولیس کا ایک سپاہی آ گیا۔اُس نے لڑکے سے واقعہ پوچھا۔لڑکے نے کچھ کہا۔پولیس سپاہی نے ہمارے ہاتھ سے پیسے لئے اور لڑکے کو لے کر چل پڑا۔ہمیں سمجھ تو نہیں آئی لیکن ہم بھی پیچھے چل پڑے۔دودھ کی دُکان پر پہنچ کر سپاہی نے کچھ بات چیت کی۔

دکاندار نے کچھ اور پیسے دیئے۔ سپاہی نے وہ پیسے لے کر ہمیں دے دیئے، بچے کو چھوڑ دیا اور دکاندار کو گرفتار کرلیا۔ پتہ چلا کہ دکاندار نے گڑ بڑ کی تھی اور پولیس والے نے اُسے معاف نہ کیا۔ اگر ہمارا ملک ہوتا تو تھوڑی سی رشوت سے کام چل جاتا۔

ایران سے گزرنے کے دوران صبح صبح تمام حاجی گاڑیوں میں جب بیٹھتے تو لا الہ الا اللہ کا اونچی اواز میں ورد کرتے۔ شیراز میں ہم نے بہت خوبصورتی دیکھی۔ نوجوان لڑکیوں کے جمگھٹے غول درغول سکول جانے کیلئے منی سکرٹ پہنے ہماری گاڑیوں کے سامنے روڑ کے دوسری طرف گزرتے اور آگے بڑھ جاتے یوں حاجی صاحبان کی گردنوں کی ورزش بھی ہوجاتی!۔ ایران میں ہمارا آخری پڑاؤ ہمدان میں ہوا۔ بلندی پر واقع اس شہر میں بہت سردی تھی۔ بازار گھومتے پھرتے ہوئے ہم نے دکانوں سے اپنے لئے زیریں جامے خریدے جو گرم اور نرم ہونے کے علاوہ اگلے بیس سال تک کام آتے رہے۔ ایران کے شہر ہمدان میں ایک مریض کو دل کا دورہ پڑا۔ میں نے اسے ابتدائی طبی امداد دے کر وہاں کے مقامی ہسپتال میں داخل کروادیا۔ عراق داخلے پر امیگریشن نے ضرورت سے زیادہ پوچھ گچھ اور تلاشی میں ہمارا بہت وقت ضائع کیا۔ بغداد پہنچے تو رات پڑ چکی تھی۔ بازاروں سے گذرتے ہوئے معلوم پڑا کہ شہر بہت بڑا ہے۔ شراب کی دکانیں اور پب (Pub) بھی دکھائی دیئے۔ عراق بلاشبہ ان دنوں اپنے پورے جوبن پر تھا۔ بغداد میں پیران پیر حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کے مزار پر حاضری دی۔ حضرت امام ابوحنیفہ کی مسجد کے اندر ہی انکے مقبرہ کو سلام کیا۔ اور دوسرے دن نجف اشرف میں حضرت علیؑ کے چاندی سے مرقع روضہ کی زیارت کرتے ہوئے کربلائے معلیٰ جا پہنچے۔ کربلا میں کربلا کا سماں تھا روضہ حسین سونے کی جالیوں سے مرقع تھا اور فرش پر سرخ خون آلود ٹائیلیں لگی ہوئی تھیں۔ حسینیت سے جذبات مغلوب ہوگئے اور سب آنکھیں اشکبار ہوگئی۔

قتل حسین اصل میں مرگ یزید ہے

اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

اس کے بعد ہم بصرہ پہنچے۔ بصرہ کچی پکی عمارتوں کی آبادی اور مٹی بھری سڑکوں کا شہر تھا ہمیں یہاں رابعہ بصری کا مزار نہ مل سکا۔ مزید سفر شروع ہوا اور رات کا پڑاؤ کویت میں آ گیا۔ کویت میں ہمارے لئے رہائش کا پہلے سے بندوبست نہیں تھا۔ لہذا شہر کی ایک بڑی کار پارکنگ میں بلند و بالا کمرشل عمارتوں کے درمیان فٹ پاتھ پر مرد و خواتین سبھی خواب خرگوش میں چلے گئے۔ سردی تھی لحاف لینا پڑے۔ ہم ایمبولینس کے اندر اپنے پڑاؤ سے حاجیوں کی حرکات وسکنات کا بخوبی جائزہ لیتے رہے، خفیہ حرکات دیکھ کر حیران اور محظوظ ہوتے رہے۔ دوسرے دن ہم سعودیہ میں داخل ہوئے۔ شہر دہران سے گزرتے ہوئے ہمیں مشکلات کا بھی اندازہ ہو(Road to Dharan فلم کی یاد تازہ ہوگئی) آخر کار مدینہ پہنچے۔ موجودہ وقت کی طرح کوئی بڑے ہوٹل کا بندوبست ہمارے لئے نہ تھا۔ روضۂ رسول ترکوں کی بنی ہوئی سرخ بلڈنگ اور ایک اضافی صحن پر مشتمل تھا جس کے اردگرد سڑکیں اور محلے تھے۔ تمام حاجی صاحبان ان گلیوں میں لوگوں کے گھروں میں مقیم ہو گئے۔ ہمارے لئے بھی رہائش کا بندوبست ایک گھر میں کیا گیا جس میں ہم دوست اکھٹے تھے۔ یہ ایک خاتون اور اُس کے بچوں کا گھر تھا۔ جس کا شوہر کہیں اور رہتا تھا اور شاید کبھی کبھار ادھر بھی آتا۔ اُس عورت نے بکریاں پال رکھی تھیں جس کا دودھ ہم خریدتے۔ ہم میں خاصا انس پیدا ہو گیا جس کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ جب مدینہ سے مکہ جانے کیلئے ہم اُس گھر سے رخصت ہوئے تو بچے اور خاتون خانہ دھاڑیں مار کر رو رہے تھے اور ہم سے بھی نہ رہا گیا اور آنسو ہماری آنکھوں سے بھی رواں ہو گئے۔ سعودی عرب کی سڑکیں عام طور پر یک رویہ تھیں۔ کئی جگہوں پر تو خاصی ٹوٹی پھوٹی سڑکیں بھی دکھائی دیں، حالات بھی ہمارے جیسے ہی تھے یہ الگ بات کہ اب وہ کہاں اور ہم کہاں؟

مکہ مکرمہ میں ہماری رہائش ایک محلے کے بڑے مکان میں تھی۔ ہمارے ساتھ اور بھی کئی خاندان مقیم تھے۔ اس دوران ہمارا ساتھی مختیار جان بیمار ہو گیا اسے کافی عرصے سے جگر کی بیماری لاحق تھی جس میں اسے بخار و یرقان ہو جاتا اور چند دنوں تک اس کی حالت سنبھل نہ پاتی۔ میں اس سے بخوبی

واقف تھا اور اُسے ملک کے بہترین ڈاکٹروں کو دکھا چکا تھا۔ حج اگلے دن شروع ہونا تھا سب نے منیٰ جانا تھا اور مختیار جان شدید بخار کی وجہ سے پسینے میں ڈوبا لیٹا تھا۔ہم سب پریشان تھے،عصر کا وقت تھا، اچانک بادل آئے اور مکہ میں گڑگڑاہٹ کے ساتھ بارش شروع ہوگئی ۔ہمیں پتہ تھا کہ مکہ میں بہت ہی کم بارش ہوتی ہے اور جب بارش ہوتو خانہ کعبہ کی چھت کا پانی سونے کے نالے''میزاب الرحمت'' کے ذریعے حطیم میں گرتا ہے۔روایت ہے کہ یہ پانی جس پہ گرے اس کے لئے راہ نجات ہے وہ سیدھا جنت میں جائے گا۔ میں اور حاجی یعقوب دونوں کعبے کی طرف دوڑے، دونوں کا مقصد ایک ہی تھا کہ میزاب الرحمت سے گرا ہوا پانی لے جا کر مختیار کو پلائیں۔میں نے میزاب الرحمت کے نیچے کھڑے ہوکر عربی رومال کو پانی میں بھگولیا۔خود سارا بھیگ گیا۔دوڑ کر گھر پہنچا اور رومال کا پانی نچوڑ کر مختیار کو پلاتا رہا۔حاجی یعقوب زیادہ دانا تھا وہ اپنے ساتھ بڑا پیالہ لے گیا تھا۔ہم وقفے وقفے سے یہ پانی مختیار کو پلاتے رہے اور یقین نہ آنے کی حد تک دوسرے دن مختیار نے ہمارے ساتھ صبح حرم سے منیٰ تک کا سفر پیدل طے کیا۔دوبارہ وہ اس بیماری کا شکار کبھی نہیں ہوا۔میرے واپس آنے پر میری والدہ نے میرا پہنا ہوا وہ جوڑا جو میزاب الرحمت سے تر ہوا تھا سالوں اپنے پاس سنبھالے رکھا۔منٰی میں پڑاوٗ ہماری اپنی بندوبستی چھولداری میں تھا۔ عرفات میں کھلے آسمان اور تپتے سورج کے نیچے۔واپسی رات مزدلفہ میں اور اگلا دن منٰی میں شیطانوں کو کنکریاں مارنے میں گزرا۔ **شیطان انسانی دسترس میں تھے اور یہی وجہ تھی کہ لوگوں کی بڑی تعداد اپنے گناہ گنوا گنوا کر انہیں جوتے مار رہی تھی۔** کاش اس کی ریکارڈنگ میرے پاس ہوتی تو آپ بھی دیکھ کر محظوظ ہوتے ۔ہم نے سر منڈوائے اور قربانی کی۔ حاجی یعقوب اور حاجی قدرت شاہ کو ہم نے ایک خصوصی مشن پر بھیجا اور شام کو اپنے پڑاوٗ پر گردے کپوروں کی دعوت اڑائی۔حج سے واپسی کا وقت آ گیا۔ بسیں تیار کھڑی تھیں۔حاجی صاحبان میں سے کئی خانہ کعبہ کی دیواروں اور ملتزم سے چمٹے ہوئے تھے دو بزرگ حضرات واپس نہیں آرہے تھے۔آغا جی اور سردار سجاد سخت پریشانی میں تھے کیونکہ وقت نکلا جا رہا

تھا۔ متعدد افراد نے کوشش کی مگر انہیں واپس لانے میں کامیاب نہیں ہوئے ۔میں نے اجازت لی اور انہیں واپس لانے کے لئے صحن کعبہ پار کرنے لگا۔ دل میں سوچتا کہ کیسے انہیں واپس لاؤں گا لیکن خوش قسمتی رہی کہ کسی طرح انہیں واپس لانے میں کامیاب ہوگیا۔ جس پر آغا جی اور قافلے میں شامل دیگر افراد سے داد وصول کی ۔ دو بزرگوں کو تو واپس لے آیا۔ لیکن جونہی چپل لینے زمین پر جھکا نظر اللہ کے گھر پر پڑی میں بیگانہ وار اس کی طرف دوڑا اور خانہ کعبہ سے چمٹ گیا اور زار وقطار رونے لگا جس کی وجہ سے قافلے کی روانگی میں مزید نصف گھنٹے کی تاخیر ہوگئی بلاشبہ یہ میرا پہلا عشق تھا۔

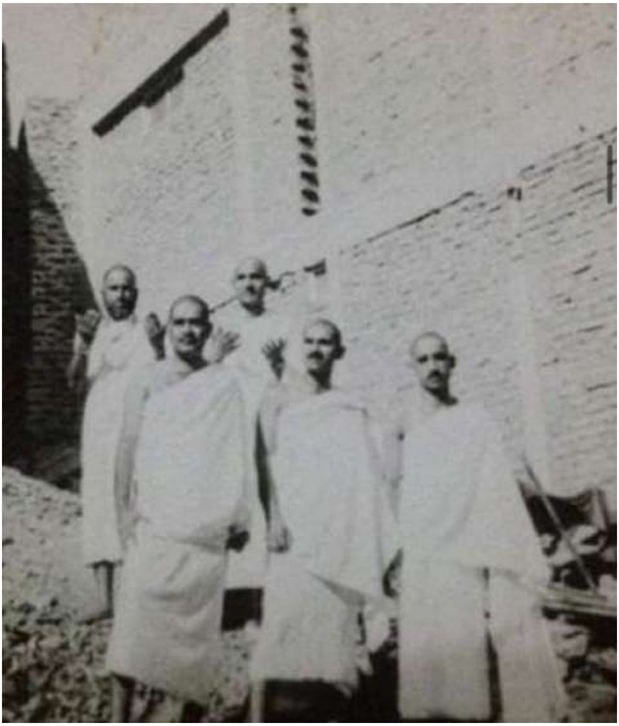
حج سے واپسی پر ہم ایران میں شدید برفباری میں پھنس گئے ۔ایک موقع پر ایمبولینس کے اندر ہی ہم نے رات بھر رہنے کا فیصلہ کیا۔ جلد ہی پولیس آ گئی اور اُنہوں نے ہمیں گاڑی سمیت وہاں سے ہٹا کر ایک محفوظ مقام پر پہنچایا اور ہمیں کہا کہ اگر تم رات یہاں رہ جاتے تو صبح تک زندہ نہیں بچتے۔ واقعی صبح تک کئی فٹ برف پڑ چکی تھی ۔باقی کا زیادہ تر سفر ہم نے گاڑی کے ٹائروں پر زنجیر باندھ کر طے کیا۔ ایران سے واپسی پر اصفہان میں نے روضہ رضا کے صحن میں 10 محرم کے دن انتہائی منظم سینہ زنوں کو غم حسین پر ماتم کرتے دیکھا جس کا ذکر پہلے آ چکا ہے ۔افغانستان میں قندہار شہر میں شدید برفباری کے دوران ایک رات اور ایک دن پڑاؤ رہا۔ سردی کے مارے برا حال ہوگیا تھا بہرطور یہ سفر کسی طرح طے کرتے ہوئے طورخم پہنچے۔ حج کا تقریباً ڈھائی تین ماہ کا سفر تجربات سے بھرا پڑا ہے جس میں بہت سے واقعات فتنہ پیدا ہونے کے اندیشہ کی بناء پر تحریر نہیں کئے جا رہے ۔انسانی کمزوری کا مشاہدہ اس قدر کیا کہ یہ بات آج بھی ذہن میں محفوظ ہے کہ ہر مرد وزن اور باریش و بے ریش انسان خطاء کا پتلا ہے حج ہو، دیگر عبادات یا معاملات انسان دانستہ یا نادانستہ خطاؤں کا مرتکب ہو جاتا ہے۔ لوگ رشتہ دار ہوں، میاں بیوی یا دوست چھوٹی چھوٹی باتوں پر لڑ پڑتے ہیں ۔دن بھر کی سفر کی تھکاوٹ کا اثر سب لوگوں میں برداشت اور صبر کی کمی کا باعث بنتا۔ چارسدہ کے دو اصحاب کی خوش اخلاقی ، برداشت اور امن پرستی کے ہم

بڑے پرستار تھے۔ حج سے واپسی پر جب ہم طورخم پہنچے۔ تو بس کی چھت پر کسٹم چیکنگ کے دوران وہ آپس میں لڑ پڑے۔ ایک نے دوسرے کو دھکا دیا۔ وہ بس سے نیچے گر پڑا اور اُس کی ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ اور مجھے اسے لیڈی ریڈنگ ہسپتال پہنچانا پڑا۔ ہم نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ کوئی دوستی یا رشتہ ہمیشہ پرامن نہیں رہ سکتا۔

انچارج سوشل سیکورٹی ڈسپنسری:۔

حج سے واپسی کے بعد ایمپلائیز سوشل سیکیورٹی انسٹیٹیوشن میں ایک میڈیکل آفیسر کی نشست واقع نشاط ٹیکسٹائل ملز میں خالی تھی۔ ادارے کے ڈائریکٹر درانی صاحب میرے والد کے جاننے والے تھے۔ میں ان سے ملا۔ انہوں نے بتایا کہ یہ ایک انتہائی پرخطر پوسٹ ہے اور اس سے پہلے دو ڈاکٹر صاحبان فیکٹری ملازمین کے تشدد کا نشانہ بن چکے ہیں۔ لہذا شاید میرے لئے یہ تعیناتی مناسب نہ ہو مگر چونکہ انگلینڈ جانے کے لئے میری جیب میں پیسے نہیں تھے۔ میں نے بہت اصرار کیا اور اپریل 1973ء میں مجھے وہاں میڈیکل آفیسر تعینات کر دیا گیا اور ایمبولینس میں آنے جانے کی اجازت بھی دی گئی۔ میں ڈیوٹی سے ایک شام پہلے حالات کا جائزہ لینے وہاں گیا۔ چوکیدار نے بتایا کہ متعین ڈاکٹر صاحبان کبھی کبھار ہی آتے ہیں۔ کام ڈسپنسر و دائیاں چلاتی ہیں۔ مل کے ملازمین علاقے کے غنڈہ عناصر کے زیر اثر ہیں میں ان خطرات کے باوجود دوسرے دن صبح نو بجے ڈیوٹی پر پہنچ گیا۔ چوکیدار سو رہا تھا بڑی مشکل سے اسے اٹھایا اور زبردستی ڈسپنسری کھلوائی، معلوم ہوا کہ صرف چند لوگ کارروائی ظاہر کرنے کے لئے دس گیارہ بجے آتے ہیں۔ حج کے اثرات نے عہدے سے ذمہ داری اور ڈسپنسری کے معاملات ٹھیک کرنے کے جذبے سے سرشار کر دیا تھا اس لئے اپنی ڈیوٹی کو دینی فریضہ سمجھ کر نبھانے کا فیصلہ کیا، اگلے چند دن لڑائی جھگڑوں، زور زبردستی اور مشت گریبانی اور ہوائی فائرنگ میں گزرے لیکن معاملات اس وقت تک درست نہیں ہوئے جب تک میں زیادہ تر غنڈوں پر مشتمل یونین کے عہدیداروں کو اپنے ساتھ ملانے میں

کامیاب نہیں ہو گیا۔ اسکے بعد یونین کے ورکرز کی پناہ میں تین ماہ کے دوران میں نے نہ صرف ڈسپنسری کے معاملات درست کروائے بلکہ ہزاروں ورکرز کا علاج بھی کیا۔ ملازمت چھوڑنے کے آخری دنوں انہی میں سے چند باثر افراد نے پنجگی میں میری دعوت بھی کی جو بادل نخواستہ مجھے قبول کرنا پڑی۔ ان مشکل دنوں میں مجھے بہت سیکھنے کا موقع بھی ملا سب سے بڑھ کر صبر، ضبط اور حالات کے زیر اثر عوامی رابطوں کے طریقے سیکھے۔ اس دور میں ہم اکثر مریضوں کا علاج اپنی بنی مکسچرو پُڑیوں سے کیا کرتے۔



Friends during Haj 1972
Left to Right: M. Yaqoob, Asghar Ali Shah, Qudrat Shah, Dr. Tariq Mufti, Mukhtiar Ahmad Jan

باب نمبر 6

برطانیہ کے شب وروز اور پیشہ ورانہ تربیت

میرے بھائی نے انگلینڈ سے میرے لئے نیشنل ہیلتھ سروس میں تعیناتی کے لئے خط بھجوایا اور میں اسلام آباد میں برطانوی سفارت خانے سے ویزہ لگوا کر 10 ستمبر 1973ء کو انگلینڈ روانہ ہو گیا۔ ہیتھرو ایئر پورٹ لندن پر میرے بھائی ڈاکٹر خالد، ڈاکٹر رضا خان اور انکی بیگم شاہین مجھے لینے آئے۔ میری جاب Darlington County میں تھی جس کے قریب ہی ڈاکٹر رضا محمد خان کسی ہسپتال میں عارضی سروس (Locum) کر رہے تھے۔ میں پہلے چند دن اُن کے گھر رہا۔ رضا خان میرے بھائی کے سکول فیلو اور گہرے دوست تھے۔ اُن کی بیگم ہمارے دوستوں شوکت رؤف، خورشید رؤف، ریاض اعوان اور افتخار احمد کی چھوٹی بہن تھیں۔ مسز رضا خان علی الصبح 4 - 3 بجے مجھے ناشتہ اور دن کو کھانے کیلئے سینڈوچز بھی بنا کر دیتیں جس کی وجہ یہ تھی کہ انگریزی کھانوں سے مجھے بسان آتی تھی۔ میرا ہسپتال وہاں سے بیس میل دور تھا بس کے ذریعے جانا ہوتا تھا۔

سائیکاٹری ہسپتال میں اٹیچمنٹ:۔

انگلینڈ میں ہسپتال کا میرا پہلا تجربہ Darlington County کے سائیکاٹری ہسپتال میں اٹیچمنٹ تھی۔ جلد ہی مجھے ہسپتال میں رہائش مل گئی اور میں نے وہاں رہنا شروع کر دیا۔ انگریزی ماحول میں نوکری کا پہلا تجربہ تھا۔ دو ہندوستانی ڈاکٹروں کے علاوہ سب گورے تھے۔ میں ڈاکٹر ایلف (ELF) کنسلٹنٹ سائیکاٹرسٹ یعنی ماہر نفسیات کے ساتھ منسلک ہوا۔ دو یا تین دیگر کنسلٹنٹس بھی وہاں تعینات تھے۔ مجھے رہنے کیلئے اپارٹمنٹ پہلی منزل پر ملا تھا۔ پہلے دن کام کے بعد شدید تھکاوٹ تھی۔ میں نے سوچا کہ گرم پانی کے ٹب کو بھر کر مزے سے اس میں لیٹوں گا اور اپنی تھکاوٹ دور کروں گا۔ نلکے ٹب بھرنے کیلئے کھول دیئے اور خود بیڈ پہ لیٹ گیا اور خواب خرگوش کے مزے لینے لگا۔ کچھ ہی دیر بعد

اپارٹمنٹ کا دروازہ کھٹکھٹانے اور لوگوں کی شور سے آنکھ کھلی۔ تیزی سے بیڈ سے نیچے کودا تو پاؤں ٹخنوں تک پانی کے اندر تھے۔تب احساس ہوا کہ جوٹب بھرنے کے لئے نلکا کھلا چھوڑ آیا تھا اُس سے تمام فرش کے اُوپر پانی پھیل گیا ہے۔ نلکا تیزی سے بند کیا لوگوں سے انتہائی معذرت کی۔لکڑی کے چھتیں اور فرش تھے جس سے پانی رس کر نچلے اپارٹمنٹ میں چلا گیا تھا۔ ایمرجنسی نافذ ہوگئی۔ سب لوگوں نے مل کر میرے اپارٹمنٹ سے پانی نکالا۔ دل میں جو بھی برا کہا ہوگا مگر منہ سے کچھ نہ کہا اور میری مدد کرتے رہے۔ اس جرم کی مجھے کوئی سزا نہ ملی۔ غالباً ہاؤس کیپنگ والوں نے باقی کا گھر خشک اور صاف کیا ہوگا۔ کیونکہ مجھے کسی دوسرے اپارٹمنٹ میں وقتی طور پر منتقل کر دیا گیا تھا۔ اگلے دن میں واپس اپنے اپارٹمنٹ میں گیا تو یہ پتہ ہی نہیں چلا کہ ایک دن پہلے یہاں کچھ ہوا تھا۔تب سے آج تک غسل خانے میں محتاط رہتا ہوں۔ ہسپتال کے باہر سرخ رنگ کا اینٹوں کا ڈبہ نما کھوکھا تھا۔ میں نے اپنی ماں کو پہلا خط لکھا اور اس کھوکھا کے قریب پہنچا کہ خط اس میں ڈال سکوں اسی اثناء قریب کھڑی ایک خاتون نے مجھے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا اور کہنے لگی۔ "Hay lad, this is not a letter box" میں نے غور سے ڈبے پر لکھے الفاظ پڑھے جو یہ تھے "LITTER BOX"۔ اور یہ میری پہلی خفت تھی۔ میں تو سمجھا تھا کہ یہ لیٹر باکس ہے لیکن حقیقت میں یہ گند پھینکنے کا ڈبہ تھا۔اس ہسپتال میں چائے کے وقفے کے دوران صبح تمام میڈیکل عملہ ایک بڑے کمرے میں بیٹھ جاتا اور گپیں ہانکتا۔ سینئر لوگ تھے مجھے ویسے بھی اُن کی تلفظ کی وجہ سے زیادہ سمجھ نہ آتی تھی پھر بھی اُن کے ساتھ بات بات پہ ہنستا۔ ایک بار ڈاکٹر ایلف اندر داخل ہوئے تو دو سینئر کنسلٹنٹ کسی بات پر ہنسنے لگے۔ کچھ دیر بعد ڈاکٹر ایلف مجھ سے پوچھنے لگے کہ کیا تمہارے خیال میں وہ سائیکاٹرسٹس مجھ پر ہنس رہے تھے؟ میں نے جواب دیا کہ ''معلوم نہیں''۔ انہوں نے کہا ''میرا خیال ہے کہ وہ مجھ ہی پر ہنس رہے تھے''۔ یہ بات ڈاکٹر ایلف اگلے چند دنوں میں اتنی دفعہ دہرائی تو مجھے احساس ہوا۔ کہ ڈاکٹر ایلف پیرانائیڈ (Paranoid) ہو گئے ہیں۔ ویسے بھی مجھے وہاں تمام سائیکاٹرسٹ کھسکے

ہوئے لگتے تھے۔مریضوں کے اُوٹ پٹانگ رویوں کو دیکھ کر عجیب سا محسوس ہوتا۔ایک دن ڈاکٹر ایلف مجھے ای ٹائپ جیگو وار گاڑی میں بٹھا کر موٹر وے کے راستے اپنے کمیونٹی کلینک لے جا رہے تھے کہ اچانک انہوں نے درمیانی لائن میں زور سے بریک لگا دی۔میں اچھل پڑا، اللہ کا شکر ادا کیا کہ پیچھے سے آنے والی گاڑیوں نے ٹکر نہیں ماردی ورنہ بہت برا ہوتا۔ڈاکٹر نے بتایا کہ اپنی منزل سے تیس کلومیٹر آگے آ گئے تھے بہر حال خیر ہوگئی۔اگلا ایگزٹ (Exit) لے کر واپس مڑے اور کلینک پہنچ گئے۔یہ ذہنی دباؤ میں مبتلا نوجوان خواتین مریضوں کا کلینک تھا۔ایک کمرے میں مجھے بٹھایا اور کہا کہ ان مریضوں کا ایک ایک کر کے قصہ سنیں اور اس کا مختصر نوٹ بنا کر مجھے بھجواتے جائیں۔رنگ برنگے قصے تھے کسی کو نیند نہیں آتی تھی تو کسی کو محسوس ہوتا تھا کہ اُس کا بازو اُس کے جسم سے الگ ہو گیا ہے۔ایک خوبرو خاتون کا مسئلہ یہ تھا کہ اس کی عمر بیس سال سے زیادہ ہوگئی تھی لیکن ابھی تک اس کا جسمانی تعلق نہ بنا تھا اور اب بوائے فرینڈ بنانے سے اس لئے گریز کر رہی تھی کہ بوائے فرینڈ کیا کہیں گے کہ وہ اتنی نااہل تھی کہ جوانی کے مشغولات (Normal Ritual) سے نہیں گزر سکی۔مغربی ملکوں میں ریفرنس کے بغیر جاب ملنا تقریباً ناممکن ہوتا ہے۔مجھے میرے کنسلٹنٹ نے بتا دیا تھا کہ وہ سائیکاٹری کی جاب کے علاوہ مجھے ریفرنس نہیں دیں گے لیکن میں تو سرجری میں دلچسپی رکھتا تھا۔ایک دن ایک بزرگ مریض نے فرش پر گرنے کے باعث اپنا سر پھوڑ لیا جس سے خون رسنا شروع ہو گیا۔سائیکاٹرک ہسپتال ہونے کی وجہ سے نرسیں اور دیگر میڈیکل عملہ اس صورت حال کو سنبھالنے کے قابل نہ تھے۔ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔اتفاق سے میں ڈیوٹی ڈاکٹر تھا۔میں نے تیزی سے حالات کو سنبھالا۔سر کے زخم سے خون بہت بہتا ہے۔جسے روکنے کیلئے انگلیوں کے ذریعے ایک خاص طریقے سے پریشر دینا ہوتا ہے۔یہ طریقہ میں نے سرجری کی ہاؤس جاب کے دوران سیکھا تھا۔میں نے زخم سے خون کو بہنے سے روک دیا۔اتنے میں مجھے ایمبولینس کے آرڈر پہ دستخط کرنے کو کہا گیا۔تو میں نے کہا کہ کیا آپ کے پاس فرسٹ ایڈ کا باکس ہے۔جو موجود تھا

اور کبھی استعمال نہیں ہوا تھا۔ نرسوں نے نروس حالت میں باکس ڈھونڈ نکالا۔ میں نے اُس میں ٹانکے لگانے کے آلات دیکھ لئے اور کہا کہ میں ٹانکے لگانا چاہتا ہوں۔ جس پر سب نے منع کیا کہ یہ بہت بڑی سرجری ہے اور آپ ناتجربہ کار ہیں۔ میں نے اُنہیں یقین دہانی کرائی اور تیزی سے چند ٹانکے لگا دیئے۔ سر پر پریشر پٹی باندھی اور ایمرجنسی کی صورت حال قابو میں آ گئی۔ ہر طرف سے تحسین آمیز نظریں مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں بھی بہت خوشی محسوس کر رہا تھا۔ بعد میں بزرگ خاتون کو قریبی جنرل ہسپتال بھیجا گیا اور وہاں کے ڈاکٹروں سے کاغذی کاروائی کے بعد لکھا کہ ٹانکے صحیح لگائے گئے ہیں اور ٹیٹرا سائیکلین (Tetracyclin) لکھ دی جو سالوں سے رائج تھی بند کروائی۔ اگلی صبح سینئر ڈاکٹروں کو بھی رپورٹ مل گئی مجھے ڈاکٹر ایلف نے بلوایا اور ایک خط ہاتھ میں تھما دیا جس میں لکھا تھا کہ میں سرجیکل مہارت رکھتا ہوں اور سرجن بننے کیلئے موزوں رویہ رکھتا ہوں۔

بشپ آکلینڈ جنرل ہسپتال:۔

جلد ہی مجھے بشپ آکلینڈ کے جنرل ہسپتال میں ایک آرتھوپیڈک کی آسامی کیلئے انٹرویو کا موقع حاصل ہو گیا۔ بشپ آکلینڈ، جنوبی انگلینڈ میں واقع ایک نسبتاً چھوٹا شہر ہے۔ یہاں نوکری ملنے کا امکان تو بہت کم تھے مگر غالباً مجھ سے پہلے اُمیدوار نہ آ پائے تھے لہذٰا میرے انٹرویو کے دن میں واحد امیدوار تھا۔ انگلینڈ میں نوکری کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ وہ پچھلی ملازمت کے ریفرنس کو ڈاکٹر کی اصل صلاحیت سمجھتے ہیں اور انٹرویو کے دوران عملی طور پر اپنی صلاحیتوں کے اظہار کا نہیں کہتے۔ میرے کیس میں چونکہ سرجری یا آرتھوپیڈک کا کوئی ریفرنس نہیں تھا۔ میرا انٹرویو لینے والے کنسلٹنٹ نے کہا کہ کیا آپ کو کلائی کا فریکچر (Colles' Fracture) ٹھیک کرنا آتا ہے۔ میرے سر ہلانے پر اُس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا اور کہا کہ فرضی طور پر میری کلائی کی ہڈی کو ٹوٹا ہوا سمجھ کر مروجہ طریقے پر عمل کر کے دکھائیں۔ یہ میں نے اپنے ہاؤس جاب کے تجربے کے بنیاد پر اعتماد کے ساتھ کر دیا اور یوں مجھے ملازمت مل گئی۔ میں چھ ماہ تک

آرتھوپیڈک کا ہاؤس آفیسر رہا۔ یہاں پر میں نے انگریزی طریقہ کار وشعبہ ہائے زندگی کے آداب کے تحت بہت سارے چھوٹے موٹے آپریشن اور مریضوں کا علاج کیا جو میں پاکستان میں پاکستانی طریقے سے سیکھ کر آیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی کچھ نئے قسم کے آپریشن جس میں Hip Replacement شامل ہیں میں معاونت کا موقع ملا اور یوں برٹش میڈیکل ہسپتال کلچر سے شناسائی ہوگئی۔

برنالڈ قلعہ (Barnard Castle) قریب ہی ایک چھوٹا اور خوبصورت گاؤں تھا۔ اسے دیکھنے ایک نرس کے ہمراہ گئے تو دلچسپ منظر دیکھنے کو ملا کہ باہر نصب شدہ ایک چاندی کی بطخ کے منہ میں اگر پیسہ ڈالیں تو نگل لیتی تھی۔ یہ قلعہ کے اندر جانے کا ٹکٹ تھا۔ بعد میں اپنے تمام مہمانوں کو میں وہاں سیر کے لئے لے جاتا۔ میں اس گاؤں سے خاصہ مانوس ہوگیا۔ انگریزوں کی بودو بوش دیکھنے کا خوب موقع ملا۔ پہلی بار پتہ چلا کہ Pet Dog یعنی پالتو کتے کو کس قدر اہمیت دیتے ہیں۔ اسے میز کے گرد کرسی پر بٹھاتے ہیں اور جب وہ اُن کی آپس کی بات چیت پر سر ہلاتا ہے تو یہ اکثر اس کی رائے بھی لیتے ہیں۔ جو وہ ہلکا سا بھونک کر دے بھی دیتا ہے۔ چھوٹے قصبے کا ہسپتال ہونے کی وجہ سے ڈاکٹروں کی غیر معمولی عزت کی جاتی تھی اور یوں میں اُن کے کلچر میں رچ بس گیا۔ وہاں ہم صرف دو یا تین انڈین/ پاکستانی ڈاکٹر تھے اور باقی سب گورے تعینات تھے۔ مسٹر" رو (ROW)" جو میرے کنسلٹنٹ تھے مجھ پر انتہائی مہربان تھے ان سے میں نے بہت کچھ سیکھا انہیں میں آخری دم تک ایک گورا سمجھتا رہا۔ جب انہوں نے میری ملازمت سے رخصتی کے موقع پر حسب دستور اپنے گھر میں میری دعوت کی تو ان کی سکاٹش اہلیہ نے بتایا کہ مسٹر رو دراصل بھارت کے ہندو پنڈت ہیں اور طویل عرصہ سے یہاں مقیم ہیں۔ اس لئے ان پر گورے کا شبہ ہوتا ہے۔ اب سمجھ آئی کہ یہ "رو" نہیں ہے بلکہ "راؤ" ہے۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ ایک ہندو پنڈت بھی ایک مسلمان ڈاکٹر سے اس قدر محبت اور چاہت رکھ سکتا ہے۔ وہیں ایک ڈاکٹر جس کا نام "علیم علی" پکارا جاتا تھا۔ چھ ماہ تک میری بہت خدمت کرتا رہا چونکہ میں ایک لا پرواہ سا بندہ تھا اور اکثر اپنے اُتارے

ہوئے کپڑے ادھر اُدھر پھینک دیتا، یلم علی میرے اپارٹمنٹ میں آتا تو میرے کپڑے اُٹھا کر لانڈری کے لئے لے جاتا، مجھے دھلے ہوئے استری شدہ کپڑے ملتے۔ وہ جنوبی بھارت کے علاقے کیرالہ کا رہنے والا تھا۔ میں آخر دم تک اُس کو ایک مسلمان سمجھتا رہا۔ جب اُس نے میرے جانے پر دعوت کی تو دو تین دوست بھی بلائے وہ سب ہندو تھے میں نے اُس سے پوچھا کہ یار تم مسلمان ہو اور دوست تمہارے سارے ہندو ہیں تو اُس نے انکشاف کیا کہ وہ خود بھی ہندو ہے اب مجھے ہوش آیا کہ یہ نام یلم علی نہیں ہے بلکہ" یلا مالی" ہے۔ اس عظیم ہندو ساتھی کو بھی میں کبھی نہیں بھول سکتا کیونکہ جانے انجانے میں میں نے کتنی ہی بار غیر ذمہ دارانہ باتیں کر کے اُس کا دل دکھایا ہوگا مگر وہ اُف تک نہ بولا۔ اور نہ ہی اُس کے رویہ میں فرق آیا۔

ہڈرزفیلڈز رائل انفرمری:۔

یہ Midland علاقے کا روایتی شہر ہے۔ مجھے اگلی ملازمت یہاں ملی۔ ہسپتال نیا اور شاندار تھا۔ رہائش اندر ہی تھی۔ کھانا پینا مفت تھا۔ کمرہ صاف کرنے کے لئے میڈ کی سہولت بھی تھی۔ کلب بھرپور تھا۔ یہاں میرا سائڈ روم میٹ ڈاکٹر محب اللہ ای این ٹی میں جاب کرتا تھا اور خیبر میڈیکل کالج میں مجھ سے چند سال سینئر تھا۔ اور تعلق دیر سے تھا۔ اس سے میرا بہت اچھا تعلق قائم ہو گیا۔ تقریباً ایک سال ہم نے ہسپتال میں بہت نام کمایا۔ پروفیسر محب اللہ خیبر میڈیکل کالج و صوبے کا اعلی ترین ای این ٹی سرجن رہنے کے بعد اب پروفیسر و نارتھ ویسٹ میڈیکل انسٹیٹیوٹ پشاور کا پروپرائیٹر ہے۔ اس شہر میں، میں نے سپورٹس۔ سکیٹینگ و سوئمنگ میں مشق اندازی کی۔ یہاں بھی مجھے انگریز کلچر کو مزید دیکھنے کا موقع ملا۔ میری جاب آرتھوپیڈک میں چھ ماہ کے لئے ایک مشہور سرجن مسٹر آنن (Mr. Annan) کے ساتھ تھی۔ بہت کچھ سیکھنے کو ملا۔ مسٹر آنن بعد میں میرے FRCS کے ممتحن بھی بنے۔ میں نے ایف آر سی ایس کے پہلے حصے کا امتحان یہیں سے پاس کیا۔

لیڈز جنرل ہسپتال:۔

وسطی برطانیہ کے اس مشہور شہر کے سب سے بڑے ہسپتال میں نوکری ملنے پر میں بہت خوش تھا۔ چھ ماہ میں نے یہاں آرتھوپیڈک سرجری میں گزارے۔ یہاں ماحول بہت تدریسی تھا۔سرجری کے دیگر شعبوں سے بھی روابط رہتے۔ٹیم ورک کا تجربہ ہوا۔ایک روز کلب میں اکیلا ڈارٹ کی نشانہ اندازی کر رہا تھا(اسے آجکل آرچری کا کھیل بھی کہتے ہیں) کہ ایک گورے نے مجھے مقابلے کی دعوت دی۔مقابلہ بھی ہوااور بہت آزادانہ گپ شپ بھی رہی۔دوسرے دن وارڈ میں ایک پروفیسر کا سامنا ہوا تو دیکھا کہ یہ صاحب تو وہی ہیں جنہوں نے گذشتہ رات کلب میں میرے ساتھ مقابلہ کیا۔اس واقعہ کے بعد بڑے پروفیسروں کے سامنے جھجھک وغیرہ ختم ہوگئی۔ایک اور دلچسپ واقعہ پیش آیا کہ ایک دن میری گاڑی اچانک گم ہوگئی پولیس کو رپورٹ کی جنہوں نے تسلی دی اور اگلی صبح مجھے اطلاع ملی کہ قریب کی گلی میں میری گاڑی صحیح سلامت کھڑی ہے۔معلوم ہوا کہ نوجوان کبھی کبھار گاڑیاں تفریح طبع کے لئے اٹھالے جاتے ہیں اور اکثر صحیح سلامت واپس کھڑی کر دیتے ہیں۔سنڈر یلا و راگ فیلر دو جڑواں کلب وہاں کی مشہور مقامات تھے جہاں ہسپتال والے کئی بار پارٹیوں کا اہتمام بھی کرتے۔ پاپ میوزک ڈانس کے آداب سے شناسائی ہوئی۔اور حسن ظن میں بدرجہ اتم اضافہ ہوا۔

سنڈرلینڈ جنرل ہسپتال۔جنوبی برطانیہ:۔

شمالی انگلینڈ کے شہر سنڈرلینڈ میں مجھے روٹیشن کی دوسال کی جاب مل گئی۔اوراسی دوران میں نے پاکستان آکر شادی بھی کر لی۔اس روٹیشن جاب نے مجھے مختلف نوعیت کی سرجری سیکھنے کا موقع فراہم کیا۔نیوکاسل (New Castle-Upon-Tyne) کے تدریسی ہسپتال آدھے گھنٹے کی مسافت پر تھے۔جہاں کئی تعلیمی و پیشہ ورانہ لیکچرز و کانفرنسوں میں شرکت کا موقع ملا۔چندلوگ میرے ایف آر سی ایس امتحان کے ممتحن بھی ہوئے۔سنڈرلینڈ کی فٹبال ٹیم کے ہوم میچ میں ان کی ٹیم کا ڈاکٹر بھی رہا۔سپورٹس

میڈیسن سے متعلق جاننے کا موقع بھی ملا۔ فٹبال کلچر نے میرے فٹبال سے لگاؤ کو تقویت دی۔ یہاں میں دو سال رہا اور سینئیر ہاؤس آفیسر روٹیشن کی۔

سٹروک آن ٹرنٹ ۔مڈلینڈ:۔

1977ء میں مجھے سٹروک آن ٹرنٹ میں ایک انتہائی اچھی روٹیشن سرجیکل ٹریننگ رجسٹرار کا عہدہ مل گیا۔ ان ملازمتوں کا مجھے فائدہ یہ ہوا کہ ہر قسم کی سرجری کی تربیت سے گزرا اور بعد میں پاکستان آکر تقریباً ہر سرجیکل شعبے کے متعلقہ آپریشن بطور جنرل سرجن کرتا رہا۔ برطانیہ کی ٹریننگ اُس زمانے میں اگرچہ کسی حد تک سٹرکچر ہوگئی تھی مگر اتنی نہ تھی کہ جتنی آج ہے۔ یہ ضرور تھا کہ ہمیں ہفتے میں آدھا دن مختلف جگہوں پہ ٹریننگ ورکشاپس یا کورس میں شرکت کرنے کیلئے ہسپتال کے خرچے پر بھیجا جاتا۔ جب میں نے پارٹ ون پاس کیا تو اس قسم کا کوئی کورس نزدیکی علاقے میں جاری نہ تھا۔ میرے ایک کنسلٹنٹ نے مجھے کہا کہ کیا ہم خود ہی ایسا کورس منعقد نہیں کر سکتے۔ میں نے حامی بھر لی۔ وہ خوش ہوا اور مجھے پریزینٹیشن کا کہا۔ اس طرح ہمارے ہسپتال کے اندر ہی ٹریننگ شروع ہوگئی۔ جس میں اکثر و بیشتر میں بطور ٹیچر حصہ لیتا رہا۔ بہت سے ڈاکٹر مجھے ایف آرسی ایس پاس سمجھتے تھے۔ ان کو اُس وقت حیرت ہوئی جب میں اُن کے ساتھ ایڈنبرا (Edenburgh) میں فیلوشپ کا امتحان فروری 1979ء میں دینے گیا اور ایف آرسی ایس کر لیا۔

انگلینڈ میں سائیکاٹری سے تربیت شروع ہوئی۔ آرتھوپیڈک اور کیجولٹی، جنرل سرجری، شعبہ دل و پھیپھڑوں کی سرجری (جہاں میں نے کچھ عرصہ سینئیر رجسٹرار کے طور پر بھی کام کیا)، یورالوجی اور چند دیگر شعبہ جات میں ماہرین کے ساتھ کام کرنے کے بعد میں انتہائی پر اعتماد سرجن بن گیا۔

1979ء میں ایبٹ آباد میں ایوب میڈیکل کالج وجود میں آچکا تھا۔ میڈیکل کالج پروفیسر اے جے خان اور اس وقت کے گورنر جنرل فضل حق کی کاوشوں کے نتیجے میں بنا۔ پروفیسر اے جے خان کی جانب سے پیش کش کی وجہ سے ہم نے پاکستان واپس آنے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ لیکن اس سال کی آسامیاں میرے آنے سے پہلے پر ہوگئی تھیں۔ اس کے باوجود چند بزرگوں کے مشورے کی بناء پر میں پاکستان واپس روانہ ہوگیا۔

باب نمبر 7

کیریئر بطور سرجن

سینئیر رجسٹرار سرجری لیڈی ریڈنگ ہسپتال، پشاور

لیڈی ریڈنگ ہسپتال میں مجھے سینئر رجسٹرار کی پیشکش میرے سسر مفتی نثار احمد کی کوششوں سے ہوئی۔ میں 13 دسمبر 1979ء کو پشاور بمعہ فیملی پہنچ گیا اور 15 دسمبر کو بغیر کسی توقف کے (سرجیکل۔بی) میں ڈیوٹی جائن کر لی۔ اس عمل نے بعد کے مدارج میں میری ترقی کے سلسلے میں بہت مدد کی۔ شعبہ سرجری کا بہت حصہ فنی اور ٹیکنیکی ہوتا ہے لہذا کسی اور دیگر فنون کے سیکھنے کی طرح اس میں بھی کہا جاتا ہے کہ اگر آپ زیادہ سے زیادہ سرجنوں یا ماہر سرجری کے ساتھ کام کریں تو آپ کے لئے بہتر ہوتا ہے۔ خوش قسمتی سے مجھے بھی بہت مواقع ملے، سینئیر رجسٹرار لیڈی ریڈنگ ہسپتال پشاور رہتے ہوئے پروفیسر ڈاکٹر مکرم خان سرجن" جن کو پیراٹڈ سرجری (Parotid Surgery) اور (Thyroid) یعنی گلہڑ کی سرجری کرنے میں کافی دلچسپی تھی اور صوبے بھر سے کیس ان کے پاس آتے تھے سے مجھے فرسٹ ہینڈ مہارت بھی حاصل ہوئی۔ بہت سارے معاملات ایسے ہوتے ہیں کہ انسان سینئیر کے بجائے جونئیر سے بھی سیکھ لیتا ہے۔ پراسٹیٹ سرجری انگلینڈ میں جس طریقے سے کرتے تھے کہ اس میں پراسٹیٹ پرے کرنے کے بعد ایک خاص طرح کی سوئی جسے بومرنگ (Boomerang) کہتے ہیں کے ذریعے ٹانکا لگایا جاتا تھا۔ پاکستان میں یہ سہولت نہیں تھی۔ میرے رجسٹرار ڈاکٹر خالد سعید خاصے تگڑے تھے اور جب وہ یہ سرجری کرتے تو پیکس کے ذریعے "جنہیں تولئے بھی کہا جاتا ہے" پریشر دے کر بلیڈینگ کو روکتے اور انہیں یہ پیک جن کی ایک دم نکلی ہوتی تھی بدن سے دو دن بعد آہستہ آہستہ نکال دیا جاتا۔ حیرت کی بات ہے کہ زیادہ تر کیسز میں بغیر کسی مشکل اور پیچیدگی کے یہ سارا کچھ ہوجاتا تھا اور اس کے بعد نتائج بہت اچھے آتے تھے۔ اس قسم کے بیشمار دیگر فنی نقطے میں نے اپنے سینئیر ز و جونئیر ز رفقاء سے بھی سیکھے۔

پاکستان کے لوکل سرجیکل کلچر کو اپنانے میں اس سینئیر رجسٹرارشپ نے میری بہت مدد کی۔

سرجری ڈیپارٹمنٹ۔ایوب میڈیکل کالج وہسپتال،ایبٹ آباد:۔

مارچ 1981ء کو ایوب میڈیکل کالج میں شعبہ سرجری بطور اسسٹنٹ پروفیسر جوائن کیا تو معلوم ہوا کہ سرجری ہسپتال میں کام کرنے کے بجائے مجھے ایک سال ایوب میڈیکل کالج میں رہ کر اناٹومی کا سبجیکٹ پڑھانا ہوگا بادلِ ناخواستہ کرنا پڑا۔میں نے خود سے اختراع کر کے فرسٹ ایڈ پڑھانا شروع کیا اور طلباء کا ہر دل عزیز بن گیا۔ایک سال یہ پڑھانے کے بعد بطور اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ سرجری کو جوائن کیا۔وارڈ کے انتظامی امور کی ترتیب سے سربراہ ڈیپارٹمنٹ کو اختیار حاصل ہوتا ہے کہ وہ آپ کو کیا اہمیت دے جو جلد ہی مجھے معلوم ہوگئی۔ وارڈ راؤنڈ زروزانہ ہوتا تھا اس میں بطور جونئیر سرجن میں سب سے آخر کھڑا ہوتا تھا۔مریض کے بارے میں تبادلہ خیالات بھی ہوسکتی تھی لیکن ڈسکشن سے زیادہ حکم نافذ ہوتے تھے۔ جونئیر کی دوائیوں کو کاٹ کر سینئیر کے طریقہ علاج و دوائی کو بغیر وجہ بتائے لکھوا دیا جاتا تھا یہ طریقہ انگلینڈ کے طریقہ سے مختلف تھا۔جہاں چیزوں کو زیر بحث لا کر ان کی منطقی حیثیت سب کی رائے سے متعین کی جاتی اور سائنٹیفک بنیاد پر علاج کیا جاتا۔

شروع کے چند ماہ میرے ذمے تمام ایمرجنسی کیسز کو دن رات ڈیل کرنا تھا۔اگر چہ یہ بہت محنت طلب اور زمہ داری کا کام تھا لیکن مجھے خوشی تھی کہ مختلف نوعیت کے سرجیکل کیسز کا وسیع تجربہ ہو رہا تھا۔اس میں سوائے نیوروسرجری کے ہر قسم کے مریض شامل تھے۔ مجھے احساس تھا کہ میرا کام خصوصی توجہ سے جانچا جا رہا ہے اس لئے غلطی کرنے کی گنجائش کم تھی۔ میں اپنی کارکردگی کا ریکارڈ رکھنے پہ بھی مجبور تھا۔جسکا فائدہ بعد میں مجھے اپنے ACR کا دفاع کرنے میں ملا۔

نیوروسرجری ٹریننگ۔جناح پوسٹ گریجویٹ میڈیکل انسٹیٹیوٹ (JPMC) کراچی:۔

1982ء شعبہ سرجری ایبٹ آباد میں مریضوں کی خاصی تعداد سر و کمر کی چوٹ والی ہوتے یا

دیگر نیوروسرجری کی پریکٹس سے متعلق ہوتے۔اس زمانے میں صوبہ سرحد(موجودہ خیبرپختونخوا) میں کوئی نیوروسرجن موجود نہ تھا۔ نیوروسرجری کے قابل سرجری کیس لاہور یا کراچی منتقل کر لئے جاتے یا علاج نہ ہونے کی وجہ سے زندگی سے محروم ہوجاتے یا پھر قدرت بچا لیتی۔ چند ایسے کیسز دیکھنے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ میرے سمیت اس شعبے میں تربیت نہ ہونے کی وجہ سے ہم بہت سے لوگوں کی زندگی نہیں بچا پاتے۔ میری ذاتی تربیت نیوروسرجری میں نہ ہوئی تھی۔ ذہن میں ایک خواہش ابھری کہ پاکستان میں کراچی نیوروسرجری ڈیپارٹمنٹ میں تربیت حاصل کروں یہ ذکر میں نے اس وقت کے سیکریٹری ہیلتھ صوبہ سرحد(موجودہ خیبرپختونخوا) ڈاکٹر محمد زمان خان کو کیا۔ وہ ایک دھڑلے والی شخصیت تھے۔ بہت خوش ہوئے اور لگے ہاتھوں مجھے چھ ماہ کے لیئے سرکاری خرچے پہ JPMC کراچی پروفیسر ڈاکٹر بھٹی (جو ڈاکٹر جوما کے انتقال کے بعد پاکستان کے نمبر 1 نیوروسرجن مانے جاتے تھے) کے پاس بھجوادیا۔ میں ڈاکٹر بھٹی کے سخت معیار اور سرجیکل نظم وضبط پر پورا اترتے ہوئے جلد ہی انکا منظورنظر بن گیا اور اگلے چھ ماہ تمام شعبہ دن رات میرے بس میں رہا۔ بہت لگن سے انہوں نے سیکھایا اور میں نے سیکھا۔ وہیں پہ پروفیسر ڈاکٹر ذکی ماہر نیورالوجسٹ کے ساتھ اکھٹے اور خصوصی راؤنڈز میں نیورولوجی سے بھی خاصی شناسائی ہوگئی۔

کراچی میں نیوروسرجری تربیت کرنے کے دوران ایک مریض سے سامنا ہوا جس کے دماغ میں رائفل کا پورا بولٹ اس کی آنکھ کے ذریعے گیا ہوا تھا اس سے پوچھا تو کہا کہ میں اپنے دشمن کے دس سالہ بچے پر گولی چلا رہا تھا اور جونہی میں نے گولی چلائی وہ خطا ہونے کے بجائے گولی نے بیک فائر کیا اور بولٹ اسکے آنکھ کے زریعے سر میں چلا گیا۔ مریض بول سکتا تھا لیکن اسکو فالج ہو گیا تھا بولٹ اندر تھا بھٹی صاحب میرے باس تھے ان سے مشورہ ہوا۔ ہم نے اسکا بولٹ نکالا۔ آنکھ تو ضائع ہوگئی لیکن مریض صحت یاب ہوگیا اور بہت عرصے تک وہ وارڈ میں رہا۔ آپریشن کرنے کے بعد اسے ایک عجیب کیفیت ہوئی وہ یہ

کہ یہ مریض جوان پڑھ تھا اچھا حساب کتاب کا ماہر بن گیا۔اس حالت کو ہائپر کیلکولیا بھی کہتے ہیں۔ یہ حالت کچھ عرصہ قائم رہی اور بعد میں وہ اپنی اصلی دماغی حالت میں آ گیا۔

نیوروسرجری ٹریننگ کے بعد ایبٹ آباد واپس آیا تو نیوروسرجری کے آلات میسر نہیں تھے۔ میں نے فیصلہ کیا کہ اپنی جیب سے سیالکوٹ جا کر تقریباً دو لاکھ کے آلات خریدے اور یوں DHQ ہسپتال ایبٹ آباد میں نیوروسرجری بھی شروع کر دی۔ مجھے پشاور میں کنسلٹنٹ نیوروسرجن کی آفر بھی دی گئی جو میں نے اپنی جنرل سرجری کی پسند کی وجہ سے نہ قبول کی۔تقریباً ایک سال بعد ڈاکٹر اعزاز علی شاہ نے پشاور میں شعبہ نیوروسرجری شروع کیا۔

شمریز نامی نوجوان سر کی چوٹ کے ساتھ لایا گیا اور میں نے اسکا سر کھول کر اندر سے خون کی نالیاں پھٹی ہوئی اور لوتھڑے تھے اور اسکا بروقت آپریشن کر کے جان بچائی اور وہ کئی دھائیوں کے بعد بھی مجھ سے ملتا رہتا ہے۔اس قسم کے کئی دیگر شدید چوٹ کے کیسز آئے۔اور بروقت علاج سے رو بہ صحت ہو گئے۔اس کے علاوہ برین ٹیومر (دماغی ٹیومر)، ہائیڈروکیفلس و دیگر ممکن آپریشن کئے۔ چند ڈاکٹروں کو تربیت بھی دی۔ پشاور میں بھی چند اہم کیسز کے لئے بلوایا گیا۔اس لحاظ سے میں صوبہ سرحد (موجودہ خیبر پختونخوا) کا پہلا نیوروسرجن تصور کیا جا سکتا ہوں۔ 1996ء میں ڈاکٹر ساجد نذیر بھٹی کی ایوب میڈیکل کالج آمد پر نیوروسرجری ان کے حوالے کر دی۔ 1984ء میں گورننگ باڈی کے قوانین کے مطابق ہمیں ایوب میڈیکل کالج کی سروس میں باقاعدہ ہمیں ضم کر دیا گیا۔اس وقت کے رولز کے مطابق میری ترقی ایسوسی ایٹ پروفیسر کے لیول پر ہو گئی۔سرجری ڈیپارٹمنٹ میں ایک نئے وارڈ کی تخلیق کے بعد سرجن ڈاکٹر سید سلطان اور مجھے سرجیکل بی وارڈ واقع فرسٹ فلور ایبٹ آباد DHQ ہسپتال منتقل کر دیا گیا۔ڈاکٹر سید سلطان جو بعد میں پروفیسر بن گئے کا ہمیشہ میں نے بہت احترام کیا ہے۔انہوں نے مجھے جونیئر collegue کے باوجود بہت حد تک اختیار دیا۔ وارڈ میں میں نے سرکاری کھاتے کے علاوہ

مریضوں کے کوائف کا ایک علیحدہ رجسٹر بنوا کر رکھا۔ اس رجسٹر میں سال بہ سال میری آخری سروس تک اندراج ہوتا رہا۔ ان رجسٹروں کے اندر اتنا مواد موجود تھا کہ جس کا استعمال نہ صرف تحقیقی مکالوں کے مواد کے لئے استعمال ہوتا رہا بلکہ ایک موقع پر یہ قانونی ثبوت کے طور پر عدالت میں بھی پیش ہوا اور اسکی سند کو جج صاحبان نے بھی قبول کیا۔

آرتھوپیڈک اور نیوروسرجری پریکٹس کرنے کی وجہ سے میری ساکھ عوام میں تیزی سے بڑھی۔ چونکہ ہسپتال اور وارڈ میں حالات موافق نہیں تھے نتیجتاً فائدہ پرائیوٹ پریکٹس میں اضافے کی صورت میں ملا۔ شعبہ آرتھوپیڈک نہ ہونے کی وجہ سے ڈاکٹر سید سلطان اور میں مختلف نوع کے ہڈی، جوڑ اور پٹھہ کے آپریشن کرتے رہے۔ ایبٹ آباد کی تاریخ میں کولہے کے نئے جوڑ ڈالنے(Partial Hip Joint Replacement) کے پہلے تین آپریشن میں نے کئے۔ بعد میں ڈاکٹر نذیر احمد کی آمد پر آرتھوپیڈک ان کے حوالے کی۔ پروفیسر سید سلطان اپنے آخری دور میں ایک بہت مقبول اور فعال ہسپتال ایڈمنسٹریٹر کے طور پر خدمات سرانجام دیتے رہے۔ 2000ء میں انکی ریٹائرمنٹ کے بعد میں شعبہ سرجری کا سربراہ بنا اور اپنی ریٹائرمنٹ تک رہا۔ اس دوران لیپروسکوپک سرجری شفاء ہسپتال کے سرجن محمد صدیق کے تعاون سے شروع کی۔ بنکاک سے بھی فنی مہارت حاصل کی اور آغا خان کی ٹیم کے ہمراہ CMH ایبٹ آباد میں منعقد ایک Hand On Training کورس منعقد ہوا۔ سرجری کے تقریباً تمام رفقاء اور گائنی کے ڈاکٹروں کو ٹریننگ دی۔ لیپروسکوپک جزوی جگر کی سرجری (Hepatectomy) اور ہینڈ پورٹ کے ذریعے بڑی آنت کے آپریشن (Colectomy) جیسے بڑے اور نادر پروسیجرز بھی کئے۔

8 اکتوبر 2005ء کو زلزلہ آیا جس میں میں نے بحثیت سربراہ سرجری کے حوالے سے بہت وسیع پیمانے پر کیسز کو ہینڈل کئے۔ کئی دن تک مریض ہسپتال میں بطور ایمرجنسی آتے رہے۔ ایک مریض آیا جس کے پیٹ کے آر پار ایک بہت بڑا اینگل گزر گیا تھا کو اس طرح اٹھا کر لایا گیا جیسے کہ ایک

بڑے جانور کو روسٹ کرنے کے لئے لوہا گھسادیا ہوتا ہے کی طرح تھی Operation Theater کے دروازے سے اندر نہیں جا سکتا تھا لہذا ہم نے اس وقت ویلڈر منگوائے۔ اسکے بدن کے دونوں طرف سے لوہے کو کاٹ لیا مریض بظاہر ٹھیک لگتا تھا۔ آپریشن تھیٹر لائے لہذا میں نے جب اسکا پیٹ کھولا تو خطرہ تھا کہ شدید خون کے ضائع ھونے کی وجہ سے وہ بچ نہ سکے۔ 10 - 8 یونٹ خون کا بندوبست بھی کیا گیا تھا۔ حیرت ہوئی جب ہم نے آہستہ آہستہ سریا نکال لیا تو اس سے بہت کم خون بہا اور اس کے کسی بڑے اور اہم اندرونی اعضاء کو نقصان نہیں پہنچا تھا۔ مریض آہستہ آہستہ ٹھیک ہوا۔ اس وقت ہم نے فوٹو لئے اور غالباً اخبارات وغیرہ میں شائع بھی ہوئے۔ جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے۔ یہ مریض صوابی کا رہنے والا تھا اور کسی زلزلہ زدگان کی مدد کے لئے ٹرک میں سامان پہنچانے جا رہا تھا۔ چند سال پہلے وہ بالکل صحت مند مجھ سے ملنے آیا۔ اس طرح کی شدت کے سینکڑوں مریضوں کا علاج کیا گیا۔

باب نمبر 8

پرائیویٹ پریکٹس

چونکہ پاکستان میں اداراجاتی پرائیویٹ پریکٹس بالعموم موجودہ دور تک نہیں تھی اس لئے سرجن صاحبان کی اکثریت ذاتی پرائیویٹ کلینک اورکم تر اجتماعی پرائیویٹ پریکٹس کرنے کے عادی تھے۔ یہ کام سرکاری ہسپتالوں میں ڈیوٹی ختم کرنے کے بعد سہ پہر سے شروع ہوکر رات گئے تک جاری رہتا ہے۔ اور کئی کیسز میں دوران ڈیوٹی بھی چلتا رہتا ہے۔عوام الناس میں نفسیاتی طور پر ڈاکٹروں کی خصوصی توجہ حاصل کرنے کی بناء پر بہت مقبول ہے۔ باور یہ کیا جاتا ہے کہ پرائیویٹ کلینکس یا عام سطح کی ہسپتالوں میں سرکاری اعلٰی سطح کی ہسپتالوں سے بھی بہتر علاج ملے گا۔ عمومی طور پر یہ بات درست نہیں کہی جاسکتی۔ میرے دور پریکٹس اور موجودہ دور تک سرکاری ڈاکٹر جو پرائیویٹ کلینک کرتے ہیں اپنے زیادہ تر مریضوں کو سرکاری ہسپتال کے وارڈوں یا پرائیویٹ کمروں میں داخل کرکے سرکاری سہولیات کے ذریعے نمٹاتے رہتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اعلٰی معیار کے پرائیویٹ ہسپتال پاکستان بننے کے بعد شروع کی دہائیوں میں تو تھے ہی نہیں۔ موجودہ کچھ عرصے سے چند شہروں میں قائم ہوئے ہیں جہاں پر صاحب استطاعت اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ موجودہ دور کے سرکاری ہسپتالوں کی انتظامی حثیت اور صحت کارڈ کی ترویج نے سین کو کچھ حد تک تبدیل کیا ہے۔ فی الحال عوام الناس کی صحت سے متعلق نتائج کا جائزہ لینا قبل از وقت ہے لیکن دیگر درآمد شدہ نظاموں کی طرح شاید یہ بھی خاطر خواہ مفید نہ ہو پائے۔ درج ذیل میری پرائیویٹ پریکٹس میرے محدود دائرہ کار اور رویہ کی عکاس ہے جو ہوسکتا ہے کہ بڑے نقشہ (کینوس) کو ظاہر نہ کرسکے۔

میرا پہلا پرائیویٹ کلینک آسامائی گیٹ پشاور:۔

13 دسمبر 1979ء کو پاکستان واپس آنے کے اگلے ہی دن مجھے سینئر رجسٹرار لیڈی ریڈنگ

ہسپتال سرجیکل بی وارڈ میں ڈاکٹر پروفیسر مکرم خان کی نگرانی میں سینئر رجسٹرار لگا دیا گیا۔ ڈاکٹر مکرم خان مجھ پر اتنے مہربان ہو گئے کہ انہوں نے مجھے شروع سے ہی پرائیویٹ پریکٹس کی ترغیب دی اور یوں میں نے اپنا پہلا کلینک بیرون آسامائی گیٹ، پشاور میں میرے ایک مربی حاجی اختر ضمیر کے خالی اپارٹمنٹ میں شروع کر دیا۔ کلینک میں مریضوں کے لیئے صوفہ سیٹ مہیا تھے (جو پہلے سے ہی وہاں موجود تھے) میرے ایک عزیز دوست مقصود نے ایک ایئر کنڈیشن اپنی ورکشاپ سے لا کر فٹ کر دیا۔ اور یوں پشاور کے کلینکس میں یہ ایک منفرد بات ہو گئی۔ علاوہ ازیں مجھے جلد ہی ایک بہت محنتی مخلص اور دلچسپی رکھنے والی میڈیکل اسسٹنٹ مس نازگل مل گئی جس کی وجہ سے مریضوں کو خوش آمدید کہنے، بنیادی معلومات حاصل کرنے، بلڈ پریشر و دیگر بنیادی چیک اپ کرنے کی سہولت میسر ہو گئی۔ مزید یہ کہ چھوٹے موٹے میڈیکل پروسیجرز مثلاً مرہم پٹی و نسخے پر لکھی ادویات مریضوں کو سمجھانا بھی ان کا کام تھا۔ یہ سہولیات دیگر کلینکوں سے مختلف تھیں جس کی وجہ سے جلد ہی میرا کلینک بہت مصروف ہو گیا۔

پہلے دن صرف ایک مریض دیکھا۔ وہ ایک درمیانی عمر کا آدمی تھا جسکے جسم میں درد ہو رہا تھا۔ پیشہ ورانہ معائنہ اور ضروری تسلی کر لینے کے بعد میں نے اسے صرف معمولی درد سمجھا اور Panadol کی گولیوں کا پلتہ لکھ دیا۔ کلینک ختم کرنے کے بعد جب باہر سڑک پر اترا تو میرا یہ واحد نسخہ کٹا پھٹا زمین پر پڑا میرا منہ چڑا رہا تھا۔ ابھی حیران دیکھ ہی رہا تھا کہ قریب کھڑے کلینکل لیبارٹری کے ٹیکنیشن نے کہا ڈاکٹر صاحب پچیس روپے فیس لے کر اگر ایک روپے کی دوائی لکھو گے تو نسخے کا یہی حشر ہو گا اور یوں میری تربیت شروع ہو گئی۔

یہ کلینک مارچ 1981ء میرے ایبٹ آباد منتقل ہونے تک جاری رہا جبکہ اس کے بعد بھی مریض میرے پاس ایبٹ آباد علاج کے لیئے آتے رہے۔ پرائیویٹ مریضوں کے حوالے سے اس کلینک کا تجربہ انتہائی نادر اور کارآمد ثابت ہوا۔ تفصیلات کسی دیگر موقع کے لیئے چھوڑ دیتا ہوں۔

کلینک بحثیت اسسٹنٹ وایسوسی ایٹ پروفیسر۔ کیہال۔ایبٹ آباد:۔

ایک سیانے کی تحریک پر ایبٹ آباد میں پہلے دن سے ہی رہائش ڈھونڈنے کی بجائے کلینک کی تلاش شروع کردی۔ایک جاننے والے کی وساطت سے DHQ ہسپتال،کیہال کے باہر شاہ جی کیمسٹ کے اشتیاق حسین شاہ صاحب سے ملاقات ہوئی۔اُس رات سخت بارش ہورہی تھی۔ہم ایک خالی ہونے والی کلینک کے مالک کو ملنے ہریپور کے قریب تربیلا ڈیم کالونی روانہ ہوگئے اور یوں کلینک کے لیئے جگہ حاصل کرلی۔ کیہال ایبٹ آباد میں واقع یہ کلینک تین گیراجوں پر مشتمل تھا جہاں ڈاکٹر رونق زمان (چیسٹ سپیشلسٹ) پریکٹس کرتے تھے۔مشکل بات یہ تھی کہ اس جگہ کی ہیئت بالکل عامیانہ تھی اور اسکو ایک اچھے اقدار والا کلینک بنانا تھا۔میرے ایک عزیز دوست عبدالواجد (جس کے پاس کاریگری کے بہت سے اوزار تھے) واُن کے ایک دوست لالا ایوب (جن کے والد کی ایبٹ آباد بازار میں کیمسٹ کی دُکان ہوتی تھی) نے مل کر میرے کلینک کے برآمدہ کے باہر رنگین وجازب نظر چادریں جڑھ دیں اور یوں دیدہ زیبی کے علاوہ مریضوں کیلیئے ایک اچھی انتظارگاہ بھی بن گئی۔جس کی میں نے اچھی فرنشنگ بھی کی۔ یہ کلینک خوب کامیاب ہوااوراس کی ایک وجہ اس کی شکل وصورت بھی تھی۔علاوہ ازیں ڈاکٹر تاج تنولی جو ہزارہ بھر میں میڈیکل سروس کے سلسلے میں رہے تھے کی تحریک پر میں نے اُن کے ہمراہ تمام ہزارہ کی سیر کی اور لاتعداد پرمیڈیکل پیٹیشنرز سے مراسم بھی قائم کیئے جو میرے لئے مریض بھیجنے کا زریعہ بنے۔شروع میں ڈاکٹر ممتاز سینئیر رجسٹرار سرجری (موجودہ پروفیسر پشاور) نے بھی کچھ عرصہ میرے ہمراہ یہاں پریکٹس کی۔ کیمسٹ شاہ صاحب میرے لئے مریضوں میں مقبولیت کا باعث تھے پس مریض دنوں میں اُمڈ آئے۔انکو بہتر طریقے سے سنبھالنا میرا کام تھا جو میں نے کیا۔چھوٹے موٹے آپریشن بمع ختنوں کے میرے لئے مقبولیت ومالی معاونت کا باعث بنے۔ہسپتال میں داخلے کی سہولت نہ ہونے کی وجہ سے ایک مقامی معیاری پرائیوٹ ہسپتال جو ایک فلسطینی سرجن نے مانسہرہ روڈ (واقع موجودہ پرل کانٹینینٹل ہوٹل

(PC) میں قائم کیا تھا اوران کے ملک سے جانے کے بعد ڈاکٹر قاضی بشیر صاحب نے یہ ہسپتال جاری رکھا۔ میں پرائیویٹ سرجری صرف وہاں ہی کرسکتا تھا کیونکہ شروع ایک سال میں ہسپتال کا سرجن نہ تھا۔ ایک ماہ ایسا بھی آیا کہ میں نے وہاں 28 آپریشن بھی کئے۔ اپنے کلینک میں چائنیز فن مہارت پر مبنی طریقہ علاج ایکوپنکچر بھی کیا کرتا تھا۔ سالوں بعد ڈاکٹر پروفیسر مقداد ماہر کارڈیالوجیسٹ نے مجھے یاد دلوایا کہ جب وہ ایوب میڈیکل کالج میں MBBS کے شروع کے سالوں میں طالب علم تھے، علاج کے سلسلے میں میرے پاس آئے اور کمر کے درد کے لئے ایکوپنکچر کروایا۔ میری معاینہ فیس اس وقت بھی -/25 روپے ہوا کرتی تھی۔ اور کئی بار مریضوں کی مالی حالات کی وجہ سے فیس معاف کرنا پڑتی یا آدھی لی جاتی تھی۔ میرا یہ رویہ چند سینئر رفقاء کو نہ بھاتا تھا۔ ایک موقع پر مجھے یہ بھی کہا گیا کہ میں واپس پشاور چلا جاؤں۔ اس دوران نیوروسرجری کی تربیت حاصل کرنے کا ایک موقع 1982ء میں آیا جسکے بعد حالات میرے لیئے سہل ہوتے چلے گئے۔

اسکے بعد مین بازار میں پروفیسر ایوب صابر صاحب کا مکان کرایہ پر لے کر کئی سال وہاں پریکٹس کی۔ اسی جگہ میری ترویج پر ڈاکٹر عبدالسلام ڈینٹل سرجن (موجودہ ریٹائرڈ پرنسپل خیبر ڈینٹل کالج پشاور اور وی سی گندھارا یونیورسٹی پشاور) نے بھی کلینک قائم کیا۔ ایوب صابر ایک مشہور پروفیسر و علامہ اقبال کے کلام پر تشریح کے مصنف بھی رہے ہیں۔ اسکے بعد مزید دو کلینک ارد گرد کے مکانات میں کئے۔ ان میں سے ایک جگہ میں کچھ عرصے تک ڈاکٹر ناصر سعید (موجودہ پروفیسر و آئی سرجن رحمان میڈیکل انسٹیٹوٹ اور ڈائریکٹر PICO) نے بھی کچھ عرصہ پریکٹس کی۔ اس دور کی پریکٹس میں میرے اسسٹنٹ اور معاون مولانا صوفی ظفر اقبال جو" در جوانی توبہ کردن شیوہ پیغمبری است" کے مصداق تھے نے میرے کلینک کے انتظامی و معالی امور کو احسن طریقے سے سنبھالے رکھا ورنہ میری لا ابالی پن اور حلیم طبعی نے کلینک کو مفلس ہی رکھنا تھا۔

کلینک بحثیت پروفیسر۔اعوان پلازہ،منڈیاں،ایبٹ آباد:۔

1996ء کے بعد اعوان پلازہ منڈیاں میں کلینک کرتا رہا۔ یہ کلینک با قاعدہ ہیلتھ کیئر کمیشن کے مطابق بنا ہوا تھا اور اس میں چھوٹے پیمانے کی سرجری کی سہولیات بھی تھی۔ پرائیوٹ کلینک چلانے کے رازوں میں ایک راز یہ بھی ہے کہ آپ خطرات سے پُر اور ہیروانہ کام نہ سرانجام دیں۔ کلینک میں مریض کی پیچیدگی یا مرجانے کا خمیازہ بھگتنا بہت شدید ہوتا ہے۔

کلینک ڈبگری پشاور:۔

2008-09ء میں KIMS کوہاٹ کی خدمات انجام دیتے ہوئے شام کو پشاور ڈبگری میں اپنے بھائی ڈاکٹر مفتی کی ایماء پر سرجری کلینک شروع کیا۔ ڈبگری کا مزاج کچھ اور ہی تھا جلد ہی مختلف لوگوں نے رابطہ شروع کیا جن میں اکثر قریب ترین کیمسٹ تھے۔ ان کا طریقہ کار یہ تھا کہ مریضوں کو وہ بھجوائینگے۔ فیس وہ جمع کریں گیں۔ اپنی کمیشن بھی لے لیں گے وغیرہ وغیرہ۔ یہ کام میرے لئے قابل قبول نہ تھا لہذا میں اُن میں مقبول نہ ہوا۔ اس کے باوجود کلینک چل نکلا اور ہفتے میں دو چار آپریشن کے کیسز بھی ملنے لگے۔ ڈبگری میں کئی پرائیوٹ کلینک و ہسپتال گھروں میں بنے ہوئے تھے۔ چند ایک با مقصد اور پلاننگ کے ساتھ ہسپتال بھی تھے۔ اکثر غیر محفوظ حالات میں جراحی کی جاتی تھی اسے دیکھ کر میں بہت ڈرا۔ ایک خصوصی ہسپتال میں جہاں سہولیات با مقصد اور بظاہر معیاری تھی میں نے کئی آپریشن کئے۔ مریض کی سرجری کے بعد پیچیدگیوں کو نمٹانا مشکل ہوتا ہے اور ان حالات میں مریضوں کو سرکاری ہسپتالوں میں مخصوص طریقہ کار کے ذریعے سے شفٹ کر دیا جاتا تھا۔ ڈبگری میں نے ایک سال پریکٹس کی اور مارکیٹ کا بھرپور تجربہ حاصل کیا جو وہاں کی شہرت کے متناسب کہا جاسکتا ہے۔

پرائیویٹ پریکٹس بطور سربراہ شعبہ سرجری۔ رحمان میڈیکل انسٹیٹیوٹ (RMI) پشاور:۔

یکم اپریل 2009ء سے لیکر تقریباً پانچ سال تک میں RMI ہسپتال میں سربراہ شعبہ سرجری رہا اور بیشمار مریضوں کے آپریشن کیئے۔ مجھے خوشی ہوئی کی یہاں مریضوں کی دیکھ بال کا معیار بہت اچھا تھا۔ آپریشن تھیٹر بڑے محفوظ و کوالیفائیڈ عملے اور انتظامیہ کی وجہ سے بہت کم غلطی کے مرتکب ہوتے۔ پر اثر ماحول کی وجہ سے مریض اور اس کے لواحقین سرجن کو غیر ضروری پریشان نہ کر سکتے تھے۔ شروع سے ہی میں نے محسوس کیا کہ ہر سرجن اپنے شعبے تک محدود رہ کر کام کر رہا ہے۔ ٹیم ورک شروع میں نہ ہونے کے برابر تھا لہذا چند ہفتے اس بات کا اعتماد حاصل کرنے میں گزر گئے کہ ہم سب بطور ٹیم کام کریں اور انفرادی کیسز ہونے کے باوجود مشکل سرجری کے آپریشنوں میں ایک دوسرے کی مدد کریں۔ نیز وارڈ کیسز ہفتے میں ایک بار اکھٹے مل کر زیر بحث لائے جائیں۔ جلد ہی ماحول خوشگوار ہوگیا۔ سرجن ڈاکٹر جمیل احمد سے ہم آہنگی ہوگئی۔ ڈاکٹر زبیر احمد (موجودہ پروفیسر) اور ڈاکٹر ابرار کو میں نے خصوصی طور پہ شامل تربیت رکھا۔ دونوں اپنے لیول کے اچھے سرجن بنے۔ ہم سب بروز جمعہ صبح ٹریننگ میڈیکل آفیسرز کی تربیتی نشست بھی کرتے۔ RMI میں چونکہ کوائف درج ہوتے ہیں لہذا ذرائع آمدن چھپائے نہیں جاسکتے۔ تمام پرائیویٹ پریکٹس کے معاوضات تحریری ہوتے ہیں اور یوں آمدن اور ٹیکس کے معاملات قانون کے مطابق طے ہوجاتے ہیں۔ میں نے سرجری کی پریکٹس 2013ء کل وقتی کام کی بنیاد پر بطور پرنسپل رحمان میڈیکل کالج کے حق میں چیئرمین آر ایم آئی پروفیسر ڈاکٹر رحمان صاحب کے مشورے سے چھوڑ دی۔ سرجری چھوڑنا ایک انتہائی مشکل مرحلہ تھا۔ آج دس سال گزرنے کے باوجود بھی ہاتھوں میں کھجلی محسوس ہوتی ہے۔ مگر راتیں گھر میں سکون سے گزرتی ہیں۔

باب نمبر 9

شعبہ سرجری کے متعلق یاداشتیں و میڈیکل غلطیاں (Medical Error)

☆ مجھے بچپن میں کسی چھوٹے موٹے آپریشن کے سلسلے میں لیڈی ریڈنگ ہسپتال کے آپریشن تھیٹر لے جایا گیا منہ پر ماسک رکھا گیا اور ماسک رکھنے کے بعد کچھ دیر ڈرم بیٹ کی آواز آتی رہی اور پھر میں بیہوش ہوگیا ۔ یہ آپریشن جنرل کیڈر کے ڈاکٹر عبد الخالق نے کیا بعد میں یہی ڈاکٹر صوبہ سرحد (موجودہ خیبر پختونخوا کے سیکریٹری ہیلتھ بن کر ریٹائرڈ ہوئے)۔

☆ میں والدہ کے ساتھ ڈاکٹر ظریف اور کرنزئی، ڈینٹل سپیشلسٹ لیڈی ریڈنگ ہسپتال اُن کے دانتوں کے پروسیجر کروانے جاتا تھا اُن کی تکلیف کا مجھے کوئی جذباتی احساس نہیں ہوتا تھا البتہ جب میرے اپنے دودھ والے دانت ہلے جلے تو انہی ڈاکٹر ظریف اور کرنزئی صاحب نے جب میرا دانت نکالا تو مجھے احساس ہوا کہ دانت نکالنے سے درد بھی ہوتا ہے۔

☆ .F.Sc کا امتحان دیا میڈیکل کالج جانے کا شوق تھا۔ میرے بھائی گل آغا کے ایک ساتھی سکندر پورہ میں ڈینٹل کلینک کرتے تھے شاید ٹیکنالوجسٹ ہونگے ۔ میرے شوق کو دیکھ کر بھائی نے کہا کہ اسکے ساتھ اسسٹنس کرنا شروع کردو۔ پہلا دن تھا ڈاکٹر صاحب نے مجھے ہاتھ میں ٹرے پکڑا کر ایک 60 سالہ مریض کا منہ کھلوایا۔ میں نے دیکھا گندے دانت، مسوڑھے کالے اور کچھ دانت تھے بھی نہیں ۔ اس دوران میرے ٹرے میں رکھا ایک انجکشن ڈاکٹر صاحب نے مریض کے مسوڑھوں میں لگایا ۔ کالے مسوڑھے سفید ہونے لگے اور اسکے بعد غالباً میرا رنگ بھی سفید ہونے لگا۔ اگلے لمحے مجھے ہوش آیا تو دیکھا کہ مریض اور ڈاکٹر میرے اوپر جھکے ہوئے ہیں اور مجھے ہوش میں لانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ کہہ رہے تھے کہ میں ٹھیک ہو رہا ہوں ۔ انہوں نے مجھے بٹھایا ۔ پانی پلایا اور اسی وقت میرے بھائی کو بلا کر مجھے یہ کہہ کر اس کے حوالے کر دیا کہ یہ بندہ ڈاکٹر بننے کے قابل نہیں ۔ (بہت بعد مجھے احساس ہوا کہ یہ

ویزو ویگل بے ہوشی (vasovagal syncope) تھی جو ایک عام واقعہ ہوتا ہے۔ بہت سارے لوگوں کو اعصابی تناؤ کی وجہ سے اچانک بیہوشی (غشی) ہو جاتی ہے اور گرنے پر ٹھیک ہو جاتی ہے)۔

☆3rd Year MBBS میں تھا تو لیڈی ریڈنگ ہسپتال پشاور میں میری خالہ جانی کا معدے کا آپریشن ہونا تھا بہت ہی نامور سرجن بیرون ملک سے آئے ہوئے تھے اور بڑے دعوے سے داخل کیا کہ ٹھیک ہو جائے گی۔ آپریشن کے دوران خون کی ضرورت پڑی میں نے بھی ایک بیگ عطیہ خون کیا۔ یہ میرا پہلا عطیہ تھا پھر انکی دیکھ بھال کی۔ مجھے محسوس ہوا کہ آپریشن تو ہو گیا لیکن انکی طبیعت ٹھیک نہیں ڈاکٹر صاحبان نے آکر کہا کہ سب کچھ ٹھیک ہے۔ پھر معلوم ہوا کہ غالباً گردے فیل ہوئے (ملٹی آرگن Failure ہوا) شاک میں گئیں اور فوت ہو گئیں۔ اپنی آنکھوں کے سامنے اچھے بھلے مریض کو جاتے ہوئے دیکھنا اور وہ بھی میری اپنی خالہ کو مرتے دیکھ کر میرے اعتماد کو شدید دھچکا لگا۔ بہت بعد میں جب میں خود سرجن بنا تو احساس ہوا کہ مریضہ کے جسم میں نمکیات و دیگر مواد اور پانی الٹیا کر کر کے زیروز بر ہو گئی تھیں جسکا مداوا کیئے بغیر آپریشن کر لیا گیا۔ پیچیدگی تو ہونی ہی تھی۔

☆4th Year MBBS میں میرے کالج کا ایک ساتھی (جو بعد میں سینئیر بیوروکریٹ بنے) کو گاؤں میں کسی تنازعے پر گولی لگی اور بہت خون بہا۔ ہمیں کہا گیا کہ انکو خون کی ضرورت ہے چونکہ میں اپنی خالہ کو خون کا عطیہ دے چکا تھا اور مجھے معلوم تھا کہ خون دینا اتنا مشکل کام نہیں میں نے ایک بوتل خون عطیہ کر دیا۔ بعدازاں کئی بار خون کا عطیہ دیا اور دوسروں کو بھی ترغیب دی۔

☆ ڈاکٹر ایس اے آر گردیزی جو بڑے مشہور سرجن تھے نے میری ایک نزدیکی رشتہ دار کے گلہڑ کا آپریشن کیا۔ جب وہ آپریشن تھیٹر سے باہر آنے کے بعد ہوش میں آئی تو بول نہیں سکتی تھی۔ گلے میں ایک Nerve کٹ گئی تھی۔ وہ زندگی بھر دھیمی آواز سے ہی بولتی رہیں۔ میرے ذہن میں یہ احساس پیدا ہوا کہ آپریشن خدشات اور مشکلات کے بغیر نہیں ہوتے۔ البتہ مریض کو پہلے سے آگاہی کروانے کی

ضرورت ہوتی ہے۔

☆ ہاؤس جاب کے دوران ایک قریبی عزیزہ کو اپینڈیکس کے آپریشن کے لئے داخل کیا گیا یہ پہلا موقع تھا کہ میں کسی قریبی رشتہ دار کو آپریشن تھیٹر لے گیا۔ اور حسب معمول تیار ہو کر سرجن کی معاونت کے لیئے پہنچ گیا۔ اس اثناء مجھے شدید anxiety ہوئی۔ میرے سینئیر رجسٹرار ڈاکٹر عبدالوکیل خان صاحب نے کہا کہ تم اسسٹنس چھوڑ دو اور آپریشن تھیٹر سے باہر چلے جاؤ۔ اب سمجھ آیا کہ اپنے قریبی رشتہ داروں کا آپریشن خود کیوں نہ کیا جائے اور نہ ہی اسکا حصہ بنیں۔

☆ ہاؤس جاب کے دوران ہی میرے قریبی رشتہ داروں میں ایک تنازعہ ہوا اور ایک رشتہ دار گولیوں کا برسٹ لگنے سے داخل ہوئے خون خاصا بہہ چکا تھا ایک دفعہ پھر جذباتی پہلو سامنے آیا۔ اس بار میں نے اپنے سینئیر پروفیسر ڈاکٹر مکرم خان کو فوراً رابطہ کیا اور مریض کو آپریشن تھیٹر لے گیا۔ اور مریض کی فوری علاج میں عملی مدد کی۔ مگر میں اس دفع جذباتی طور پر Stable رہا۔ شاہد حالات کی نزاکت کا نفسیاتی اثر تھا۔

☆ ہاؤس جاب کے دوران ہی ایک ڈاکٹر نواز صاحب جو ریڈیالوجی ڈیپارٹمنٹ میں تھے اور بطور شاگرد ہم انکی بہت عزت کرتے تھے وہ اپنے گاؤں کے قریب حفاظتی عملے کی فائرنگ میں زخمی ہو گئے۔ انکے جبڑے، دانت، منہ اور زبان میں بڑی شدید چوٹ آئی میں نے انکو سنبھالا اور اپنے سینئیر ڈاکٹر مکرم خان کو اطلاع کر دی وہ آئے رات کو دو تین سرجن غالباً تھے سب نے مل کر فرسٹ ایڈ سرجری کی۔ بعد میں ان کو راولپنڈی اور انگلینڈ منتقل کیا گیا۔ کچھ عرصہ معذوری رہی لیکن پھر تمام زندگی انہوں نے بطور ماہر ریڈیالوجی لیڈی ریڈنگ ہسپتال میں خدمات سرانجام دیں۔

☆ سرجیکل وارڈ میں اپینڈیکس کے مریض بہت آتے تھے ایک مرتبہ پانچ ساتھ اپینڈیکس کے آپریشن رات کو کیئے۔ دوسرے دن صبح وارڈ راؤنڈ کے دوران میں ہنس ہنس کے اپنے سینئیر ڈاکٹرز کو

بتا رہا تھا کہ کل اپنڈیکس سرجری کا دن تھا اچانک وہ ایک کیس پر کھڑے ہوئے اور مجھ سے پوچھے بغیر مریض سے کہنے لگے" بی بی آپکا آپریشن کل کریں گے" تو وہ کہنے لگی" میرا اپریشن تو رات کو ہی ہو گیا ہے۔ یہ سامنے (میری طرف اشارہ کرکے) ڈاکٹر صاحب کھڑے ہیں انہوں نے آپریشن بخوبی کیا اور میں بالکل ٹھیک ہوں" میرے پاس کچھ کہے بغیر آگے بڑھ گئے اور کچھ دیر بعد مجھے بلا کر کہا کہ اس کیس کا آپ نے کیا کیا۔ تو میں نے بتایا کہ میں نے اسکی Appendectomy کردی ہے۔ انہوں نے تعجب سے کہا کہ میں نے تو یہ مریض گردے کی پتھری کے علاج کیلئے داخل کیا تھا۔ بھلے آخر کار مریض ٹھیک ہو کر گھر چلا گیا۔ مجھے احساس جرم ہوا کہ یہ ایک Surgical Error ہو گیا ہے شکر خدا کا کے مریضہ کو زیادہ پیچیدگی کا سامنا نہ کرنا پڑا اور اُس کے گردے کی پتھری کا علاج بھی بعد میں خاطر خواہ طریقے سے ہو گیا۔ قارئین کی اطلاع کے لیئے بیان ہے کہ جان ہاپکنز کی ایک حالیہ تحقیق میں دعویٰ کیا گیا ہے کہ امریکہ میں ہر سال ڈھائی لاکھ سے زیادہ افراد طبی غلطیوں کی وجہ سے ہلاک ہو جاتے ہیں۔

☆ ایک کیس Multiple Fire Arm Injury کی وجہ سے آیا۔ پیٹ میں بہت سی جگہوں پر سوراخ تھے مریض سیریس تھا اور اسکو آپریشن تھیٹر کا بندوبست کر کے لے گئے جو ڈیوٹی وقت سرجن صاحب تھے انکو مطلع کرنا چاہا تو وہ نہ ملے اور آخر کار جب ملے تو انہوں نے کہا کہ میں تو بہت دور ہوں۔ مجھے کہا گیا کہ تم کیس شروع کردو میں آتا ہوں میں نے کیس شروع کیا سینئیر نہ آئے اور مریض کا پیٹ کھلا ہوا تھا تو میں نے آنتوں کے کئی سوراخ صاف کر کے ہلکے ہلکے ٹانکوں سے بند کیا اور اللہ کے آسرے پر کیس بند کر دیا۔ الحمد اللہ وہ آپریشن کامیاب ہو گیا اس طرح مجھے سمجھ آئی کہ بہت سارے کیسز ڈاکٹرز کی توجہ سے زیادہ اللہ تعالی کی مہربانی سے ٹھیک ہو جاتے ہیں۔

☆ میرے دوست حاجی یعقوب صاحب نے ایک جوان رشتہ دار کو پشاور سے ایبٹ آباد گائنی کے علاج کے لئے بھجوایا چونکہ یہ شعبہ میرا نہیں تھا۔ میں نے متعلقہ ڈاکٹر کو بھجوا دیا۔ آپریشن کامیاب ہو۔ وہ

ریکور ہوئی جس دن وہ ڈسچارج ہورہی تھی ڈسچارج سلپ بھی اُسے مل گئی اور میں اُسے اللہ حافظ کہ کر OPD پہنچا۔اچانک پیغام آیا کہ مریض کی حرکت قلب بند ہونے سے وفات ہوگئی ہے۔ مجھے بہت دکھ ہوااوراسکی وفات کی وجہ سمجھ نہیں آئی کہ کیا ہوا۔ ہمارے ہاں پوسٹ مارٹم نہیں ہوتا۔جس کی بناء پر مرنے کی وجہ سمجھ آسکتی ہے۔

☆ ایبٹ آباد جناح آباد 77 کے گھر میں فرید نامی مستری کام کیا کرتا تھا اُس کی نوجوان بیٹی اپینڈ یکس کے مرض میں مبتلا ہوگئی میں نے خوداسکا آپریشن کیا۔مکمل صحت یاب ہوئی۔جسکے بعد وہ بالکل ٹھیک طریقے سے چل پھر رہی تھی، پیٹ بھی ٹھیک تھااور کھانا پینا بھی شروع کیا3 - 2 دن کے بعد جب اسے ہم نے ڈسچارج کر دیاتواچانک اُس کی طبیعت خراب ہوئی اور گھنٹے آدھ میں وہ وفات پاگئی۔ وجہ معلوم نہ ہوسکی۔

☆ ایک آرتھوپیڈک مریض جس کے گھٹنے کے جوائنٹس کی ہڈیوں کی وجہ سے ٹانگ ٹیرھی تھی جسے جینوں والگس کہتے ہیں اس کو ٹھیک کرنے کے لئے آپریشن کرنا تھا۔ ہم نے ضروری ٹسٹ بھی کروائے۔آپریشن کے بعداُس کے گردے فیل ہوگئے۔ بڑی محنت کے بعداُس کی ریکوری ہوگئی۔ بعد میں سمجھ آیا کہ اُس کی وٹامن ڈی کی مقدار بدن میں کم تھی۔سبق یہ حاصل ہوا کہ ہم اُس کو پہلے وٹامن ڈی دیتے اورکم وٹامن ڈی کے ساتھ آپریشن نہ کرتے۔

☆ سلیم ہری پور کا جوگی گروپ کا ایک ممبر تھا ایک موٹرسائیکل کے ایکسڈنٹ میں دونوں ٹانگوں میں فریکچر ہوااورشدید زخم آئے۔ دونوں ٹانگیں تقریباً تھوڑی سی جلد کے ساتھ لٹکی ہوئی تھیں اورہڈیاں مکمل ٹوٹی ہوئی تھی۔آپریشن لسٹ پرڈالا ہوا تھا۔یہ کیس میرے لیئے چیلنج تھا میں نے ان سے اجازت نامہ لیا کہا یہ گیا تھا کہ لسٹ پہ Amputation یعنی دونوں ٹانگوں کو پرے کر دیا جائے گا۔اور یہ مریض اپنی ٹانگوں پر چل نہیں سکے گا۔لہذا بعد میں یہ مصنوعی ٹانگوں پہ چلے گا۔مریض ٹانگیں بچانے کی استدعا کررہا

تھا۔ میں نے رسک لے کر دونوں ٹانگوں پر ہڈیوں کے اوپر پلیٹ لگالی اور ٹانگیں جوڑیں زخم خاصے تھے۔ دوسرے دن صبح مجھے راؤنڈ کے دوران شدید تنقید کا سامنا کرنا پڑا۔ اور سینئیر اور جونئیر میرا مذاق اڑا رہے تھے۔ جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے۔ مریض مکمل طور پر شفاء یاب ہوگیا۔ سلیم بہت عرصے تک اپنے Profession گانے بجانے کے ساتھ رہا اور اچھی زندگی گزارنے کے بعد غالباً اپنی طبعی موت مرا۔

اِس طرح کے بے شمار کیسز ہمارے شعبہ میں باعثِ سبق ہوتے ہیں۔ ضروری امر یہ ہے کہ ہم موجودہ زمانے کی آگاہی و سہولیات کے مطابق ہر مریض کو اچھی طرح تیار کر کے آپریشن بہت توجہ سے کریں۔ مریض ولواحقین کو آپریشن کے متعلق ممکنہ پیچیدگیوں سے آگاہ رکھیں۔

اوپر دیے گئے واقعات سے ناظرین کے دل میں ابھارتو آنا ہی ہے، تاہم اطلاعاً عرض ہے کہ امریکہ جیسے ملک میں ہر سال بمطابق کتاب

To Err is Human:Building a Safer Health System

اٹھانویں ہزار اموات ہسپتالوں میں سسٹم کی خرابی کی وجہ سے ہوتی ہیں۔ اور مریضوں کی پیچیدگیوں کی تعداد اس سے کئی گنا زیادہ ہوتی ہے۔

باب نمبر 10

شعبہ تعلیم و تدریس

بطور استاد:۔

سینئر رجسٹرار، لیڈی ریڈنگ ہسپتال پشاور:

دسمبر 1979ء تا مارچ 1981ء تک میں بطور سینئر رجسٹرار سرجیکل بی وارڈ میں مامور رہا اگر چہ اس پوسٹ کے تقاضوں میں طلباء کی تربیت شامل نہ تھی مگر میری اندرونی جبلت کی تسلی ہونا بھی ضروری تھی۔ میں اکثر مغرب تک سال سوئم کے طلباء کو ایکسریز اور سرجری سے متعلق تدریس کرتا۔ اس زمانے کے طلباء ابھی بھی ملنے پر اس تربیت کو یاد کرواتے ہیں۔ آپریشن تھیٹر میں اپنے جونیئر رفقاء اور دیگر عملہ کی تربیت کرنا تو تھا ہی مگر میں نے بھی ان سے لوکل حالات کے مطابق چند آپریشنوں سے متعلقہ اہم گُر سیکھے اور یوں میری تربیت بھی خوب ہوئی۔

ایوب میڈیکل کالج، شعبہ سرجری:

مارچ 1981ء کو ایوب میڈیکل کالج میں شعبہ سرجری بطور اسسٹنٹ پروفیسر جوائن کیا تو معلوم ہوا کہ سرجری ہسپتال میں کرنے کے بجائے مجھے ایک سال تک اناٹومی کا سبجیکٹ کالج میں پڑھانا ہوگا۔ بادل ناخواستہ کرنا پڑا۔ میں نے خود سے اپنے مطلب کی اختراع کر کے فرسٹ ایڈ پڑھانا شروع کیا نیز ہر مضمون کو اس کی سرجیکل پریکٹس میں استعمال و افادیت سے ربط کر کے بتاتا۔ اور یوں طلباء میں مقبول ہوگیا۔ سال بعد ہسپتال کے شعبہ سرجری کو جوائن کیا۔ میرا طریقہ تعلیم طلباء میں اسی طرح سرجری کی پریکٹس کی بنیاد پر مبنی تھا اور طلباء کے لیئے یہ بات بڑی دلچسپ اور پسندیدہ تھی۔ 1995ء میں فائنل ایئر سرجری کے اندرونی امتحانات میں میں نے ایک خصوصی طریقہ امتحان OSCE کو متعارف کرایا جو میری

ریٹائرمنٹ تک جاری رہا۔ بعد میں یہ امتحان میڈیسن کے پروفیسر ڈاکٹر شمیم احمد نے بھی شروع کیا اور پھر کسی مرحلے میں یونیورسٹی نے اس کو سالانہ امتحانات میں بھی رائج کر دیا۔

میڈیکل تعلیم رائج طریقہ کار کے مطابق ہوتی تھی ۔جسمیں طلباء کو ذاتی سوچ ،فکر اور نئے انداز کو استعمال کرنے کی ترویج نہ تھی لیکن میں اپنے تعلیمی تجرباتی سفر کے نچوڑ میں سمجھتا ہوں کہ سیکھنے کے تین جز یعنی ''معلوماتی جز ،فنی جز اور اور اخلاقی پہلو'' ہیں۔ان میں ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم طلباء کو انکے سمجھ بوجھ کے مطابق شامل کار رکھ کر سکھائیں۔اور میں نے ان اصولوں کو ہر ممکن شامل تربیت رکھا۔

مثلاً معلوماتی جز (Knowledge) سکھانے کے لئے واقعات یا مثالیں سامنے رکھیں طالب علم کو ان کے مطالب سمجھائیں جنہیں وہ اپنے الفاظ میں بیان کریں۔اسی طرح فنی پہلو کو اگر ہم اصل میدان میں نہیں کروا سکے تو پھر ہمیں وہ فنی مہارت سکھانے کے دیگر طریقے یعنی Manikan کا استعمال یا آرٹیفشل مریض یعنی simulator کے اوپر فنی مہارت کروانی چاہئے یہ طریقہ کار آج کل بہت رائج ہے اور تمام شعبوں میں استعمال ہو رہا ہے طالب علم جب گریجویٹ ہو جائے تو فوراً ہی معاشرے میں قائم نظام کو اپنا لے اور یوں نہ ہو کہ اسکو ایک مرتبہ پھر شاگرد ہو کر سیکھنا پڑے۔تیسرا پہلو سوچ کا انداز اور برتاؤ فنی اور معلوماتی ایریا میں ہماری سوچ کا مثبت ہونا ہے،خوش دلی سے سیکھنا اس پہلو میں آتا ہے۔اس کے علاوہ جو لوگوں کے ساتھ رہ کر اکھٹا برتاؤ کرنا ہوتا ہے جیسے تعلیم حاصل کرتے وقت ٹیم ورک یا بعد میں کام کے دوران اپنے ساتھیوں سے برتاؤ بھی اس میں شامل ہے۔آخر میں ہمارے طریقہ امتحان جو پہلے زمانے میں صرف چند ایک اجزاء کو ممتحن جانچ کر ہمیں ڈگری دے دیتے تھے اب بدل گیا ہے اور اب ہم تقریباً ہر پہلو کا جائزہ لے کر اس کا امتحان لے کر اس کے مطابق ایک معیار قائم کرتے ہوئے طلباء کو کامیاب قرار دیتے ہیں۔یہ تب ہی ہوسکتا ہے کہ امتحان صرف ایک طریقے سے نہ لیا جائے جیسے آج کل MCQs' کو معلومات کو جانچنے کا واحد طریقہ بنایا گیا ہے بلکہ یہ مختلف طریقوں سے مختلف چیزوں سے ضرورت کے مطابق رائج کیا

جائے اور اسی ہی کے متعلق کالجوں اور یونیورسٹیوں میں قانون، ریگولیشن اور اصول مرتب کیئے جائیں۔

نرسنگ سٹاف کی تربیت:۔

انگلینڈ جا کر مجھے معلوم ہوا کہ نرسنگ شعبہ مغربی ترقی یافتہ ممالک میں انتہائی قدر سے دیکھا جاتا ہے۔ جب میں پاکستان واپس آیا تو میں نے یہ عہد کیا کہ نرسز کی کوچنگ کرونگا اور ان کی اہلیت کو اور ان کے شعبہ کی اہمیت کو بڑھاؤنگا۔ ایبٹ آباد DHQ ہسپتال کی نرسز کو میں نے باقاعدہ پڑھانا شروع کیا۔ساتھ ہی ساتھ ان کے عزم کو بھی ترویج دی۔ اپنے وارڈ کی نرسوں کی عملی تربیت میں معاونت کی۔ اگر چہ یہ کام زیادہ عرصے تک نہ چلا کیونکہ کچھ مخصوص عزائم رکھنے والے لوگوں کو یہ بات پسند نہ تھی۔ بہر حال ایک باعزت اور قابل قدر پروفیشن کے سانچے کی بنیاد ڈال دی۔ میرے وارڈ کی انچارج نرس ہمیشہ مجھے راونڈ کرواتی اور کیس کی معلومات ڈاکٹروں کی سطح پر پیش کرتی۔ ان میں بہت ساری سٹاف ترقی کے مدارج طے کرکے اونچے عہدوں میٹرن وغیرہ تک پہنچیں۔ چند ایک مزید تربیت حاصل کرکے نرسنگ سکول / پروگرام کی پرنسپل بھی رہیں۔

رحمان میڈیکل انسٹیٹیوٹ کے سکول آف نرسنگ کو دیکھ کر میں بہت متاثر ہوا۔ خصوصی طور پر ان کے کلینکل سکلز ایریا نے میرے دل میں رحمان میڈیکل کالج کا کلینکل سکلز سنٹر بنانے کی ترغیب ڈالی۔ مزید یہ کہ ایک ماڈل BHU کالج کے کمیونٹی میڈیکل سنٹر بنایا تو اس میں ملٹی پروفیشنل رول ادا کرنے تھے۔ ایک سٹیشن نرسنگ کا بھی تھا۔

پیرامیڈیکل سٹاف کی تربیت:۔

پاکستانی پرائیویٹ پریکٹس میں دیہاتی علاقوں میں پیرامیڈیکل بطور QUACK ہمیشہ سے کام کرتے رہے ہیں اور آج بھی کرتے ہیں اگرچہ یہ بات میڈیکل یعنی پریکٹس کی اقدار کے خلاف ہے لہذا میں نے یہ سوچا کہ اگر یہ طبقہ اپنے حدود میں رہ کر کام کرے تو عوامی سطح پہ طبی فوائد ہونگے بشرط یہ کہ انکو

یہ مواقع دیجائیں کہ وہ اپنی دسترس سے زیادہ پیچیدہ مریضوں کو کوالیفائیڈ ڈاکٹر یا سپیشلٹ کو بھجوادے۔

نو ماہ کے ڈیسپنسر (Dispenser) کورس کے دوران میں انکو وہ تمام بیماریوں اور علاج کے متعلق خاطر خواہ تربیت دیتا رہا جن کے علاوہ دیگر کیسز کو وہ اپنے پاس نہ روکیں۔ یہ ماڈل بعد میں چائنہ ننگے پاؤں ڈاکٹر (Bare Foot Doctor) کے طور پر سامنے آیا۔ میرے کچھ ساتھیوں نے مجھے اس بات پہ برا بھلا بھی کہا مگر میں آج بھی یہ سمجھتا ہوں کہ محدود حدود میں رہ کر Clinical Technician دور دراز علاقوں کو طبی سہولیات میسر کی جا سکتی ہیں۔

1989ء سے آج تک (2023ء) تقریباً چونتیس سال تک بطور ممتحن MBBS امتحانات رہا۔ اور طلبہ کے معیار کو جانچنے کے دلچسپ تجربہ سے گزرا۔ لبِ لباب یہ ہے کہ سال کے آخر میں طلبہ کو چند منٹ ممتحن کے ذاتی نظریہ مربنی امتحان سے گزرنے کے بعد کسی بھی شخص کو ڈاکٹر کا رتبہ دینا معقولیات سے باہر ہے۔ چاہیئے تو یہ کہ ہر مرحلے تربیت پر طالب علم کو امتحان سے گزارا جائے اور یوں کل امتحان کا بڑا حصہ اس مسلسل جائیزے کی بنیاد پر ہو۔ موجودہ ماڈیولر سسٹم کے امتحانات میں اس بات کا ازالہ کرنے کی کوشش کی جارئی ہے۔

پوسٹ گریجویٹ خدمات برائے کالج آف فزیشنز اینڈ سرجنز آف پاکستان (CPSP):۔

1992ء سے میں اور پروفیسر عبدالکریم سعید CPSP کے ساتھ بہت فعال طریقے سے شامل ہوگئے ۔ FCPS Part - I کے ممتحن کے علاوہ ڈیپارٹمنٹ آف میڈیکل ایجوکیشن کی ورکشاپ میں باقاعدگی سے شرکت اور پھر FCPS-II کے امتحانات کے ممتحن۔ میری بہت اعلٰی ممتحن صاحبان سے ملاقات ہوئی جن سے بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا ان میں چند ایک ڈاکٹر فاصل صدیق، ڈاکٹر ظفر اللہ چوہدری، ڈاکٹر عالم خان پیتھالوجسٹ، ڈاکٹر طفیل اور سرجن ڈاکٹر سکندر تھے مختلف لوگوں سے مل کر ان کے نظریات سے سیکھنے کا موقع ملا۔ Written پیپر مضمونی قسم کا ہوتا تھا جس کے لئے ہمیں امتحانی مراکز میں انکے نظریاتی پوائنٹ پر نمبر دیئے جاتے۔ CPSP میں شروع دن سے معیاری امتحان لیا جاتا

ہے اور اس میں دن بدن مزید بہتری کرتا رہتا ہے۔ یہ کہنا بجا ہوگا کہ میرا موجودہ مقام خاصی حد تک CPSP کے ساتھ کام کرنے اور سیکھنے کی وجہ سے ہے۔ میرے زمانے میں برکی صاحب رحلت فرما چکے تھے CPSP میں سیاسی تناؤ تو موجود تھا مگر کام کے معاملے میں کوئی سیاست نہیں تھی اور سب کچھ خوش اسلوبی سے سرانجام پا رہے تھے۔

میں CPSP کا چار سال تک سرجری کا DEAN بھی رہا جو09 - 2004 تک تھا اس دوران ہم نے ورچوئل لاگ بنائے اور کلینیکل سکلز سنٹر میں میڈیکل بیسڈ ٹریننگ پر بھی کام ہوا۔ ان سب کاموں میں جو میرے رفقاء میرے ساتھ کھڑے رہے اُن کا میں بے حد مشکور ہوں۔

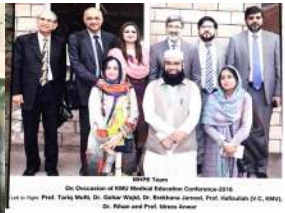

FCPS (Edin) 1979


FCPS (Pak) 2001


MHPE (KMU) 2016













Earthquake 2005















With Students of KIMS Kohat 2008

RMC
REHMAN
MEDICAL COLLEGE

Rehman Medical College 1st Convocation 2017



1st Row: Prof. Dr. Syed Shahkar Ahmad Shah, Prof. Dr. Rashid Iqbal, Prof. Dr. Abdul Jalil Popalzai, Prof. Dr. Abdul Samad, Prof. Dr. Hafiz Ullah (Vice Chancellor Kmu) Engr. Iqbal Zafar Jhagra (Governer KP & Chancellor), Prof. Dr. Tariq Saeed Mufti (Principal), Dr. Saleem Gandapur (Registrar), Prof. Dr. Saeeda Majeed, Prof. Dr. Jamil ur Rehman (Vice Principal), Prof. Abdul Ghafoor, Prof. Dr. Muhammad Azam Khan

2nd Row: Dr. Shahzada Bakhtyar Zahid, Prof. Dr. Jamil Ahmad, Prof. Dr. Ashraf Qamar, Prof. Dr. Fazal-e-Raziq, Prof. Dr. Fazal Ahmad, Prof. Dr. Mian Mujahid Shah, Prof. Dr. Muhammad Shafique, Prof. Dr. Nargis Parveen, Prof. Dr. Rashid Mehmood, Prof. Dr. Muhammad Aslam Qamar, Dr. Iftikhar Qayum, Dr. Humera Khan



































باب نمبر 11

بطور منتظم صحت تعلیم وشعبہ تدریس

اگر چہ انتظامی امور ہمارے شعبہ کے مختلف مدارج میں ایک غیر محسوس طریقہ سے اور وقت کے ساتھ ساتھ خود بخود ودعیت ہوجاتے ہیں مگر سینئیر آسامیوں کے لیئے یہ کافی نہیں ہوتا۔ چونکہ ان امور کی باقاعدہ تربیت نہیں دی جاتی لہذا وقت آنے پر پرانے تجربات اور اپنے ذہن کے مطابق ان کو اکثر لوگ استعمال کرتے ہیں۔ میرے ساتھ بھی کچھ یوں ہی ہوا اور کئی مواقع پر باقاعدہ تربیت کی کمی شدت سے محسوس ہوئی نیز ایک خاص انتظامی سوچ کی ضرورت کا احساس بھی ہوا۔

بطور چیف ایگزیکٹیو۔ایوب میڈیکل کالج:۔

1999ء میں میڈیکل کالج وہسپتال منیجمنٹ کمیٹی آرڈیننس بنا اور ایوب میڈیکل کالج وہسپتال کو بھی اس میں ضم کر دیا گیا۔صوبہ میں 4 منیجمنٹ کمیٹیاں ''لیڈی ریڈنگ، پشاور، خیبر ٹیچنگ، حیات آباد کمپلیکس پشاور اور ایوب ٹیچنگ کمپلیکس ایبٹ آباد'' بنائی گئیں۔2000ء کے اوائل میں آرمی کے ایک آفیسر ایوب میڈیکل کالج میں سروے کرنے آئے، سئنیر اساتذہ سے ملاقات کر کے چلے گئے۔ کچھ دن بعد ضلع کے سینئیر افسران یعنی کمشنر وغیرہ کی ترغیب پر مجھے بھی ایک فارم پر کرنے کو کہا گیا۔ فارم بھی انہوں نے وصول کروایا۔ 2000ء کے اوائل میں جبکہ میں فائنل ائیر MBBS کی سرجری کا امتحان خیبر ٹیچنگ ہسپتال، پشاور میں لے رہا تھا تو میرے فون پر میسج آیا کہ میں ہیلتھ ڈیپارٹمنٹ بورڈ روم پہنچوں۔ وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ چیف ایگزیکٹیو کے لئے انٹرویو ہو رہے ہیں۔ میں غالباً آخری بندہ تھا۔وزیر صحت ڈاکٹر سردار شاہین کی صدارات میں چیف سیکرٹیری اعجاز احمد قریشی کے علاوہ متعدد دیگر سرکاری زعماء بیٹھے تھے۔ سوالات، جوابات اور وضاحتوں (Questions, Answers & Explaination) کی بھرمار ہوگئی۔ ظاہر ہے کہ میں اس پوسٹ کے لئے ناتجربہ کار تھا اور بہت سینئیر بھی نہیں تھا۔کچھ دن بعد

ایک نوٹیفیکیشن کے ذریعے معلوم ہوا کہ میں بمعہ تین دیگر لوگوں کے (ڈاکٹر ظاہر شاہ، میجر جنرل فقیر اور بریگیڈیئر اختر) چیف ایگزیکٹیو صوبہ سرحد کے چار تدریسی کالجز و ہسپتالوں کے لئے چیف ایگزیکٹیو منیجمنٹ کمیٹی برائے ایبٹ آباد ٹیچنگ انسٹیٹیوشن مقرر کر دیا گیا ہوں اور فوراً چارج لینا ہے۔ اس پوسٹ کے لئے پہلی اور کڑی شرط یہ تھی کہ پرائیویٹ پریکٹس نہیں کرنی۔ فیصلہ مشکل تھا یکم اپریل 2000ء سے چارج لے لیا۔

دیگر تین اداروں کی طرح یہاں بھی شروع دن سے ہی چند سینئیر رفقاء سے سرد جنگ چل پڑی۔ گورنمنٹ نوٹیفیکشن تو ہو گیا تھا لیکن انتظامیہ کا طریقہ کار و دیگر اہم پوسٹوں پر نیا طریقہ کار وضع نہیں تھا۔ جسکی وجہ سے افراتفری تو ہونی ہی تھی۔ ماتحت عملہ کے فرائض منصبی اور اختیارات واضح نہیں تھے۔ Chain of Command کا بھی پتہ نہیں تھا۔ جلد ہی ہسپتال میں دھڑا بندی شروع ہو گئی۔ یہی حال صوبے کے تمام چار تدریسی ہسپتالوں کا بھی تھا۔ نئے طریقہ نظام سے متعلق کسی قسم کی تربیت کا اہتمام حکومت کی طرف سے نہ کیا گیا تھا اور نہ ہی دیگر افسران کو چیف ایگزیکٹیو کی ماتحتی کا کہا گیا۔ کمیٹی کے زیادہ تر کام امریکن سٹائل پر قائم مشاورتی (Advisory) اور ذاتی تحریک (Motivational) کی بنیاد پر ہونے پائے تھے۔ یہ ترویج مغربی ثقافت کی اندھی تقلید پر کی گئی۔ خلاصہ یہ کہ انتظامی کمیٹی کے اختیارات سے باہر تمام مراحل طے ہونے کے بعد جمہوری طریقہ کار کے ذریعے تمام اہم کیسز کو دیکھ کر فیصلے جمہوری بنیادوں پر کرنے تھے۔ جبکہ چیف ایگزیکٹیو کو انتظامی سربراہ کی حثیت سے حکومت کے ہر چھوٹے بڑے واچھے برے میں جواب دہ ہونا ہوتا۔

ایک سنگین مسئلہ یہ تھا کہ ہسپتال میں کسی جگہ، دفتر یا کمرہ ایسا نہیں تھا کہ چیف ایگزیکٹیو کا دفتر بن سکتا۔ دفتر ہی نہیں بلکہ سیکریٹیریٹ کے لئے تین چار کمرے بھی چاہیئے تھے۔ چونکہ میں ہسپتال کا پروردہ تھا اس لئے میں نے تھرڈ فلور پہ ایک موزوں جگہ دیکھ کر وہاں دفتر بنانے کا خفیہ فیصلہ کیا۔ اس معاملے میں

ڈائریکٹر فنانس فضل رحمٰن صاحب اور پراجیکٹ ڈائریکٹر فضل ستار صاحب کے بھرپور تعاون سے کام شروع کر دیا گیا۔ کسی کو سراسر پتہ ہی نہیں چلا۔ اس اثناء میں ہسپتال کے ایڈمنسٹریٹر جو میرے اپنے رفیق (Collegue) تھے کے دفتر میں جا کر بیٹھتا۔ انکو میں نے شروع دن سے یقین دلایا کہ میں انکا دفتر نہیں استعمال کرنا چاہتا اور اپنے لئے اپنا دفتر بناؤں گا لہذا ان کو تسلی ہوگئی کہ ہمارا اس معاملے میں اختلاف نہیں ہوگا۔ دیگر ہسپتالوں میں جہاں یہ ایڈمنسٹریٹر نہیں تھے تو انکے دفاتر اور دیگر متعلقہ دفاتر چیف ایگزیکیٹیو کے استعمال میں آگئے۔ ایک ہسپتال میں چیف ایگزیکیٹیو نے علیحدگی سے ایک یا دو کمروں میں اپنے آپ کو سیل کر دیا۔ ہر روز معاملات کو سمجھنے اور دیکھنے کے لئے مجھے دو تین گھنٹے وہاں لگتے۔ یہ ایک انتہائی مشکل مرحلہ تھا کیونکہ کچھ لوگوں کے خیال میں میرا یہاں بیٹھنا کچھ زیادہ زیب نہیں دیتا تھا۔ لیکن میں نے اسے اپنی انا کا مسئلہ نہیں بنایا لہذا میرے لئے سب کچھ ٹھیک چل رہا تھا۔

ایک ضروری بات یہ تھی کہ مینجمنٹ کمیٹی جو چار ڈیفالٹ ارکان (ایڈمنسٹریٹر، میڈیکل کالج کا پرنسپل، ڈائریکٹر فنانس اور ایک اور ڈائریکٹر) کے علاوہ ہمیں عوام سے چار پانچ عوامی نمائندوں اور حکومتی ارکان پر مشتمل تھی۔ لہٰذہ ان کے لئے میں نے ذاتی طور پر کافی لوگوں سے مل کر انہیں اس بات پہ قائل کیا کہ ہم انکو مینجمنٹ میں نمائندگی دیتے ہیں۔ ان میں سے ایک ممبر کے لیئے شعبہ صحت سے وابسطہ ہونا ضروری تھا۔ پرنسپل ریٹائرڈ و پروفیسر ڈاکٹر جمیل الرحمن جو میرے ہیڈ آف سرجری بھی رہے تھے اور بظاہر ہمارے درمیان کچھ تلخیاں بھی رہی تھیں۔ ان سے میں نے ممبر بننے کی التجاء کی جو انہوں نے خوش دلی سے قبول کر لی۔ ریٹائرمنٹ کے بعد وہ کسی میڈیکل کالج کے ایک اہم عہدے پر مامور تھے۔ اسکے علاوہ پروفیسر ڈاکٹر شوکت اور کزئی جو میرے بڑے قریبی ساتھی تھے، ایک سوشل تعلیم دان (Educationist) مسز رخسانہ جاوید بطور خاتون ممبر اور ایک ریٹائرڈ بریگیڈیئر صاحب کو بطور ممبر شامل کر دیا۔ حکومت کی طرف سے ہر متعلقہ محکمے کا آفیسر اور خصوصی طور پر S&GAD کے جیلانی صاحب ڈیفالٹ ممبر ہوتے تھے۔ اس طرح

تقریباً نو بندوں پر مشتمل کمیٹی بنی اور بذریعہ ووٹنگ فیصلے کرنے ہوتے تھے۔ کئی مراحل پر فیصلے کرنے کے لئے تگ ودو کرنا ہوتا تھا۔ اور جب تک میں رہا تمام فیصلے میرے منشاء کے مطابق ہوتے رہے۔

ہمارا سیکریٹیریٹ توقعات کے برخلاف ہفتے دس دن کے اندر ہی مکمل ہو گیا۔ میں اس دفتر میں منتقل ہو گیا۔ تمام کام فعال طریقے سے ہونے لگے۔ حکومتی ارکان کے ساتھ قریبی تعلقات قائم کرکے پتہ چلا کہ سرکاری دفاتر میں سینئیر افسران کس طرح کام کرتے ہیں۔ یہ ایک اچھا تجربہ تھا۔ کام کرتے کرتے تین بج جاتے تھے۔ اکثر دن دو بجے کے قریب سیکریٹریٹ سے کوئی نیا حکم آتا جس کا جواب لازمی طور پہ ہمیں خط یا ای میل کے ذریعے ایک یا دو گھنٹے میں دینا ہوتا۔ شروع میں بڑی تکلیف ہوئی لیکن جلد ہی میں نے محسوس کیا کہ بہت سارے کام پہلے سے تیار کر لینے چاہئیں جسکی وجہ سے حکومتی اہداف حاصل کرنے میں مشکل نہیں ہوتی۔ چیف ایگزیکٹیو کے لئے ایک گاڑی خصوصی فنڈنگ سے خرید لی گئی جس کے آنے میں کچھ وقت تو لگا مگر ایک مسئلہ حل ہو گیا۔ مجھے پہلی دفعہ معلوم ہوا کہ بہت سے مربی لوگ بھی اندرونی و بیرونی طرح سے الگ دکھائی دیتے ہیں۔ بہت سے خطوط جن لوگوں نے مخالفت میں لکھے وہ ان کی استطاعت کے مطابق نہیں لکھے ہوتے تھے۔ یعنی جن لوگوں کی استطاعت تھی خط ان سے لکھواتے۔ یہ بات میرے لئے باعث تقویت بھی تھی کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ خط کون لکھتا ہے اور اُس کا کیا جواب دینا چاہیئے۔ دفتری امور چلانے کے لئے میرے معاون پی اے مسٹر شفیق الرحمان نے جان فشانی سے اہم کردار ادا کیا۔

میری پہلی انتظامی غلطی: ایک ڈاکٹر دوست کے کیس میں مجھے از حد باور کرایا گیا کہ کیس بالکل صحیح، کاغذات مکمل اور قانونی تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے تیار ہوئے ہیں۔ میں نے اُن صاحب کی ترقی کے حق میں خط حکومت کو لکھ دیا جس پر سیکریٹری ہیلتھ صاحب نے مجھے فون کر کے کہا کہ اس خط میں کچھ قباحت ہے میں معاملے کی قباحت کے بارے میں میں جاننا چاہتا تھا تو مجھے انہوں نے کچھ اشارے بھی

دیئے یہ ان کی مہربانی تھی کہ انہوں نے میری غیرارادی کام کرنے کی صلاحیت کو پرکھا اور اسطرح میں نے اپنے ماتحتوں کو بھی سمجھا اور ہدایات دی کہ کوئی غلط معلومات نہ دیں۔ اپنے بزرگوں کا مشورہ مانتے ہوئے ماتحتوں کے لکھے ہوئے الفاظ ''کہ یہ قانون کے مطابق صحیح ہے'' اگر نہ لکھا ہوتو میں اُس دستاویز پر دستخط نہ کرتا۔ اگر کوئی کام قانون کے مطابق نہ ہوتو اس پر واضح طور پر لکھا جائے کہ اس پر کونسے قانون کی شق لگتی ہے۔ میں ان سے رولز بک بھی منگواتا اور اس طرح سے میری اپنی تربیت بھی ہوتی رہی۔ ایک نسخہ مجھے یہ بھی سمجھایا گیا تھا کہ دفتر کے آخری وقت میں جو فائل لائی جائے اُس پر میں کبھی دستخط نہ کروں۔ اس وجہ سے میرے ماتحت محتاط ہو گئے اور ہم سے بہت کم غلطیاں ہوئیں۔ چیف ایگزیکٹیو کی حیثیت سے چند ماہ میں میں نے سالوں کے تجربات کا نچوڑ حاصل کیا۔ ایک مرتبہ کارڈیولوجی وارڈ کے رجسٹرار ڈاکٹر شکیل نے میرا ہائی بلڈ پریشر دیکھ کر پریشانی کا اظہار کیا۔ یہ دراصل ذہنی پریشانی کے باعث تھا۔ اکثر میں فائل گھر لے جا کر کھولنے سے گھبراتا جنکا فیصلہ کرنا ایک انتہائی مشکل کام ہوتا۔ افسران بالا، سیاسی اور بااثر لوگوں سے اکثر ملاقات ہوتی اور انکے دباؤ سے نمٹنا پڑتا۔ یہ وہ مرحلہ تھا کہ جس میں میں نے انسانی تعلقات بنا کر رکھنا سیکھے۔

ایک سرکاری افسر تشریف لائے جن کا مدعا کچھ مراعات حاصل کرنا تھا وہ اپنی حدود سے بالاتر کچھ ہسپتال کی سہولت اپنی ذات کے لیئے استعمال کرنا چاہتے تھے۔ میں ان سے ملا اور طریقے سے انکی ضروریات کو نظرانداز کر دیا جس کو انہوں نے بھانپ لیا اور کہا کہ میں تو انسپکشن کرنے کے لئے آیا ہوں اور ابھی انسپکشن کروں گا۔ میں نے بیباک طریقے سے انکار کر دیا اور کہا کہ یہ سب مہیا کرنے میں وقت لگے گا جس سے وہ ڈر گیا اور کہنے لگا کہ مجھے ابھی کسی ضروری کام سے جانا ہے اور دو تین دن بعد آؤنگا۔ میرے پاس دو خوبصورت مگر کم قیمت پین تھے اانہوں نے اسے قیمتی جان کر لینے کی فرمائش کی۔ میں نے انکو ایک تحفہ کر دیا۔ یوں سستے میں جان خلاصی ہوئی۔

ایک اور صاحب جو بہت ہی دیندار قسم کے تھے اور کسی با اثر ادارے سے تعلق رکھتے تھے نے بھی اپنی کچھ ڈیمانڈ پیش کی جس پر میں نے کوئی ردعمل نہیں دیا اور انہوں نے مجھے خوب ڈرایا دھمکایا کہ فلاں فلاں بندے کو میں نے شکایات کر کے تبدیل کروادیا تھا۔ ان کو بھی قانونی طور پر نمٹایا۔ اِس جیسے خرافات کا سامنا اکثر کرنا پڑتا اور انکو اچھے طریقے سے نمٹانا روزمرہ کا معمول ہوگیا۔ میڈیا جو چھوٹے سے چھوٹے معاملات کو بڑھا چڑھا کر پیش کرتے ہیں ان کے فرمائشیں اکثر مالی سلسلے میں تعاون کے لیئے ہوتیں۔ میں نے اس سلسلے میں کوئی حوصلہ افزائی نہیں کی۔ جسکے نتیجے میں اخبارات میں میرے خلاف بیانات کی بھرمار ہوگئی۔ اکثر صحافی اس سلسلے میں انٹرویو کرنا چاہتے تھے جس پر میں نے بندش لگادی۔

ایوب ٹیچنگ ادارے کے بارے میں سچوئیشن اینالسز (Situation Analysis) کے نام سے میں نے ایک کتاب لکھی جس میں ہسپتال کی مشکلات کا ذکر کیا۔ اس میں قانونی پیچیدگیاں اس قدر تھی جس کو نپٹانے کے لئے وکلاء سے مدد لے کر قانونی فرنٹ بہتر کرنے تھے۔ مختلف عدالتوں میں 53 کیسز تھے جن میں کچھ کیسز پرانے، پیچیدہ اور کچھ اعلی عدالتوں میں بھی تھے جس کے لئے ضروری تھا کہ حکام بالا کو مطلع کر دیا جائے۔ اسی طرح مالی بے ضابطگیاں اور مالی معاملات بھی پیش کر دیئے گئے۔ حکومت پاکستان سے جو مالی امداد ملی تھی اس میں پہلا مرحلا گزر گیا، دوسرے مرحلے میں ہسپتال میں تعمیرات تھی وہ کرادی گئی لیکن تیسرے مرحلے کی کوئی بنیاد نہیں تھی۔ جسکے لیئے وفاقی گورنمنٹ سے بہت بڑا معرکہ کرنا تھا۔

اگرچہ حکومت کی طرف سے سالانہ ایک معقول گرانٹ ملتی تھی مگر اس سے ہماری ضروریات پوری نہ ہوسکتی تھیں۔ مجھے اندازہ ہوا کہ مالی معاملات اندرونی معاملہ نہیں ہے کیونکہ فنانس ڈائریکٹر وفاق سے تھا اور اس پر میرا اختیار نہیں تھا۔ فنانس ڈائریکٹر سے میرے اچھے تعلقات تھے اور مجھے انکی ایمانداری پر کوئی شک نہیں تھا اور مجھے اُن سے مکمل ہم آہنگی حاصل تھی۔ ہمارے اختیار میں گریڈ 21 - 17 تک کو نوکری میں رکھنا یا نکالنا شامل تھا لیکن گریڈ 16 - 1 تک کا اختیار نہیں تھا۔ یہی طبقہ مشکلات کا سبب بنتے

تھے۔اسکا حل یہ نکلا کہ یونین اور با اثر افراد کی ایک کمیٹی بنائی جس میں ان کے مطالبات اور مسائل کو وضع کیا۔اور یوں معاملات خوش اسلوبی کے ساتھ طے پا جاتے۔ایک موقع پر دیگر ہسپتالوں کے چیف ایگزیکٹیو میرے دفتر آئے اور شکایات کے انبار لگائے۔ان میں سے دو صاحبان نے مجھ سے پہلے اپنی پوسٹوں سے استعفیٰ دے دیا اور نوکری چھوڑ کر چلے گئے۔صرف ایک پروفیسر ظاہر شاہ جنہوں نے اپنی نوکری کی مدت کو پورا کیا مگر جس قدر مشکلات میں گزارا یہ مجھے ہی معلوم ہے۔ مجھ سے اس وقت کے گورنر لیفٹیننٹ جنرل ریٹائرڈ افتخار حسین نے اس سلسلے میں ایک ملاقات ہوئی جس میں کسی معاملہ کے حل کرنے کے سلسلے میں مجھ پر احکامات سے انکار کا الزام دیا گیا۔ میں نے بتایا کہ میں حکومتی اصولوں اور پالیسیوں پر تو جاسکتا ہوں لیکن ذاتی مفادات پر نہیں۔اور یوں چار مہینے کے بعد میں وہ دفتر چھوڑ کر واپس اپنی پرانی پوسٹ یعنی ہیڈ آف سرجری میں آ گیا۔میرے بعد ایک ریٹائرڈ میجر جنرل ارشد بٹ صاحب کو متعین کیا گیا۔انہوں نے مجھ سے انتہائی مودبانہ سلوک رکھا اور میٹنگز میں میری کرسی اپنے ساتھ ڈلواتے رہے۔کچھ عرصہ بعد مجھے سعودی عرب کی ایک خصوصی ہسپتال میں بطور منیجمنٹ کنسلٹنٹ کی آفر آئی اور میں نے قبول کر لی۔

سلطان بن عبدالعزیز ہیومینیٹیرین سٹی۔سعودی ہسپتال کا تجربہ بطور کنسلٹنٹ:۔

<u>2002ء</u> میں جب مجھے دوسری مرتبہ دل کا دورہ پڑا میں پشاور اپنے بھائی خالد مفتی کے گھر صحت یاب ہو رہا تھا تو مجھے سعودی سفیر مسٹر اسیلی صاحب کا فون آیا کہ وہ مجھ سے کسی جاب آفر کے لئے جلد از جلد ملنا چاہتے ہیں۔میں نے وعدہ کیا کہ صحت یابی کے بعد میں خود ان سے ملنے کے لئے سفارت خانے آجاؤنگا۔میرے جانے پر میرا بہت اعلیٰ طریقے سے استقبال کیا اور بتایا گیا کہ میرا نام ان گنے چنے ناموں میں شامل ہے کہ جن کو سلطان بن عبدالعزیز Rehab ہسپتال کے نام سے بنائے گئے ہسپتال میں میں ان کے لئے ایک سالہ کنٹریکٹ پر کنسلٹنسی دینے کا کہا گیا ہے۔میں نے ان کے اقامہ لینے سے معذرت کر لی اور وزٹ ویزا پر سعودیہ گیا جلد ہی مجھے معلوم ہوا کہ وزٹ ویزہ پر مجھے وہ حقوق

حاصل نہیں ہیں جو وہاں پر اوروں کے لئے ہیں۔یعنی میں بینک میں اکاؤنٹ نہیں کھول سکتا تھا، گاڑی نہیں چلا سکتا تھا وغیرہ وغیرہ۔لہذا مجھے اقامہ لینے کے لئے پاکستان واپس چھ سات ہفتے کے لئے بھیجا گیا۔اس اثناء میں سعودی قانون رائج ہوا کہ تمام غیر ملکی ڈاکٹر اپنی ڈگریوں کی تصدیق کے لئے سعودی میڈیکل کونسل کو درخواست دیں۔ جو ہم سب سے ہسپتال کی انتظامیہ نے کروایا۔ چند محدود ڈاکٹر جن میں میں بھی شامل تھا کو بغیر کسی ٹسٹ یا انٹرویو کے لائسنس دے دیا گیا جبکہ باقی تمام لوگوں کے امتحانات لیئے گئے اور صرف پاس ہونے پہ لائسنس جاری کئے گئے۔اس طرح اچانک انتظامیہ کے سامنے میری ساکھ بڑھ گئی اور مجھے میرے اپنے کام کے علاوہ مختلف دیگر شعبہ جات کی کمیٹیوں میں ڈال دیا گیا۔دستور کے مطابق میں آخری سیٹ پر ہی بیٹھا ہوتا۔ایک خاص میٹنگ میں ڈاکٹروں کی جانچ پڑتال پر انتظامیہ اور دیگر سینئیر ممبران کے درمیان اختلاف رائے پیدا ہوا میری رائے لی گئی جو مستند ثابت ہوئی اور اسطرح مجھے عام سطح سے اوپر کے انتظامی رفقاء میں تصور کر لیا گیا۔

یہاں رہتے ہوئے سعودی تہذیب،سوچ وطریقہ کار پر میری سوجھ بوجھ ہوئی۔ان کے انتظامی طریقہ کار سے بھی میں آگاہ ہوا مجھے محسوس ہوا کہ آج کا سعودی مغربی دنیا اور خصوصی طور پر امریکہ سے اس قدر متاثر ہے کہ کوشش کے باوجود مجھے عربی زبان میں ڈھالنے کے بجائے مجھ سے ٹوٹی پھوٹی انگریزی بول چال کو ترجیح دیتے۔انتظامی و پیشہ ورانہ کام کاج امریکی یا برٹش سٹائل میں ہوتے تھے۔اس ہسپتال میں میری موجودگی میں بہت سے سرجیکل وکلینکل ڈیپارٹمنٹ قائم ہوئے جن میں میری معاونت شامل تھی۔غیر سعودی ملازمین کی کسی غلطی یا اختلاف رائے کو ایک دن میں خدمات معطل اور ملک سے خروج کو ممکن بنانے کا مشاہدہ میں نے بنفس نفیس ایک بڑے پیمانے کے افسر کے کیس میں ہوتے دیکھا۔میرے خیال میں یہ ملک سونے کا ایک پنجرہ تھا جس میں زیادہ عرصہ گزارنا ممکن نہ تھا لہذا ایک سالہ مدت پوری ہونے پر میں اپنے اہل خانہ کے احتجاج کے باوجود ایوب میڈیکل کالج ایبٹ آباد واپس لوٹ آیا۔

پرنسپل ایوب میڈیکل کالج:

2007ء کے آخر میں پرنسپل ایوب میڈیکل کالج کی سیٹ خالی ہوئی اور میں سینئیر فیکلٹی تھا مگر پچھلے تجربات کے حوالے سے پرنسپل بننے کا خاص شوقین نہیں تھا۔ پروفیسر محمد داؤد دوائس چانسلر خیبر میڈکل یونیورسٹی نے مجھے خصوصی تحریک دی کہ کچھ عرصہ کے لئے ہی صحیح لیکن پرنسپل بن جاؤں۔ پرنسپل دفتر سنبھالنے کے بعد مجھے معاملات دقت طلب محسوس نہ ہوئے۔صوبائی میڈیکل کالج خیبر میڈیکل یونیورسٹی کے ماتحت تھے۔اس دوران کالج میں شعبہ ریسرچ قائم کرنے کو کہا گیا۔ایوب میڈیکل کالج میں کوئی ڈیپارٹمنٹ ریسرچ یونٹ کے لئے جگہ دینے کے لئے راضی نہیں تھا۔ہیڈ آف فارما کالوجی ڈیپارٹمنٹ پروفیسر ڈاکٹر رشید احمد جیسے کڑی فیکلٹی کو راضی کر کے ایک ہال خالی کروا یااور ریسرچ سنٹر بنا دیا۔ایک بزنس فارم کے پروپرائیٹر اظہر صاحب (سوداگر ہاؤس) سے بات کر کے ایک ہفتے کے اندر تمام کام مکمل کرایا۔تمام اخراجات نقد اس وقت جیب سے دیئے۔مقررہ تاریخ تک ریسرچ یونٹ قائم ہونے پر وائس چانسلر ڈاکٹر داؤد اور ریسرچ ڈائریکٹر مادام اُمہ نے وزٹ کیا یہاں ریسرچ کے متعلق تمام ضروریات موجود تھیں۔یہ ایک خوشگوار لمحہ تھا۔انہوں نے میرے کام کو سراہا۔میرے کالج سے جانے کے بعد اس یونٹ کا کیا ہوا؟ مجھے کوئی اندازہ نہیں۔

اسی اثنا میں پاکستان کرکٹ بورڈ (PCB) نے ملک میں مختلف مقامات پر انٹرنیشنل کرکٹ سٹیڈیم قائم کرنے کے لیئے تمام ملک کا سروے کیا جس میں ایبٹ آباد بھی شامل تھا۔PCB کے چیئرمین ڈاکٹر نسیم اشرف میرے پرانے دوست تھے۔وہ اس سے پہلے جنرل مشرف کے خصوصی معاون اور فیڈرل منسٹر ہیلتھ برائے ہیومن ڈیویلپمنٹ کے پروگرام کو بخوبی سرانجام دے چکے تھے۔ان کے تعاون سے ایوب میڈیکل کالج کے خالی میدانوں میں کسی ایک کو چننے کے لئے رابطہ کیا۔کچھ تگ و دو کے بعد اعتراضات کو رفع دفع کیا۔چونکہ ایوب میڈیکل کالج میں پانی کا مسئلہ شدید تھا۔مزید پانی حاصل کرنے

کے لیئے زمین میں بور کرنے کے لئے کوئی فنڈ نہیں تھا لہذا PCB نے بور کا مسئلہ بھی حل کر دیا۔اور یوں ڈاکٹر داؤد دوائس چانسلر KMU نے بخوشی PCB کے ساتھ MOU پر دستخط کر دیئے۔اور تین ماہ کے عرصہ میں ایک خوبصورت بین الاقوامی معیار کا کریکٹ گراؤنڈ بن کر فعال ہو گیا۔

ایک موقع پر ڈاکٹر فریدہ ریٹائرڈ ہیڈ ڈیپارٹمنٹ شعبہ اطفال ایوب میڈیکل کالج کے کسی انتظامی دفتر سے نکلتے ہوئے میں نے دیکھ لیا۔انہوں نے بتایا کہ کسی کام سے آئی ہوں۔اور گلہ کیا کہ تمام پیشہ ورانہ زندگی دینے کے بعد بھی میڈیکل کالج میں تربیت دینے والوں کو کالج میں پوچھنے والا کوئی نہیں ہوتا۔میں نے اپنے رفقاء سے صلاح مشورہ کر کے ایک تقریب کا انعقاد کیا۔ جس میں تمام ریٹائرڈ اساتذہ، پرنسپلوں اور فاؤنڈر پرنسپل کو مدعو کر کے انکو شیلڈ دے کر پذیرائی کی گئی۔اور ایک گولڈن صفحات والی رجسٹر میں انکے تاثرات لکھے گئے۔جس سے ایک نئی روایات ڈال دی گئی۔مزید یہ کہ ریٹائرڈ اساتذہ کے استعمال کے لئے ایک دفتر مختص کر دیا۔ میری ریٹائرمنٹ کے وقت ایک پروقار تقریب منعقد کروا کر اور میری سرکاری گاڑی کو سجا کر مجھے گھر تک کچھ لوگوں کے ساتھ چھوڑا گیا جو میرے لئے ایک اعزاز تھا جسکا میں آج بھی شکرگزار ہوں۔ریٹائرمنٹ کے بعد کئی دفعہ میں ایوب میڈیکل کالج اور انکے تقریبات میں خصوصی طور پر گیا ہوں۔جس پر مجھے انکی طرف سے خصوصی استقبالیہ اور توجہ دی جاتی ہے۔

اولین پرنسپل (KIMS) کوہاٹ:۔

مارچ 2008ء میں ریٹائرمنٹ کے بعد ارادہ تو یہ تھا کہ دیگر ریٹائرڈ پروفیسروں کی طرح ایبٹ آباد میں ہی تین پرائیوٹ میڈیکل کالجوں میں سے ایک کالج میں پڑھانا شروع کر دوں گا۔اس سلسلے میں فرنٹئیر میڈیکل کالج کے مالک و پرنسپل پروفیسر اے جے خان جو میرے Mentor بھی تھے کی پیش کش موجود تھی۔اس سے پہلے وومن میڈیکل کالج کے ایگزیکٹو ڈائریکٹر اظہر جدون نے کسی ایک تقریب میں یہ اعلان کیا تھا کہ پروفیسر طارق مفتی آئندہ وومن میڈیکل کالج کی فیکلٹی کا حصہ ہونگے۔

ایبٹ انٹرنیشنل میڈیکل کالج تیسرا کالج تھا جس کے مالک ڈاکٹر غضنفر جو میرے ساتھ رجسٹرار بھی رہے تھے، اُن کے ہسپتال میں میں نے کئی سال تک پرائیویٹ سرجری بھی کی، ان کی جانب سے بھی کھلی پیش کش تھی کہ میں ان کا کالج جوائن کرلوں بلکہ اُن کا خیال تھا کہ میں اُن کا پارٹنر بھی بن سکتا ہوں۔ اُن کا میڈیکل کالج اُس زمانے میں قانونی مشکلات سے دوچار تھا۔ کس کالج میں جانا ہے اس بارے میں نے فوراً کوئی فیصلہ نہ کیا اگر چہ یہ تمام لوگ میرے دل میں جگہ رکھتے تھے اور میرا ارادہ بھی انہی کو جوائن کرنے کا تھا۔ ابھی مجھے ہفتہ ہی ہوا ہوگا کہ میرے قریبی ساتھی ڈاکٹر مختار جو میرے یونٹ میں اسسٹنٹ پروفیسر بھی رہے تھے نے مجھے اطلاع دی کہ کوہاٹ میڈیکل کالج سے آپ کو پرنسپل کی پیش کش آنے والی ہے۔ میں نے یہ بات سنی ان سنی کردی۔ کوہاٹ کا یہ کالج جو گورنر سرحد جنرل ریٹائرڈ سید افتخار حسین شاہ نے اپنے کوہاٹی ہونے کی نسبت سے شروع تو کرلیا تھا مگر وہ چل نہیں پا رہا تھا اور شدید مشکلات میں گھرا ہوا تھا۔ پی ایم ڈی سی سے رجسٹرڈ بھی نہیں تھا۔ دو چار دن کے بعد مجھے پیش کش کا خط بھی مل گیا۔ میں نے یہ پیش کش رد کردی۔ اتنے میں مجھے وائس چانسلر خیبر میڈیکل یونیورسٹی پروفیسر ڈاکٹر داؤد کا فون آیا کہ کوہاٹ انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنسز میرے لئے ایک چیلنج ہوگا۔ ان کے بعد کوہاٹ یونیورسٹی آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی کے وائس چانسلر میاں لطف اللہ کاکاخیل نے مجھ سے رابطہ کیا۔ اُن کے اصرار پر میری ملاقات اُن سے پشاور میں گرین ہٹ ریسٹورنٹ میں ایک ڈنر پر ہوئی۔ دوران گفتگو انہوں نے مجھے قائل کرنے کی کوشش کی۔ میں نے اُس وقت بھی کوئی فیصلہ نہیں کیا اور انہیں کہا کہ کوہاٹ جانا میرے لئے بہت مشکل ہوگا۔ میں ایبٹ آباد میں مقیم ہوں اور کامیاب پریکٹس کر رہا ہوں اور ویسے بھی رہنے کے لحاظ سے کوہاٹ میرے لئے کوئی معقول جگہ نہیں ہے۔ معاوضہ بھی کم ملے گا۔ چند دنوں بعد پیش کش میں کی جانے والی رقم میں دگنا اضافہ کر دیا گیا۔ میں نے دوسری پیشکش بھی نظر انداز کردی۔ اس کے کچھ دن بعد مجھے ایک دفعہ پھر اس سے بھی بڑی آفر آ گئی۔

ان دنوں میری والدہ جو خاصی بیمار تھیں اور اُن کی دیکھ بھال پشاور میں میری ہمشیرہ کر رہی تھیں۔ میں چاہتا تھا کہ والدہ کے پاس بھی تھوڑا وقت گزاروں۔ اسی اثناء اُس وقت کے گورنر اویس غنی نے اپنی کزن جو میری ممانی تھیں کے ذریعے مجھے پیغام بھجوایا کہ چونکہ یہ سب آفرز اُن کے کہنے پر دی جارہی ہیں۔ لہذا میں بھرم رکھنے کیلئے یہ قبول کرلوں، دوسری طرف ابھی تک ایبٹ آباد کے کسی کالج نے بھی باقاعدہ طور پر مجھ سے رابطہ نہیں کیا تھا۔ گورنر اویس غنی سے میں ملا۔ ان کے خیال میں چونکہ میں پشاور سے تعلق رکھتا تھا اس لئے وہ چاہتے ہیں کہ میں کوہاٹ یونیورسٹی صرف ایک سال کے لئے جوائن کر لوں۔ میں نے انہیں بتایا کہ ریٹائرمنٹ کے بعد میں پشاور نہیں آرہا بلکہ ایبٹ آباد میں ہی رہنا چاہتا ہوں لیکن انہوں نے مجھے قائل کرلیا کہ میں کم از کم جا کر کوہاٹ کا دورہ تو کرلوں۔ وائس چانسلر لطف اللہ نے بھی کہا کہ ضروری نہیں کہ آپ مسلسل آئیں۔ آپ صرف آ کر کالج کو چلا دیں آپ کو باقی لوگوں کی طرح مستقل یہاں رہنا نہیں پڑے گا۔ دوسری طرف اویس احمد غنی کی گورنری ختم ہونے کی باتیں شروع ہو گئیں، ہمایوں سیف اللہ کا نام آنا شروع ہوگیا۔ یہ بھی خیال تھا کہ پسند نہ آئے تو میں انکار کردوں گا۔ لہذا ان تمام عوامل کو مدنظر رکھ کر میں نے کوہاٹ جانے کا فیصلہ کرلیا۔

جب میں نے کوہاٹ انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنسز کا دورہ کیا۔ تو معلوم ہوا کہ یہ کوہاٹ کے ڈسٹرکٹ ہسپتال کے دو ہال، ایک آفس اور ایک چھوٹی سی لائبریری پر مشتمل ایک جگہ تھی۔ جس کا نام کوہاٹ انسٹیٹیوٹ آف میڈیکل سائنس رکھا گیا تھا۔ ڈائریکٹر کا ایک چھوٹا سا کمرہ تھا اُس کمرے سے متصل کمرے میں ایک شخص بیٹھا تھا جو خود کو ڈائریکٹر کا پی اے کہہ رہا تھا۔ پہلے ڈائریکٹر ڈاکٹر وحید اور موجودہ پروفیسر بشیر صاحب نے استقبال کیا اور مشکل حالات کی روداد سنائی۔ پتہ چلا کہ یہ میڈیکل کالج قرشی لیبارٹریز کے دس لاکھ روپے کے عطیہ سے بنا ہے اور شرط یہ ہے کہ اس میں ہربل میڈیکل کے طلباء بھی تعلیم حاصل کرینگے۔ میں سمجھ گیا کہ یہ ایک تقریباً ناممکن کام ہے۔ میں پریشان تھا کہ کس مصیبت میں

پھنس گیا ہوں ۔ پھر بھی میں نے بھی اس ذمہ داری کو ایک چیلنج کے طور نبھانے کا فیصلہ کیا۔ دو وجوہات نمایاں تھیں اول تو یہ کہ ساٹھ سال تک اس ملک اور معاشرے نے مجھے عزت وافتخار سے نوازا، عہدے بھی ملے اور اچھی خاصی رقم بھی کمائی دوم یہ کہ اس بہانے مجھے اپنی والدہ کی قربت اور اُن کی خدمت کرنے کا موقع مل جائیگا۔ یوں یہ سوچتے ہوئے کہ اب وقت آ گیا ہے کہ میں کوئی ایسا کام کروں جس سے لوگوں کو خصوصی فیض پہنچے۔ بالآخر میں نے یہ پیش کش قبول کر لی۔ ذہن میں تھا کہ پشاور میں رہائش رکھ کر روزانہ کوہاٹ آجاسکوں گا۔

ابتداء ہی میں قانونی مشکلات پیش آ گئیں ۔ یونانی طریقہ علاج یعنی ہربل میڈیسن کے شعبہ کے طلباء چاہتے تھے کہ وہ پی ایم ڈی سی میں رجسٹر ہوں اور انہیں بھی ایم بی بی ایس کی ڈگری ملے جو ناممکن تھا۔ شروع کے چند ہفتے میں نے اُن کے ساتھ قانونی جنگ میں گذار دیئے۔ مقدمے میں اللہ نے ہمیں سرخرو کیا۔ میں نے اُن کو علیحدہ کر کے میڈیکل کالج کی حیثیت جدا کی اور اس کے بعد وائس چانسلر میاں لطف اللہ کا مجھ پر اعتماد قائم ہو گیا۔ انہوں نے میرے لئے فنڈز کا اجراء کیا اور کھلی اجازت دے دی کہ قانون کے دائرے کے اندر رہ کر میں نے جو کرنا ہے کروں اس میں کسی کا عمل دخل نہیں ہوگا۔

میرے ایک سال کے دورانیہ میں وائس چانسلر صرف دو بار آئے۔ ایک بار جب ہم نے اُنہیں خاص طور پر بلایا اور دوسری بار جب پی ایم ڈی سی والوں کو آنا تھا۔ وائس چانسلر لطف اللہ صاحب نے جس طرح مجھ پر اندھا اعتماد کیا مجھے اس پر ہمیشہ فخر رہے گا۔ کوہاٹ انسٹی ٹیوٹ فار میڈیکل سائنسز کیسے اور کیونکر آگے بڑھا۔ اس کی داستان تو بہت طویل ہے لیکن اس کے چند خاص پہلو میں اُجاگر کئے دیتا ہوں ۔ KIMS میں ایک ایڈمنسٹریٹر ریٹائرڈ کیپٹن ڈاکٹر مطیع اللہ تھے جو بی ڈی ایس ڈاکٹر تھے۔ اگرچہ میں انہیں پہلے سے تو نہیں جانتا تھا مگر کچھ دن میں ہی میری اُن سے ذہنی ہم آہنگی ہوگئی۔ کوہاٹ کے رہنے والے تھے۔ سیاست سے بھی تعلق تھا اور الیکشن بھی لڑ چکے تھے۔ ان کا اثر ورسوخ بھی میرے کام آیا۔

ڈائریکٹر کا نام پی ایم ڈی سی کی کتابوں میں نہیں تھا۔ہم نے اسے تبدیل کر کے پرنسپل کردیا اور یوں مجھے انسٹی ٹیوٹ کا اولین پرنسپل بننے کا اعزاز حاصل ہوگیا۔اٹانومی ڈپارٹمنٹ میں ایک ڈاکٹر صاحب خان ایف سی پی ایس سرجری تھے اور بطور اسسٹنٹ پروفیسر تعینات تھے۔ان کے علاوہ سربراہ فزیالوجی ایوبین پروفیسر ڈاکٹر فرمان وزیر تھے۔ان کے علاوہ دیگر شعبوں کی فیکلٹی نہیں تھی۔لہٰذا سب سے پہلا کام یہ تھا کہ فیکلٹی کو بڑھایا جائے۔کلینکل فیکلٹی تو سرے سے تھی ہی نہیں۔ہسپتال بی کیٹگری میں تھا۔ اُس میں کام کرنے والے ماہرین سپشلسٹ ڈاکٹر مختلف شعبوں میں گورنمنٹ سروس کے سپشلسٹ تھے۔ اس صورتحال میں میری سب سے پہلی توجہ فیکلٹی کے پروفیسر صاحبان کو بھرتی کرنا تھا۔دور دور تک بھی کوئی فیکلٹی ملنے کا امکان نہیں تھا میں نے بہت معلومات کر کے چند ایک شخصیات کے ساتھ ذاتی رابطہ کیا اور مختلف حیلوں بہانوں سے انہیں باقاعدہ سلیکشن بورڈ کے انٹرویوز کے ذریعے معقول تنخواہوں اور اس شرط پر تعینات کیا کہ وہ کوہاٹ سے باہر رہ سکتے ہیں اور اُن کا روزانہ کوہاٹ ڈیوٹی پر آنا بھی ضروری نہیں تھا۔ہاں البتہ یہ ضرور تھا کہ وہ اپنے شعبہ جات قائم کرنے کے عمل، سٹاف کے نظم وضبط اور طالب علموں کی تربیت کا معقول بندوبست رکھیں گے۔ڈاکٹر پروفیسر عزیز الرحمن پتھالوجسٹ ، ڈاکٹر ممتاز پتھالوجسٹ، ڈاکٹر ذوالفقار خشک کمیونٹی میڈیسن ،ڈاکٹر پروفیسر انور فارماکالوجی اور ڈاکٹر امجد حسین آغا فارنزک میڈیسن میں تعینات ہوگئے۔ڈاکٹر تاج علی جو میرے بھی اناٹومی کے اُستاد تھے کو بھی 70 سال سے زیادہ عمر ہونے کے باوجود میں لے آیا اور انہوں نے اناٹومی ڈپارٹمنٹ میں ڈیڈ باڈی (Cadavers) کے پارٹس کو ماہرانہ طریقے سے شیشے کے جاروں میں محفوظ کر کے ڈپارٹمنٹ کی خوبصورتی میں ایک شاندار میوزیم کا اضافہ کیا۔ کسی بھی مردے کا حصول بہت مشکل تھا لیکن ہم نے کوہاٹ میں ہی سے لاوارث فقیروں کی باڈیز کو پولیس اور ضلعی انتظامیہ کے تعاون سے کالج کے سردخانے میں منتقل کردیا۔

خواتین ہاسٹل کہیں اور شفٹ ہونا تھا اور بلڈنگ کچھ دنوں میں خالی کر کے ہسپتال انتظامیہ کو

واپس کرنا تھی۔ میں نے مطیع اللہ کے ساتھ مل کر ایک منصوبے کے تحت اس جگہ کو قبضہ میں لے کر پتھالوجی اور دیگر مضامین کی لیبارٹریز قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ اجازت کے بغیر یہ ممکن نہیں تھا۔ نتائج خراب ہو سکتے تھے لیکن ہم نے رسک لینے کا فیصلہ کیا اور چند متعلقہ سینئر منیجمنٹ کو اعتماد میں لے کر کام شروع کر دیا۔ یہاں پر فرنیچر اور ٹیبل ٹاپس لیبارٹری بنائیں اور شیشے کی الماریاں مختلف ماڈل وغیرہ رکھنے کیلئے جائزہ لیا۔ تو معلوم ہوا کہ اگر ہم رائج طریقوں سے ٹینڈرز دیں گے تو یہ کام اس تھوڑے عرصے میں ناممکن ہوگا اور دوسرے انسٹی ٹیوشنز کی طرح شاید کئی سال لگ جائیں۔ مطیع اللہ نے تجویز کیا کہ کیوں نہ ہم تین چھوٹی چھوٹی فیکٹریاں اس احاطے میں لگالیں۔ اس میں تیزی سے ضرورت کے مطابق مینوفیکچرنگ کریں اور اس طریقے سے ہم ٹینڈر وغیرہ سے بھی بچ جائیں گے۔ میں نے آڈٹ والوں سے منظوری لی۔ اور اللہ کا نام لے کر کام شروع کر دیا۔ مطیع اللہ چونکہ عوامی رابطے میں تھا۔ بہت تیزی سے ٹیکنیکل لوگوں کو جمع کر کے موقع پر ہی مختلف چیزیں بنانا شروع کر دیں۔ بہت تیزی سے بغیر مختلف بیرونی سپلائیر کو شامل کئے بہت ہی فعال طریقے سے لیبارٹریوں اور جگہوں کو آراستہ کرنا شروع کر دیا۔ اس کے ساتھ دیگر ضروری آلات برائے لیبارٹری کی خریداری بڑی تیزی سے کر لی۔ اس سلسلے میں محمد ذاکر جو آج کل ڈائریکٹر پلاننگ رحمان میڈیکل انسٹیٹیوٹ ہیں اور ذوالفقار صاحب جو اس وقت ڈائریکٹر تھے نے بہت تعاون کیا۔ انہوں نے قانون کے دائرہ میں رہتے ہوئے قواعد وضوابط کے مطابق مجھے کام کرنے کی سہولت دی اور اس طرح کام آسان ہوگیا۔ مجھے یہ خوشی بھی تھی آڈٹ کے حوالے سے بھی اعتراضات نہیں اٹھائے گئے اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ ہم نے انتہائی خلوص سے کام کیا اور ایک روپے کا نہ تو نقصان ہوا اور نہ ہی ہم نے اسے ناجائز طور پر استعمال کیا۔

گرلز ہاسٹل بدھ کے دن خالی ہوا اگلے دن سے ہفتہ وار چھٹیاں تھیں۔ ہسپتال کے میڈیکل سپرٹنڈنٹ داوڑ صاحب تھے وہ ہمارے حق میں نہ تھے۔ اور ان کی موجودگی میں ہمارے لئے یہ بلڈنگ

حاصل کرنا شاید ممکن نہ تھا۔انہوں نے چار پانچ روز کی چھٹی پر جانا تھا۔ میں نے اور مطیع اللہ نے پہلے سے ہی ذہن بنایا ہوا تھا۔تین دن کے اندر بڑی تیزی سے خالی عمارت کے مختلف کمروں کے درمیان دیواریں گرائیں اور بڑی بڑی لیبارٹریز بنادیں ۔ لیبارٹریوں میں سامان بھی رکھ دیا۔دیواروں کے جائنٹس کو کمال ہوشیاری سے وال پیپرنگ اور پوسٹر کے ذریعے کور کرلیا۔ زمین پر چپکنے والا میٹ بچھا دیا تاکہ کوئی ثبوت نہ رہے کہ دفتری جگہوں میں کوئی تبدیلی کی گئی ۔ایک بڑا بورڈ روم ،اکیڈمک کونسل ہال ،سیمینار روم وغیرہ بنادیا گیا اور یہ کام اتنی تیزی سے ہوا کہ جب لوگ چھٹیوں سے تین چار دن بعد واپس آئے تو وہاں پر اتنی بڑی تبدیلی واقع ہوچکی تھی کہ سب حیران و پریشان تھے۔ بڑے پیمانے کی انکوائری ہوئی۔ہم نے اپنا کیس بہت اچھے طریقے سے پیش کیا۔ہمیں نیک نیتی کی بنیاد پر چھوٹ مل گئی اوراسطرح کام آگے بڑھ گیا۔

انسٹیٹیوٹ کی عمارت کو ہم نے پی ایم ڈی سی کے ضروریات کے مطابق آراستہ کرلیا۔ممکنہ فیکلٹی کو میں نے اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ صبح کوہاٹ آئیں اور میری طرح دو بجے یا اس سے پہلے اگر ضرورت محسوس کریں تو واپس چلے جائیں۔ پورا ہفتہ نہ آئیں صرف دو یا تین دن آئیں ۔ فارما کالوجی کے پروفیسر انور، پیتھالوجی کے پروفیسر عزیز، فارنزنک میڈیسن کے ڈاکٹر آغا امجد حسین جو فرنٹیئر میڈیکل کالج ایبٹ آباد میں اسسٹنٹ پروفیسر کی جاب چھوڑ کر ہمارے پاس آگئے تھے نے اپنے شعبے سنبھال کر انہیں بہتر بنانے لگے، چونکہ آغا کا تعلق ہنگو سے تھا۔اُن کے بھائی جو کہ صوبائی وزیر تھے پر خودکش حملہ ہوااور آغا امجد بھی چھوڑ کے واپس ایبٹ آباد جانے لگے۔ میں نے اُن سے ایک معاہدہ کرلیا کہ آپ بھلے ایبٹ آباد میں رہیں لیکن ایک لیکچرار منیر کو وہاں لے جا کر اتنی ٹریننگ دیں کہ وہ سٹوڈنٹس کو پڑھا سکیں اس کے بعد یہ کلاسیں شروع ہو گئی اور ڈپارٹمنٹس بھی بن گئے۔

کمیونٹی میڈیسن میں حیدرآباد سے ذوالفقار علی خشک ہمیں مل گئے تھے۔شروع میں تو ہم بہت

خوش ہوئے ۔جلد ہی ہمیں معلوم ہو گیا کہ وہ ادارے کے لئے کچھ زیادہ مناسب نہ تھے ۔پی ایم ڈی سی ہماری مجبوری تھی چنانچہ میں نے ایک نوجوان ڈاکٹر ذیشان اُن کے حوالے کر دیا پھر درحقیقت ذیشان نے بہت حد تک یہ ڈپارٹمنٹ چلایا۔اُس نے ایک نصاب بھی ترتیب دیا۔بعد میں اسے فل برائٹ سکالرشپ ملا اور وہ امریکہ سے پی ایچ ڈی کر کے آئے ۔آج کل رفاہ یونیورسٹی اور پشاور میڈیکل کالج سے منسلک ہیں ۔ان سب کی تنخواہیں بھی پرکشش تھیں اسی لئے انہوں نے مجھ پر اعتماد بھی کیا۔

ان کے علاوہ چند مزید اساتذہ کو ہم نے اسسٹنٹ پروفیسر تعینات کیا۔ان میں پتھالوجی کے لئے ڈاکٹر ممتاز اور ڈاکٹر احسان شامل تھے جو لوگ پہلے سے موجود تھے ان میں بشیر مروت فزیالوجی کے سربراہ رہے اور بائیوکیمسٹری کے ہیڈ وحید خان شامل تھے۔ڈاکٹر فرمان اللہ وزیر جو ایوب میڈیکل کالج میں میرے طالب علم بھی رہے تھے نے کوہاٹ انسٹی ٹیوٹ جوائن کرنے کے بعد فزیالوجی ہیڈ آف ڈپارٹمنٹ کے طور پر کام کرتے رہے۔اناٹومی ڈاکٹر صاحب خان کے پاس رہا۔اُن کے ساتھ ہم نے ایک اور ایف آر سی ایس ڈاکٹر سہیل کو اسسٹنٹ پروفیسر لگا دیا جن سے یہ طے ہوا کہ آپ اپنی پرائیویٹ پریکٹس بھی کرتے رہیں ۔صاحب خان بھی ایک سرجن تھے اور اُنہیں بھی میں نے قانون کے مطابق اجازت دی کہ وہ اپنی سرجری شام کو کریں اور دن میں میڈیکل کالج کا شعبہ اناٹومی چلائیں ۔پہلے سے موجود لائبریری کو ہم نے ڈیجیٹل لائبریری میں تبدیل کر دیا۔اس کے بعد کلاسیں شروع کیں ۔ٹیچر ٹریننگ کے سلسلے میں ہمیں بڑی کامیابی ہوئی۔

میں نے اپنی میڈیکل ایجوکیشن کی کل مہارت استعمال کی اور بہت سارے ٹیچرز کو تربیت دی۔جنہوں نے طلباء کو بڑے اچھے ٹیکنیکی طریقے سے پڑھانا شروع کیا۔طلباء میں ہم سے بھی زیادہ جذبہ تھا۔ چونکہ کالج پی ایم اینڈ ڈی سی سے منظور شدہ نہ تھا اس لئے انہیں اپنا مستقبل تاریک نظر آ رہا تھا۔ہم نے انہیں کہا کہ کہ اگر وہ اچھے طریقے سے پڑھیں گے۔تو پی ایم ڈی سی انسپکشن کے موقع پر کالج کی باضابطہ

منظوری میں کوئی مشکل نہیں ہوگی۔ ہمارا یہ بھی کہنا تھا کہ نصابی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ غیر نصابی خاص طور پر کھیلوں کی سرگرمیاں بھی ہمیں فائدہ پہنچائیں گی۔ بہت سے طلباء سمجھتے رہے کہ پی ایم ڈی سی کی انسپکشن ٹیم اُن سے امتحان بھی لے گی۔ ہم نے کلینکل سائنس میں 28،29 فیکلٹی کو لے لیا ہمارے لئے یہ موقع انتہائی اہم تھا۔ میڈیکل سپرٹنڈنٹس ناراض ہو گئے انہوں نے مخالفت میں اسے ذاتی مسئلے کے طور پر بھی لے لیا۔ وہیں یہ مشکل پڑھ گئی کہ ڈسٹرکٹ سپیشلسٹ کی سیٹیں خالی پڑی تھیں جس کے لئے ان کا خیال تھا کہ ڈسٹرکٹ سپیشلسٹ دوبارہ اور منگوائے جائیں کیونکہ موجودہ ڈسٹرکٹ سپشلسٹ جو کہ فیکلٹی بن گئے ہیں۔ ان کو وارڈوں سے آؤٹ کر دیا جائے یہ غیر مناسب بات تھی۔ اس کیلئے بھی خاصی محنت اور تگ ودو کے بعد ہم نے مختلف وارڈ قائم کر کے ایک برابری کا نظام قائم کیا تا کہ موجودہ فیکلٹی ہی ان وارڈوں کو چلاتی رہے۔ ڈاکٹر سلیم خان جو گومل میڈیکل کالج سے ہمارے ساتھ شامل ہو گئے تھے کو پروفیسر آف سرجری تعینات کیا گیا وہ میرے بعد کئی سال تک پرنسپل کوہاٹ انسٹیٹیوٹ آف میڈیکل سائنسز رہے۔ ان کے بعد ڈاکٹر لال محمد آئی سپشلسٹ پرنسپل بنے انہیں ان کی کارکردگی کی وجہ سے پرو وائس چانسلر بھی بنا دیا گیا۔ موجودہ پرنسپل پروفیسر ڈاکٹر مسرت جبین ایک انتہائی محنتی اور مخلص فیکلٹی رہی ہیں۔ انہوں نے بہت کم عرصے میں کالج کی نئی بلڈنگ کا افتتاح کروا کر سال اول کو اس بلڈنگ میں شفٹ کر دیا۔

ان تمام لوگوں کے تعاون سے ہم نے بہت ہی پرسکون اور آرام دہ ماحول رکھا میں نے ایک ٹیبل ٹینس کے لئے ٹیبل منگوا کر پتھالوجی ڈپارٹمنٹ جو نرسنگ کمپاؤنڈ میں تھا میں رکھوادی اور یوں فیکلٹی کیلئے کھیلوں کا بندوبست کیا۔ دن گیارہ بجے وقفے میں ساری فیکلٹی اکھٹی ہو جاتی، گپ شپ لگتی اور ٹیبل ٹینس بھی کھیلتے۔ ہیڈ آف پیتھالوجی ڈاکٹر پروفیسر عزیز الرحمن بظاہر کھیل کود سے دل چسپی نہیں رکھتے تھے۔ انہوں نے جب میرے ساتھ ٹیبل ٹینس کھیلنا شروع کیا تو حیرت ہوئی کہ وہ تو ایک بہت ماہر ٹیبل ٹینس کھلاڑی نکلے بلکہ انہوں نے کئی بار مجھے ہرایا۔ کالج سے متصل ایک چھوٹا سا مٹی بھرا میدان تھا جسے ہم نے سرسبز بنا

کرفٹ بال گراؤنڈ و بیڈمنٹن کورٹ وغیرہ کیلئے طلباء کے استعمال میں دے دیا۔

میں اور دیگر ٹیچر دو بجے یا کئی بار اس سے بھی پہلے سیکیورٹی رسک کی بناء پر اپنی اپنی گاڑیوں میں کوہاٹ سے پشاور روانہ ہو جاتے۔ اس دوران میں صبح پشاور سے آتا اور دوپہر کے بعد واپس جاتا۔ راستہ طالبان اور بدامنی کی وجہ سے غیر محفوظ تھا۔ مجھے صبح کوہاٹ پہنچنے پر اپنے بھائی ڈاکٹر خالد مفتی کو اطلاع دینا پڑتی کہ میں خیریت سے پہنچ گیا ہوں اور واپس بھی جب میں پشاور کی حدود میں داخل ہوتا تو انہیں اطلاع دیتا کہ اب میں بڈھ بیر سے آگے آ گیا ہوں۔ اس دوران درہ آدم خیل میں کئی بار ہمارے اردگرد طالبان قسم کے لوگ کلاشنکوفیں لہراتے اور ہماری گاڑی کے قریب سے گذرتے۔ دل دہشت کے مارے دہک جاتا۔ میرا ڈرائیور نصرت بہادری کا ثبوت دیتا اور بظاہر بالکل گھبراتا نہیں تھا۔ ایک بار جب ہم ایک اچانک حملہ (Ambush) میں پھنس گئے۔ کراس فائرنگ ہو رہی تھی۔ ڈرائیور نصرت نے کمال ہوشیاری سے گاڑی مین روڈ سے ہٹا کر گاؤں کے اندر واقع گہرے کھیتوں میں گرا دی اور ہم کافی دیر سر نیچے کئے دبکے رہے اور جب صورت حال بہتر ہوئی تو بڑی مشکل سے لوگوں کی مدد سے گاڑی کھیتوں سے نکالی۔ کچے راستوں سے ہو کر سڑک پر آئے اور واپس پشاور پہنچے۔ اور اس طرح ایک مجاہدانہ جذبے سے KIMS کوہاٹ کا معاملہ آگے چلتا رہا۔

ہم نے پی ایم ڈی سی رجسٹریشن کے لئے استدعا کر رکھی تھی جس کے باعث ان کی انسپکشن ٹیم نے کالج کا دورہ کیا اور ہمارے کام کو سراہا۔ وائس چانسلر میاں لطف اللہ جان دوران انسپکشن مسلسل کالج ایڈمنسٹریشن دفتر میں موجود رہے۔ مجھے کالج جوائن کئے آٹھ ماہ ہو چکے تھے میری بھی کوشش اور خواہش تھی کہ جلد از جلد کالج کو رجسٹریشن مل جائے۔ جلد ہی پی ایم ڈی سی اور حکومت پاکستان کی طرف سے کالج کو رجسٹریشن کا پروانہ مل گیا۔ یہ ایک بہت بڑی کامیابی تھی بڑی خوشیاں منائی گئیں۔

چونکہ میں میڈیکل جرنلزم کے حوالے سے پہلے ہی جنرل آف ایوب میڈیکل کالج کا چیف

ایڈیٹر رہ چکا تھا۔ میرے دماغ میں سمایا کہ ایک میڈیکل جرنل کا کوہاٹ انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنسز سے اجراء کیا جائے۔ ہمارا ادارہ کوہاٹ یونیورسٹی آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی کا حصہ تھا۔ لہذا KUST میڈیکل جرنل کے نام سے ایک رسالے کی تجویز پیش کی۔ وائس چانسلر لطف اللہ کا کاخیل نے اس پر انتہائی خوشی کا اظہار کیا۔ ہم نے ایک نوجوان میڈیکل سپیشلسٹ ڈاکٹر اختر شیرین جو میڈیسن میں اسسٹنٹ پروفیسر اور پریکٹس کے زیادہ شوقین نہیں تھے کو راضی کیا کہ وہ مینجنگ ایڈیٹر بنیں۔ ان کے پاس وقت تھا اور وہ ذہین بھی تھے۔ انہوں نے رسالے کی اشاعت کے تمام مراحل میں بڑی جانفشانی سے خدمات انجام دیں۔ وائس چانسلر انفارمیشن ٹیکنالوجی کے بڑے شوقین اور خود ماہر بھی تھے۔ انہوں نے اس سلسلے میں مدد کرتے ہوئے رسالے کی اشاعت کے علاوہ OJS کے پلیٹ فارم پر آن لائن بھی شائع کروایا۔ یہ رسالہ ہمارے خیال میں پاکستان کا پہلا آن لائن میڈیکل جرنل ہے۔ پتہ نہیں کہ تاریخ میں یہ کیسے رقم ہوگا بہرحال میں اس کا پہلا چیف ایڈیٹر اور ڈاکٹر اختر شیرین ایڈیٹر بنے۔ پہلے دو شمارے میری ہی نگرانی میں شائع ہوئے اور اس کے بعد میں نے اس ادارے کو الوداع کہہ دیا۔

یہ رسالہ ترقی کرتے ہوئے خیبر میڈیکل یونیورسٹی کا جرنل بن چکا ہے اور اس کے ایڈیٹر اختر شیرین ترقی کی منازل طے کرتے ہوئے پاکستان میڈیکل ایڈیٹرز ایسوسی ایشن کے صدر بھی بن گئے اور JAMA کے پاکستان کی جانب سے ایڈیٹوریل ممبر بھی ہیں۔ آج کل بھی ایک انتہائی فعال کردار ادا کر رہے ہیں اور مجھے انہیں دیکھ کر ہمیشہ خوشی ہوتی ہے۔ بہت عرصہ گزر جانے کے بعد PAME کی چوتھی سالانہ کانفرنس جو خیبر میڈیکل یونیورسٹی میں منعقد ہوئی کے موقع پر اختر شیرین نے خیبر میڈیکل یونی ورسٹی جرنل کی دس سالہ تقریب میں ڈاکٹر لطف اللہ اور مجھے بطور مہمان خصوصی بلوا کر اعزاز بخشا۔ اس طرح ہماری خدمات کو نہ صرف یاد رکھا گیا بلکہ ہماری عزت افزائی بھی کی گئی جس کے لئے بلاشبہ میں اختر شیرین کا خاص طور پر مشکور ہوں۔ کوہاٹ چھوڑنے کے بعد ایک بار 16 - 2015ء اور 2023ء میں مجھے

مہمان خصوصی کی حیثیت سے KIMS کوہاٹ بھی مدعو کیا گیا اور شاندار استقبال کیا گیا جس سے یہ احساس پیدا ہوا کہ وہ کالج ابھی تک میرا کالج ہے۔

فاونڈر پرنسپل و پراجیکٹ ڈائریکٹر۔رحمان میڈیکل کالج:۔

پروفیسر ڈاکٹر رحمان اور ڈاکٹر طارق نشتر کی خواہش پر میں نے یکم اپریل 2009ء کو کنسلٹنٹ اور ہیڈ آف سرجری کے طور پر پشاور کے حیات آباد میں قائم رحمان میڈیکل انسٹی ٹیوٹ جو آر ایم آئی کے نام سے شہرت رکھتا ہے جوائن کرلیا۔نومبر 2009ء میں چیئرمین آر ایم آئی پروفیسر ڈاکٹر رحمان نے مجھے یہ تجویز پیش کی کہ کیوں نہ رحمان میڈیکل کالج شروع کیا جائے یہ ایک اچھی تجویز تھی جسے میں نے قبول کرتے ہوئے حامی بھرلی ۔سرجری ڈپارٹمنٹ کی سربراہی کے علاوہ اب پراجیکٹ ڈائریکٹر رحمان میڈیکل کالج کی ذمہ داری بھی میرے کندھوں پر آ گئی۔میرے لئے یہ ایک اعزاز اور بھاری زمہ داری تھی ۔اُس وقت کالج کی بلڈنگ بن رہی تھی ۔ انفرسٹرکچر کھڑا ہو گیا تھا۔البتہ بہت کام باقی تھا۔ پروفیسر ڈاکٹر طارق نشتر جو میرے اور رحمان صاحب کے سینئر تھے اور ہم اُن کی بڑی عزت کرتے تھے کے مشورے سے ایک سٹیئرنگ کمیٹی بنائی گئی جس کی سربراہی پروفیسر ڈاکٹر طارق نشتر کرتے،اس سلسلے میں تین چار میٹنگز 2009 میں ہوئیں۔جن میں ہم نے طے کیا کہ کالج کو کس طریقے سے شروع کیا جائے اور طریقہ تعلیم کیا ہو چونکہ کوہاٹ،ایبٹ آباد اور عالمی ادارہ صحت کے حوالے سے میرا تدریسی تجربہ خاصا تھا۔ میں ایک تعلیم کے حوالے سے ادارے کے لئے ایک نیا اَنداز اپنانا چاہتا تھا جبکہ کمیٹی کے دیگر ارکان اس بارے میں ہچکچا رہے تھے۔ بہت بحث و مباحثہ اور مشوروں کے بعد میری بات مان لی گئی۔یہ طے پایا کہ سو طلباء کیلئے کالج کو پی ایم ڈی سی سے الحاق کیلئے تیاریاں کی جائیں۔

پراجیکٹ ڈائریکٹر کی حیثیت سے پہلی دشواری اس وقت پیش آئی جب میں نے دفتر کیلئے جگہ مانگی۔معلوم ہوا کہ آر ایم آئی میں کوئی ایسی جگہ ہی نہیں ہے کہ جہاں پر ایک دفتر قائم کرسکوں۔مجھے یہ کہا

گیا کہ آپ جائیں کوئی خالی کمرہ اپنے لئے دیکھیں ۔ میں گھوما پھرا۔ کوئی جگہ نہ ملی ۔ آر ایم آئی کی چوتھی منزل پر پوسٹ گریجویٹ کے ڈینز کی بیٹھنے کی جگہ عارضی طور پر بنائی گئی تھی ۔جس میں پوسٹ گریجویٹ ڈین پروفیسر ڈاکٹر صاحبزادہ وحید بیٹھا کرتے تھے اُن کے برابر والے کمرے میں انڈر گریجویٹ ڈین ڈاکٹر شیر محمد خان، اُن کے پی ۔اے اُسامہ نے مجھے بتایا کہ ایک چھوٹا سا سٹور نما کمرہ یہاں موجود ہے جس میں پرانے کمپیوٹر اور سپیئر پارٹس پڑے ہیں میں نے وہ سٹور کھلوایا جو کمپیوٹر کے سامان سے بھرا پرا تھا۔ اسے خالی کروانے کے لئے متعلقہ شعبے سے بات کی لیکن میری درخواست رد کر دی گئی اس کی وجہ بھی مناسب تھی کہ ان کے پاس سامان رکھنے کی کوئی اور جگہ نہ تھی ۔ میں نے ڈائریکٹر ایڈمن کرنل طارق سے بات کی ۔ وہ دیکھنے آئے اور ہنستے ہوئے کہنے لگے یہ جگہ تو سرے سے بیٹھنے کے قابل ہی نہیں میں نے کہا۔ مجھے یہ بھی قبول ہے ورنہ کوئی دوسری جگہ دے دیں ۔ دوسری جگہ تو تھی ہی نہیں اور ان کو اچھی طرح اس کا پتہ تھا۔ لہٰذا انہوں نے آئی ٹی ڈپارٹمنٹ سے کہہ کر یہ کمرہ خالی کروا دیا۔ اور مینیجر عارف سے کہا کہ بھئی جو مفتی صاحب کو چاہیئے اُس میں لگا دیں ۔ بڑی مشکل سے رنگ و روغن کر کے اُس میں ایک میز اور کرسی اور میں نے لائبریری سے نکلوا کر ایک الماری بھی اُس میں لگا دی۔

اگلا مرحلہ اس سے بھی مشکل تھا۔ جب میں نے ایک آفس اسسٹنٹ مانگا تو مجھے کہا گیا کہ آپ اپنے مرضی سے کہیں سے ڈھونڈ کر آفس اسسٹنٹ بھرتی کروالیں ۔ اب یہ بات بذات خود اس لئے مشکل تھی کہ آفس اسسٹنٹ کہاں سے تلاش کروں؟ میں نے مینیجر ایچ آر سے کہا کہ وہ یہ کام خود ہی کریں اور میرے لئے اسسٹنٹ کا بندوبست کریں تا کہ کام شروع کروں ۔ آیاز خلیل نے مہربانی کی اور ایک خاتون کا بندوبست کر دیا مجھے لگا کہ وہ خاتون جس کا نام عنبرین آراء تھا شاید پہلی تعیناتی پر خوش نہیں تھیں بہر حال کام چلانا تھا۔ چونکہ دفتر میں ایک ہی کرسی تھی لہذا انہیں بٹھا دیا! میں سمجھا کہ چلو ایک اچھی اسسٹنٹ مل گئی ہے کام شروع کیا جائے ساتھ ہی ڈکٹیشن دینا شروع کر دی۔

جلد ہی مجھے پتہ چل گیا کہ محترمہ انگریزی میں دسترس نہیں رکھتیں۔اس کے باوجود ہم نے مل کر کام آگے بڑھانے کا فیصلہ کیا۔ اگلے دن یکم جنوری 2010ء سے باضابطہ کام شروع کیا تو اس طرح میں رحمان میڈیکل کالج کی بنیاد یکم جنوری 2010ء سے شمار کرتا ہوں۔ چند روز میں ہی مس عنبرین اور میرے درمیان ذہنی ہم آہنگی ہوگئی۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ اُن کا یہ تیسرا تبادلہ تھا اور منیجر ہیومن ریسورس ایاز خلیل نے بتا دیا تھا کہ اب ہم نے محترمہ کو رحمان میڈیکل کالج کے کھاتے میں ڈال دیا ہے اب آپ جانیں اور یہ جانیں۔مطلب یہ کہ دوسرا کوئی سٹاف نہیں مل سکتا۔ میں نے بھی اس پر اکتفا کرتے ہوئے آگے بڑھنے کا فیصلہ کیا اور یوں یہ سلسلہ چل نکلا۔

جوں جوں کام بڑھنے لگا مزید سٹاف کی ضرورت پیش آنے لگی دوسری طرف فنانشل ایڈوئزر نے بھی واضح طور پر کہہ دیا کہ وہ مزید سٹاف فراہم کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔میرے گھر کے قریب ایک حافظ قرآن فرہاد نامی لڑکا رہتا تھا جس نے اُس وقت میٹرک یا ایف اے کیا تھا۔ میں نے اسے اپنا کمپیوٹر بھی دیا تھا تا کہ اسے استعمال کرنا سیکھ سکے۔اس کے دو بھائی تعمیرات میں مزدوری کیا کرتے تھے۔اسے بھی نوکری چاہیئے تھی۔ میں نے موقع غنیمت جانا اور اُسے آفس بوائے کے طور پر لے آیا۔وہ جلد ہی ہمارا ایک سہارا بن گیا۔دفتری کام کرنے کا ماہر ہوگیا ساتھ میں ہمارے لئے چائے بھی لاتا۔ کچھ عرصہ گزرنے کے بعد فرہاد کو آفس بوائے کی پکی نوکری مل گئی۔ بہت محنتی نوجوان تھا اور بعد میں ترقی کر کے آفس اسسٹنٹ بن گیا ایم اے بھی کرلیا اور کئی سال بعد نارتھ ویسٹ میڈیکل کالج میں اسے اچھی تنخواہ پر ملازمت بھی مل گئی۔اسی طرح ڈین آفس کے اسسٹنٹ اُسامہ نے شروع میں ہماری بہت مدد کی۔یوں ہم کام کو آگے بڑھاتے رہے۔اگلے چند ماہ شدید محنت کے تھے۔سٹاف کی مزید ضرورت تھی۔عمیر یا یاسر نامی ایک نوجوان بھی بطور آفس اسسٹنٹ میرے ساتھ رہا، فنانس منیجر سہیل نے ایک دن مجھے صوابی سے تعلق رکھنے والے ایک نوجوان شفقت اعظم خان سے ملوایا جو آٹھ سال امریکہ میں مقیم رہا تھا۔

ایم بی اے فنانس کیا ہوا تھا۔فنانس ڈپارٹمنٹ میں اس کیلئے کوئی پوسٹ نہیں تھی میں نے انہیں خوشی سے قبول کرلیا۔ میں نے ان کو پہلے دن سے کالج کی پالیسی اور پروٹوکول بنانے کا کام حوالے کر دیا۔ہمیں رولز، ریگولیشنز اورایس او پیز بنانا تھے۔شفقت کوانٹرنیٹ استعمال کرنا بھی آتا تھا۔وہ ایک انتہائی لگن اور محنت کرنے والانوجوان ثابت ہوااورصبح سے رات نو دس بجے تک میرے ساتھ رہتا۔آخر کار ہم نے کالج کی پالیسی، پروسیجر و پروٹوکول کو کتابی صورت میں اُس وقت چھاپ دیا جب کہ ابھی کالج شروع بھی نہیں ہوا تھا۔مشکل یہ تھی کہ پرانے ریکارڈ سے کوئی دستاویز ہمیں میسر نہیں تھی۔

درحقیقت 2002ء میں آر ایم آئی ہسپتال شروع ہوا تو اسی وقت میڈیکل کالج کھولنے کیلئے بھی سوچا گیا تب سے لے کر میرے آنے تک کم از کم دو یا تین پراجیکٹ ڈائریکٹر تعینات کئے گئے جن میں ایک ریٹائرڈ ہیلتھ سیکریٹری ڈاکٹر ناصر الملک اور دوسرے پروفیسر عنایت الرحمن خلیل جو بہت ہی تجربہ کار میڈیکل اساتذہ میں شمار ہوتے ہیں شامل تھے۔ انہوں نے پی ایم ڈی سی اور دیگر اداروں سے خط وکتابت تو ضرور کی ہوگی لیکن ہمیں اس کا کوئی ریکارڈ نہ ملا۔اس حوالے سے بہت سارے کاغذات کہا ں گئے یہ سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ڈائریکٹر ایڈمن سے بات کی انہوں نے ایک فائل کہیں سے نکلوا کر ہمیں بھجوا دی۔اس میں چند کاغذات تھے۔بڑی مشکل سے پی ایم ڈی سی اور حکومتی اداروں سے پرانے تعلقات کو جوڑا اور بات آگے بڑھی۔اس دوران پی ایم ڈی سی سے مذاکرات اور صوبائی حکومت کے محکمہ صحت کے حکام سے بات چیت کا سلسلہ بھی چل نکلا۔

فیکلٹی ڈھونڈنا ایک انتہائی مشکل کام تھا۔جب میں نے میڈیکل کالج کی حامی بھری تو اُس وقت سے میں نے یہ سوچنا شروع کر دیا تھا کہ میرے ساتھ ایک اور ایسا ساتھی ہونا چاہیئے جو کہ ڈسپلن کے معاملات کو سنبھال سکے۔میرے بھائی ڈاکٹر خالد مفتی نے مجھے مشورہ دیا کہ ایک پروفیسر جمیل الرحمن جو ریٹائرمنٹ کے قریب ہیں اور خیبر میڈیکل کالج میں بائیوکیمسٹری ڈپارٹمنٹ کے ہیڈ ہیں ان سے رابطہ

کروں ۔ان کا خیال تھا کہ وہ ایک انتہائی فعال اور کالج کا ڈسپلن سنبھال لیں گے۔ میں انہیں تھوڑا بہت جانتا تھا۔ایک آدھ ملاقات غالباً ہوئی ہوگی ۔ان کے بھائی ڈاکٹر غفور کو جو ڈسٹرکٹ ہیلتھ آفیسر تھے سے شناسائی ضرور تھی ۔ بہر حال جب میں نے مزید معلومات حاصل کیں تو پتہ چلا کہ جمیل الرحمن اپنے ڈپارٹمنٹ میں خاصے مقبول تھے۔ٹیچر کمیونٹی میں ایک مضبوط لیڈر کے طور پر جانے جاتے تھے۔ جب وہ خیبر میڈیکل یونیورسٹی میں مختلف میڈیکل کالجوں کے ضم ہونے کے خلاف مہم چلا رہے تھے۔اس سلسلے میں چند بار ایوب میڈیکل کالج آئے تھے وہاں اساتذہ کو جمع کر کے تقریب منعقد کی ۔اسی اثناء جب میں ہفتہ وار چھٹیوں پر ایبٹ آباد اپنے گھر جا رہا تھا۔تو ٹیلی فون پر ان سے رابطہ ہوا۔ میں نے پوچھا کہاں ہیں؟ انہوں نے کہا کہ میں ایبٹ آباد جا رہا ہوں ،حویلیاں کے قریب ہوں ۔ میں نے کہا اچھا میں بھی قریب ہوں۔کیا یہ ممکن ہے کہ ملاقات ہو جائے انہوں نے رات کا کھانا میرے گھر 77۔جناح آباد پر کھایا۔اور ہم نے اُس کھانے کے بہانے بہت ساری باتیں کیں اور معاملات طے کئے۔ میں نے انہیں صاف صاف بتا دیا کہ میں انہیں جانتا نہیں ہوں لیکن یہ ضرور معلوم ہے کہ آپ ایک اصول پسند شخصیت ہیں ۔میری خواہش ہے کہ آپ بھی رحمان میڈیکل کالج جوائن کر لیں انہوں نے بتایا کہ فی الحال تو وہ ملازمت کر رہے ہیں ملازمت کے بعد ضرور آ جائیں گے۔ میں نے واپس آ کر رحمان صاحب کو بتایا تو وہ کہنے لگے یار یہ کیا کر رہے ہو وہ تو ایک سیاسی آدمی تھے جنہوں نے حال میں ہی خیبر میڈیکل یونی ورسٹی کا دھڑن تختہ کر دیا ہے اور ممکن ہے کہ ہمیں بھی یہ مشکلات میں ڈال دے۔ میں نے کہا مجھے ایک مضبوط ساتھی کی ضرورت ہے اور وہ ہمیں کسی مشکل میں نہیں ڈالیں گے۔ڈاکٹر رحمان میرا جواب سن کر مسکرائے اور کہنے لگے کہ جیسے مرضی کر لو۔ان کے اس اعتماد کو میں اور جمیل الرحمان آج تک قائم رکھے ہوئے ہیں۔

ان کے علاوہ باقی فیکلٹی کو تعینات کر دیا گیا چند لوگوں پر انتظامیہ کے تحفظات تھے لیکن ہماری مجبوری تھی ۔پی ایم ڈی سی کی شرائط پر عمل درآمد کے لئے جونیئرز کو بھی ترقی دے کر سینئرز کے عہدوں پر

فائز کر دیا گیا۔ جون 2010ء تک ہمارے پاس فیکلٹی تقریباً مکمل ہو چکی تھی۔ کلینکل فیکلٹی اسسٹنٹ پروفیسر بننے پر راضی نہیں تھی۔ بہت مشکل سے قانونی نکتہ سمجھایا اور یکم جون سے اُن کے آرڈر نکلوائے۔ جون اسی سال پی ایم ڈی سی کو فیکلٹی رجسٹریشن کی فہرست بھجوائی۔ یوں فیکلٹی کا مسئلہ حل ہوا جو لوگ پہلے سے سروس میں تھے ان کیلئے نئے تعیناتی خط جاری کئے گئے۔ اور بعض کیلئے علیحدہ نیا کنٹریکٹ جاری کیا گیا۔ بہت سے لوگوں کو حیرت ہوئی کہ کس تیزی سے ہم نے یہ فیکلٹی جمع کر لی۔ مجھے پروفیسر اے جے خان اور بہت سارے دیگر دوستوں نے پوچھا کہ فیکلٹی کیسے جمع کی۔ فیکلٹی تو میں نے کوہاٹ انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنسز کیلئے بھی جمع کی تھی، رحمان صاحب سے کہا کہ ہمیں کوئی فیکلٹی اُس وقت تک نہیں ملے گی جب تک یہ کالج غیر مصدقہ ہے۔ مزید یہ کہ آر ایم آئی کی شہرت کام کے لحاظ سے سخت گیر ہے اور مارکیٹ میں فیکلٹی بھی موجود نہیں۔ لہٰذا ہم نے فیصلہ کیا کہ فیکلٹی کی تنخواہیں دوسرے کالجوں کی نسبت دو سے تین گنا کر دیں اگرچہ یہ ایک بڑا معاشی بوجھ تھا لیکن رحمان صاحب نے اسے خوش دلی کے ساتھ قبول کر لیا نتیجتاً لوگ بعد میں خود آ کر ہم سے فیکلٹی پوزیشن مانگتے رہے۔ الحمد للہ یہ کام بڑے اچھے طریقے سے ہو گیا۔ شروع دن سے میرے ذہن میں جو نصابی نقشہ تھا اُس سے پروفیسر رحمان صاحب اور پروفیسر طارق نشتر نے اتفاق کیا۔ پرائیویٹ کالجوں نے تحفظات ڈاکٹر رحمان کے سامنے رکھے لیکن انہوں نے صرف میری حمایت کی۔ مزید یہ کہ مربوط نصابی سرگرمیوں کے بارے ہم نے ایک کمیٹی پروفیسر طارق نشتر کی سربراہی میں بنائی۔ جس میں، میں وقتاً فوقتاً پریزنٹیشن و بریفنگ دیا کرتا تھا۔

ڈاکٹر طارق نشتر کی ایک اپنی سوچ تھی اور ان کے خیال میں روایتی سسٹم کو قائم رہنا چاہئیے لیکن میری سوچ ان سے مختلف تھی اور میں نصابی نظام کو جدید تقاضوں سے ہم آہنگ رکھنے کے حق میں تھا، بعد میں جب ہم نے یہ نظام جاری کر دیا۔ تو ڈاکٹر طارق نشتر نے بھی مان لیا کہ واقعی یہ طریقہ تعلیم اچھا ہے۔ میرا نظریہ تھا کہ کالج کے اندر ایک انتہائی فعال تحقیقاتی کا ادارہ ہو اور وہ ہمارے طلباء کے اندر تحقیقاتی کلچر کو فروغ دے۔

ڈاکٹر افتخار قیوم جو ریسرچ میں کافی عرصہ ایوب میڈیکل کالج میں بھی میرے معاون رہے تھے۔انہوں نے چار سال تک امریکہ میں Pathology Residency کی اور بغیر امتحان دیئے وہاں سے اس لئے آگئے کہ اُس زمانے میں پاکستان میں ملٹری سروس لازم تھی۔ان کے والد بریگیڈیئر قیوم کو اطلاع دی گئی کہ اُن کا بیٹا فوج کی لازمی سروس کئے بغیر ملک چھوڑ گیا ہے۔روایتی فوجی ہونے کی بناء پر انہوں نے اپنے بیٹے سے بات کی اور انہیں واپس بلالیا۔انہیں یہ بھی کہا کہ فوج کی لازمی سروس کے بعد دوبارہ واپس لوٹ جانا لیکن بوجوہ وہ ایسا نہ کر سکے اور ایوب میڈیکل کالج اناٹومی ڈیپارٹمنٹ میں ہسٹالوجی پڑھانے لگے۔ بعد میں پتھالوجی ڈیپارٹمنٹ منتقل ہوگئے جہاں انہیں علیحدہ ریسرچ لیبارٹری کے لیئے جگہ دے دی گئی۔اُن سے شناسائی کے نتیجاً تاً میں انہیں جنرل آف ایوب میڈیکل کالج کے ایڈیٹوریل میں لے آیا۔ان کی دوستی ریسرچ ڈیپارٹمنٹ کے جہانگیر صاحب سے بھی اچھی خاصی ہوگئی اور کام چلتا رہا۔ایوب میڈیکل کالج میں ایک واقعہ کے بعد جب ان کا تبادلہ کیا گیا تو انہوں نے اس فیصلے کو قبول نہیں کیا اور کچھ عرصے بعد انہوں نے ملازمت چھوڑ کر وومن میڈیکل کالج میں بطور ریسرچ انچارج کام کرنے لگے۔میں انہیں رحمان میڈیکل کالج لے آیا۔یوں ہم نے رحمان میڈیکل کالج میں تمام شعبوں سے قبل ریسرچ ڈیپارٹمنٹ شروع کر دیا۔اس ڈیپارٹمنٹ کا نام ڈی ایم آر رکھا گیا اور انہیں ڈائریکٹر میڈیکل ریسرچ بنا دیا گیا۔وہ انتہائی پرعزم اور بہت ہی قابل ریسرچر ہیں اور بہت اچھی انگریزی بولتے لکھتے ہیں مزید یہ کہ جو ٹاسک بھی دیا جائے انکار نہیں کرتے۔میں نے انہیں قائم مقام ڈائریکٹر میڈیکل ایجوکیشن کی ذمہ داری بھی سونپی جو آج تک بخوبی نبھا رہے ہیں۔

قاضی محمد یوسف رحمان میڈیکل کالج میں سب سے پہلی سینئر فیکلٹی تھے جو فزیالوجی ڈیپارٹمنٹ کے پہلے سربراہ مقرر ہوئے۔وہ خیبر میڈیکل کالج میں کچھ عرصہ میرے اُستاد بھی رہ چکے تھے۔اناٹومی میں ڈاکٹر احسان جنہیں میں بچپن سے جانتا تھا سے رابطہ کیا۔ وہ پاک انٹرنیشنل میں کام کررہے تھے۔میرے

کہنے پر فوراً آ گئے۔ اور قاضی یوسف کے بعد دوسری فیکلٹی تھے۔ اُنہوں نے شروع میں اناٹومی کا شعبہ بطور ایسوسی ایٹ پروفیسر اُس وقت تک سنبھالے رکھا جب تک ڈاکٹر پروفیسر ریاض نے بطور ہیڈ آف ڈپارٹمنٹ میں شمولیت اختیار نہ کر لی۔ فارما کالوجی میں ڈاکٹر عبدالجلیل پوپلزئی، کمیونٹی میڈیسن میں ڈاکٹر راشد اقبال، فارنزک میڈیسن میں ڈاکٹر میاں مجاہد، پتھالوجی میں پروفیسر فضل احمد اور فزیالوجی میں ڈاکٹر وقاص حمید ایسوسی ایٹ پروفیسر کے طور ہمارے ساتھ شامل ہو گئے۔ بعد میں پروفیسر جمیل الرحمن نے بائیوکیمسٹری ڈپارٹمنٹ کے سربراہ کی حیثیت سے جوائن کیا۔ بائیوکیمسٹری ہی میں دو لوگ ڈاکٹر موجد بطور ایسوسی ایٹ پروفیسر اور ڈاکٹر نقیب اسسٹنٹ پروفیسر تھے۔ ڈاکٹر موجد کچھ عرصہ بعد سعودی عرب چلے گئے اور ڈاکٹر وقاص حمید جن کا کسی معاملے پر اختلاف ہوا استعفیٰ دے کے چلے گئے۔ ڈاکٹر نقیب بھی غالباً کوئٹہ چلے گئے۔ ان تمام صاحبان نے احسن طور خدمات انجام دیں۔ ڈاکٹر موجد اور ڈاکٹر وقاص حمید نصاب کی تیاری کے حوالے سے بہت فعال تھے۔

اکیڈیمک فلور میں چوتھی منزل پر سکول آف نرسنگ تھا۔ اس کے اندر ایک بورڈ روم تھا۔ اتفاق سے میڈم پروین جو ایبٹ آباد میں میرے ساتھ نرس رہ چکی تھیں سرکاری ملازمت سے فارغ ہو کر اب رحمان سکول آف نرسنگ میں بطور پرنسپل کام کر رہی تھیں۔ انہوں نے مجھ سے بہت تعاون کیا اور ہمیں بورڈ روم بیٹھنے کیلئے دے دیا یہاں ہم بیٹھ کر روز مختلف علمی موضوعات پر بحث کرتے۔ پہلی اکیڈیمک کونسل کا اجلاس ہم نے ماہ اپریل 2010ء میں یہیں منعقد کیا۔ اگرچہ یہ میٹنگ نجی سطح کی تھی مگر اس نے ماہانہ میٹنگ کی بنیاد رکھ دی جو اب تک جاری ہیں۔ پی ایم ڈی سی کے انسپکشن کیلئے ہم نے تیاری شروع کر دی۔ موجودہ بلڈنگ میں ہمیں پانچ فلور دستیاب تھے۔ ہم نے تیزی سے ان فلورز کو تیار کیا۔ ایک بڑی پیچیدگی یہ آ گئی۔ کہ لیکچر ہال کی چھت دس فٹ پر تھی۔ یہ ایک تکنیکی غلطی تھی کیونکہ اس میں درجہ وار بلندی کی نشستیں نہیں لگ سکتی تھیں جس کے بغیر سامنے کی سکرین روم میں سب سے پیچھے بیٹھے طلباء کو نظر نہیں آ سکتی

تھی۔ بڑی مشکل سے عارضی حل نکالا جو ابھی تک اُسی طرح چل رہا ہے۔ہم نے سٹیج کے اُوپر چھتیں دو دو فٹ اُوپر کروادیں۔ ایسا کرنا بڑا مشکل تھا۔ پراجیکٹ ڈائریکٹر انجینئر فضل ستار جو ایوب میڈیکل کالج ایبٹ آباد میں بھی میرے ہمراہ تھے۔انہوں نے انتظامی ڈھانچہ میں تبدیلیوں کے حوالے سے نمایاں کردارادا کیااور آخر کار موجودہ عمارت کو پی ایم ڈی سی کے مطلوبہ معیار کے مطابق کردیا گیا۔

ہم نے بطور ٹیم یُسریٰ میڈیکل کالج راولپنڈی کا دورہ کیا۔میرے ساتھ فیکلٹی وکرنل طارق ڈائریکٹر ایڈمن اور انجینئر فضل ستار بھی تھے۔ وہاں سب سے اہم نسخہ کیمیا مل گیا۔یسریٰ میڈیکل کالج کا ایکوپمنٹ صرف ایک سپلائیر مسٹر فرخ نے سپلائی کیا تھا جن سے ملاقات ہوئی۔ وہ ایک دین دار شخصیت تھے۔انہوں نے ایک دلچسپ بات بتائی کہ وہ آلات کی سپلائی عارضی طور پر کرتے ہیں۔ ہر نئے میڈیکل کالج میں سامان سیٹ کرتے اور جب پی ایم ڈی سی کی انسپکشن ختم ہوجاتی تو سامان کسی دوسرے کالج میں منتقل کر دیتے وراس طریقے سے مختلف کالجوں کے انسپکشن کامیاب ہوجاتے ہیں۔میں نے بھی انہیں اپنے کالج کے متعلقہ افراد سے ملوادیا جس کے بعد تسلی ہوگئی کہ پی ایم ڈی سی کے انسپکشن کے دن ہمارے پاس تمام ضروری سامان موجود ہوگا۔

پی ایم ڈی سی کے اندر کا اُس وقت سین یہ تھا کہ رجسٹرار ندیم ہمیں گھاس بھی نہیں ڈال رہے تھے۔ میں جب بھی جاتا اگرچہ بظاہر میری بڑی عزت کرتے لیکن رجسٹریشن کے حوالے سے کسی قسم کی کوئی یقین دہانی نہ کرواتے۔ہم نے شروع دن سے سارا کام قانونی کیا تھااور وزارت صحت کی جانب سے ہدایت کی گئی تھی کہ ہمارے کالج کی انسپکشن کی جائے لیکن یہ کب کی جائے یہ سارا معاملہ ان کے ہاتھ میں تھا۔ڈاکٹر عاصم پی ایم ڈی سی کے نائب صدر تھے۔ڈاکٹر عاصم بعد میں پیپلز پارٹی کے دور میں وزیر بھی بنے اور بہت عرصے تک معتوب بھی رہے۔ ڈاکٹر عاصم کی رحمان صاحب کے ساتھ کراچی سے شناسائی تھی تاہم وہ بھی اتنے معاون ثابت نہ ہوئے۔حتیٰ کے اطلاع کے مطابق اور پی ایم ڈی سی کے

انسپکشن شیڈول مختلف کالجوں کیلئے طے پا گئے مگر حیرت انگیز طور پر رحمان میڈیکل کالج کا نام فہرست میں شامل نہیں ہوا۔ میں فوری طور پر پی ایم ڈی سی آفس چلا گیا تا کہ رجسٹرار کو قائل کرسکوں کہ ہمارے تمام انتظامات مکمل ہیں اس لئے انسپکشن کی جائے۔ اُس دن اسلام میڈیکل کالج کے مالک جو غالباً پیپلز پارٹی کے ایک وزیر کے بھائی تھے اور رجسٹرار انہی کا کام کرنے میں مصروف تھے۔ میں بھی ڈٹا رہا اور انہیں اپنے کالج کے حوالے سے قائل کرلیا۔ اور یوں ہمارے کالج کی انسپکشن کے لئے بھی کاغذی کارروائی مکمل ہوگئی۔

10 اگست 2010ء کو پی ایم ڈی سی کی ٹیم نے رحمان میڈیکل کالج کا دورہ کیا۔ یہ ٹیم سخت گیر افراد پر مشتمل تھی ۔ہم بھی پریشان تھے کہ کہیں کوئی مسئلہ پیش نہ آ جائے۔ اللہ کے فضل سے ہمارے سارے معاملات ٹھیک تھے تمام ریکارڈ درست تھا۔ بہرطور یہ انسپکشن ہماری توقعات سے بڑھ کر رہا اور مختلف مراحل طے کرنے کے بعد رحمان میڈیکل کالج کو 24 دسمبر 2010ء کو پی ایم ڈی سی نے رجسٹریشن دے دی۔ اس وقت تک خیبر میڈیکل یونیورسٹی کے تمام ملحقہ میڈیکل کالجوں میں داخلے ہو چکے تھے اور ایم بی بی ایس سال اول کے سیشن بھی شروع ہو چکے تھے۔ ہم بہت پیچھے رہ گئے تھے۔ یہ فیصلہ کرنا کوئی اتنا مشکل نہیں تھا۔ کہ اب فوراً داخلے شروع کئے جائیں لہٰذا ہم نے کالج میں داخلوں کا آغاز کر دیا اس دوران ہمارے عزائم طلباء کی سلیکشن سے متعلق بہت بلند تھے۔ ہمارا خیال تھا کہ ہر کسی کو داخلہ دینے کی بجائے صرف اُن خصوصی طلباء کو داخلہ دیں گیں جو اہلیت رکھتے ہوں اور اس بات کے لئے باقاعدہ ٹیسٹ لیا جائے۔ ہم نے پی ڈی ایم سی کے قواعد وضوابط کے عین مطابق ٹیسٹ کا اہتمام کیا اس کے لئے پرچہ ہم نے خود بنایا۔ پری میڈیکل ٹیسٹ ڈاکٹر جمیل الرحمن اور نفسیاتی ٹیسٹ ڈاکٹر ناہید پی ایچ ڈی سائیکالوجسٹ نے ڈیزائن کیا۔ تحریری کے علاوہ انٹرویو پر مبنی مختلف ٹیسٹ ہوئے۔ پہلے سیشن میں جن لوگوں نے اپلائی کیا اگر چہ وہ یونیورسٹی، ایٹا کی میرٹ لسٹ کے حوالے سے تو کم تر تھے لیکن ہمارے خیال

میں اہلیت کے لحاظ سے بہت بہتر تھے۔ہم نے 100 طلباء کو داخلہ اور چند کو مسترد کیا تاہم اس سلسلے میں ہمیں بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔سفارشیں بھی آئیں، دباؤ بھی پڑا لیکن ہم ثابت قدم رہے۔

یوں 24 فروری 2011ء کو ایم بی ای ایس کا پہلا سیشن شروع کر دیا گیا۔الحمداللہ یہ وہ پہلے سال کی کلاس ہے جو کہ 100 فیصد کامیابی کے ساتھ گریجویٹ ہوئی۔ان میں اب بہت سے قابل فخر ڈاکٹر ہیں۔اگلے سال بھی ٹیسٹ کا سلسلہ برقرار رہا البتہ اس سال تحریری اور نفسیاتی ٹیسٹ کے علاوہ طلباء کے ماہر نفسیات کے ساتھ انٹرویو کو بھی شامل کیا گیا۔بعد کے چند برسوں میں اعتراضات کی بناء پر ہم نے این ٹی ایس کے ذریعے بھی داخلہ ٹیسٹ کروائے۔ہر سال دیگر مراحل کی طرح نفسیاتی تجزیہ کو بھی داخلے کے میرٹ میں اہمیت دی گئی۔ہم نے ایک تحقیقی مقالہ لکھا جس میں داخلے سے پہلے ہونے والے متعلقہ امتحانات کے اثرات اور طلباء کے تعلیمی نتائج کا آپس میں موازنہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ ٹریننگ معیار کے لئے ہمارے کالج کے ٹیسٹ کا کوئی خاطر خواہ فائدہ نہیں، میں نے بھی اس حوالے سے اپنا ایک الگ مؤقف اپنایا اور رائے دی کہ اس قسم کے ٹیسٹ نہیں ہونے چاہئیں جس کے بعد داخلے کے لئے ٹیسٹ کا سلسلہ ختم کر دیا گیا۔ **21 - 2020**ء میں پاکستان میڈیکل کونسل موجودہ پی ایم سی نے دوبارہ یہ ٹیسٹ لازمی کر دیئے لیکن مختلف وجوہات پر یہ ٹیسٹ شدید قانونی ردعمل کی بناء پر پھر سے غیر مقبول ہو گئے۔

2010ء تک آر ایم آئی کی لائبریری صرف چوتھی منزل پر مشتمل تھی ایک کچا پکا لائبریرین غیر رائج طریقے سے اسے چلا رہا تھا۔کتابیں زیادہ تر پوسٹ گریجویٹ سے متعلق تھی PMCD یا دیگر ریگولیٹری اداروں کے معیار پر نہ تھی۔نئی بنی ہوئی عمارتوں میں ایڈمن بلاک کی تیسری منزل لائبریری کے لیئے مختص تھی۔اس لائبریری میں ہم نے آر ایم لائبریری کو ضم کر دیا اور میرے ایوب میڈیکل کالج میں لائبریری کے تجربے کی بنیاد پر ہم نے ایک بہت اعلیٰ پیمانے کی پرنٹ و ڈیجیٹل لائبریری لائبریرین محمد ہارون اور اسسٹنٹ لائبریرین سفینہ کی کاوشوں سے تیار کر لی۔لائبریری کے طریقہ کار کو سافٹ ویئر

کے ذریعے چلوایا۔ HEC کی لائبریری کے ساتھ لنک کیا، ڈیجیٹل لیبارٹری کو 80 - 70 سسٹمز سے مزین کیا۔ RMC پرنسپل آفس کی سٹاف عنبرین آراء نے بڑی محنت سے رحمان میڈیکل کالج کے سال اول کے لئے IT Module نہ صرف بنایا بلکہ اس کو بہت اعلٰی طریقے سے ڈیجیٹل لائبریری استعمال کرتے ہوئے چلایا۔ عنبرین آراء اگرچہ منیجمنٹ میں تعینات تھی لیکن انہوں نے IT میں ماسٹر کیا ہوا تھا اور اس کا بخوبی عملی طور پر تجربہ بھی رکھتی تھیں۔ لائبریرین صاحباں کی نگرانی میں لائبریری نے اس قدر ترقی کی کہ بجاطور پہ یہ صوبے کے پرائیوٹ کالجوں میں سے بہترین لائبریری تصور کی جاتی ہے۔ آج تک بہت سارے پوسٹ گریجویٹ ٹرینی اس سے خاطر خواہ فائدہ لیتے ہیں۔ لائبریری کی سربراہی ابھی بھی میرے حصے میں ہے۔

رحمان میڈیکل کالج کے تدریسی ترقی کے مراحل:۔

2010 - 11ء میں طے ہوگیا کہ رحمان میڈیکل کالج میں مربوط وارتقای ماڈیولر تدریسی نصاب ہوگا جس میں طلباء کی خود سے سیکھنے کی صلاحیت کو اہمیت دی جائے گی۔ پہلی مشکل یہ پیش آئی کہ ہر سال کے آخر میں پیشہ وارانہ امتحان یونیورسٹی اپنے طے شدہ عنوانات و مضامین کا لے رہی تھی مثلاً ایک ہی جسمانی سسٹم کا اناٹومی کا امتحان فرسٹ ائیر میں، فزیالوجی سیکنڈ میں۔ یونیورسٹی کے ساتھ اس سلسلے میں معاملات طے کرنے میں کچھ وقت لگا۔ میں نے اس سلسلے میں ایک مضبوط کیس بنا کر خیبر میڈیکل یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر حفیظ اللہ سے خصوصی بحث کی۔ وہ ایک تخلیقی ذہنیت کے مالک تھے۔ اگرچہ میرے پیش کردہ خیالات سے وہ بخوبی واقف اور رضامند بھی تھے مگر قانونی پیچیدگیاں اُن کے آڑے تھیں۔ اس کے باوجود اُنہوں نے میری حوصلہ افزائی کی جس کا مطلب شاید میں کچھ توقع سے زیادہ جان کر خوش ہوگیا کہ رحمان میڈیکل کالج کی حد تک ہم اس نئے نصاب کو رائج کر پاہیں گے اور یونیورسٹی اسے قبول کر لے گی۔

مربوط و ارتقای ماڈیولر تدریسی نصاب Integrated Modular) (Curriculum کو رائج کرنے کیلئے بہت پاپڑ بیلنے پڑے۔ بنیادی وجہ فیکلٹی کا راضی نہ ہونا تھا۔ غالباً شروع میں اُن کی سمجھ سے بھی بالاتر تھا۔ باوجود فیکلٹی کی شدید مزاحمت کے ہم آگے بڑھتے گئے۔ کالج کی تمام فیکلٹی میں صرف دو تین لوگ ہی نئے نظام کا کچھ تجربہ رکھتے تھے۔ جن میں ڈاکٹر اسلم قمر اناٹومی، ڈاکٹر وقاص حمید فزیالوجی اور ڈاکٹر موجد بائیوکیمسٹری ڈپارٹمنٹ میں تھے۔ ان کے علاوہ دیگر تمام لوگ روایتی نظام سے آئے تھے۔ افتخار قیوم نے میرے ساتھ مل کر میڈیکل ایجوکیشن کی تیاری میں بہت اہم کردار ادا کیا۔ آخرکار تمام فیکلٹی یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہوگئی کہ ہم نے یہ سسٹم رائج کرنا ہے اور اس میں آگے چلتے رہنا ہے۔ یہ بات تو طے تھی کہ اگر ہم پہلے اور دوسرے پروفیشنل کے مضامین یونیورسٹی کی سطح پر یک جا کر لیں تو ایک امتزاجی (Hybrid) مربوط و ارتقای ماڈیولر تدریسی نصاب Integrated Modular) (Curriculum کو کسی حد تک رائج کر پائیں۔

تاہم کسی نہ کسی طرح نظام چل پڑا دوسری مشکل جو ابھی تک ہے کہ یونیورسٹی کا امتحان مضامین کی بنیاد پر اور غیر مربوط رہا ہے اور طلباء امتحانی نقطہ نگاہ سے ہی تمام مضامین پڑھنے کے عادی ہوتے ہیں۔ طلباء اور اساتذہ دونوں کو یہ باور کرانا کہ مربوط طریقہ تعلیم لامحالہ ایک اچھے امتحانی نتیجے پر ختم ہوگا آسان نہیں ہوتا۔ شدید ردعمل کے باجود چند لوگوں کی چھوٹی سی ٹیم نے اس امتزاجی طریقہ تدریس کو رائج کر دیا۔ یونیورسٹی کے باہر سے بھی بڑے اچھے نتائج ظاہر ہوئے اور آخرکار یونیورسٹی کے ایم بی بی ایس طریقہ کار کو تبدیل ہونا پڑا۔ یہی حال اندرونی امتحانات کا بھی رہا اور رحمان میڈیکل کالج کی یہ تعلیمی اور تدریسی منزلیں ترقی کی شاہراہ پر گامزن رہیں۔ میڈیکل ایجوکیشن ڈپارٹمنٹ کا قیام تو ہم نے پی ایم ڈی سی کی انسپیکشن پر 2010ء میں کر دیا تھا۔ اُس وقت اس محکمہ کا عملہ دو سیکریٹیریل اسٹاف اور ایک جز وقتی مشیر پر مشتمل تھا۔ مرکزی خیالات میں مہیا کرتا۔ ہماری فیکلٹی ٹیم اُسے اگے بڑھاتی تھی۔ 2013ء کے بعد اس

ڈیپارٹمنٹ میں باقائدہ فیکلٹی کے طور پر ڈاکٹر ماہ رخ نے شمولیت کی اور تب سے اب تک اُن کی اپنی تربیت کے علاوہ ہم نے نظام کے مسلسل تقاضوں کے مطابق ٹیموں کو مرتب کیا اور اُن کی تربیت بھی کی۔ نتیجاً تقریباً ہر فیکلٹی اس نظام تعلیم سے خوب آشنا ہوگئی اور طلبہ کو اس کے فوائد ملنا شروع ہو گئے۔ نیز خیبر میڈیکل کالج کے فورم پر میرے اور دیگر اساتذہ کے شامل ہونے سے اثرات یونیورسٹی کی حد تک بہت مفید ثابت ہونے لگے۔ یونیورسٹی ایجوکیشن کا رخ بھی اس مربوط تعلیمی نظام کے حق میں ہو گیا اور یوں تمام منسلک میڈیکل کالجز بھی اس کام میں شامل ہو گئے۔ ہم نے اپنے نمائندوں کے ذریعے یونیورسٹی کو مکمل تعاون و تعلیمی مواد فراہم کیا۔ وقت کے ساتھ ساتھ یہ طریقہ تعلیم فعال ہوتا جا رہا ہے اگرچہ اب بھی اس کے بہت سے مراحل طے کرنے باقی ہیں۔ رحمان میڈیکل انسٹیٹیوٹ کے دیگر کالج بھی اسی نظام کو اپنائے ہوئے ہیں۔ طلبہ کا خود سے سیکھنا اور ریسرچ پراجیکٹ اس نظام کے دو اہم پہلو ہیں۔

2018ء میں پی ایم ڈی سی کے قانون پر عمل کرتے ہوئے مجھے پرنسپل شپ کو چھوڑنا پڑا۔ ڈاکٹر جمیل الرحمان دوسرے اور ڈاکٹر مختیار زمان تیسرے پرنسپل مقرر ہوئے۔ چونکہ ایک تعلیمی نظام قائم ہو چکا تھا اس لیئے میری قیادت کے بعد بھی یہ سلسلہ بخوبی جاری و ساری ہے۔

باب نمبر 12

آشیانے

سنا ہے کہ لوگ ہر بیس سال بعد اپنے آشیانے بدلہ کرتے ہیں۔ جب میں ماضی کی یادوں میں کھوجاتا ہوں تو گھر یاد آتے ہیں۔ گھر کیا ہے؟ یہ وہ جگہ ہے جہاں آپ اپنے قریب ترین خاندان کے ہمراہ اکٹھا رہتے ہیں۔ گھر شادی سے پہلے ماں باپ اور بہن بھائیوں کے ساتھ ہوتا ہے۔تو شادی کے بعد یہ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ، شادی کے بعد حصول روزگار آپ کو کہاں کہاں لے جاتا ہے اور پھر اگر اپنا ذاتی گھر بنائیں تو زندگی کا کچھ حصہ سکون سے کٹ جاتا ہے مجھے بھی اپنے مختلف آشیانے یاد ہیں جس کا تذکرہ پہلے بھی ہوالیکن اب کچھ تفصیل سے بتائے دیتا ہوں۔

میرا پہلا گھر: گنج منڈی پشاور: (میرا پہلا گھر اور بچپن کی یادیں)

میری پیدائش پشاور میں واقع علاقہ گنج منڈی والے گھر میں ہوئی دو یا اڑھائی مرلے پر محیط یہ گھر محلہ شیخ الاسلام کے ذیلی حصہ کشمیری محلہ میں واقع تھا۔ نچلے حصے میں چھوٹا سا ڈرائنگ روم اور سٹور تھا، درمیان والی منزل میں دو رہائشی کمرے، ایک چھوٹا کچن اور منگ والا صحن تھااور دوسری منزل پر ٹائلٹ اور کھلے آسمان تلے کوٹھہ تھا جو دونوں طرف سے ہمسائیوں جو ہمارے قریبی عزیز تھے کے دروازوں کے ذریعے ملتا تھا۔ اس گھر میں ہم سات، آٹھ افراد ہنسی خوشی رہتے تھے۔ گور گھٹری کے علاوہ علاقہ گنج میں تالاب والی مسجد ہمارے بزرگ حافظ مفتی محمد عظیم کے نام سے مشہور ہے۔ اس مسجد کا ذیلی دروازہ محلہ شیخ الاسلام میں کھلتا ہے جس سے غالباً میرے بزرگ مسجد سے گھر آتے جاتے تھے۔ اس گھر میں میں پرائمری سکول تک رہا۔

لڑکپن کا دور: (485/E سکندر پورہ۔ پشاور شہر)

تقریباً ایک صدی پہلے 30 - 1920ء کے دوران فصیل شہر پشاور کے باہر نئی آبادیاں بننا

شروع ہو گئیں۔ ہشت نگری گیٹ کے باہر جی ٹی روڈ کے متصل ایک پوش رہائشی علاقہ بنا جس میں اس وقت کی اہم شخصیات ڈاکٹر عبدالرب نشتر، خان بہادر، ڈاکٹر عبدالصمد و دیگر کے گھر شامل ہیں۔

یہ علاقہ نشتر آباد کے نام سے جانا جاتا ہے۔ ہشتنگری گیٹ اور نشتر آباد کے درمیان تقریبا دو فرلانگ کے فاصلے پر ایک منظم رہائشی علاقہ بنا جسے سکندر پورہ کہتے ہیں۔ سکندر کے نام کی وجہ تو معلوم نہیں۔ تاہم سکندر پورہ میں مشہور اوپل بلڈنگ کے متصل چار کمروں کے ایک مکان E - 485 میں 1957ء تا 1974ء تک ہم مقیم رہے۔ ہمارے مکان کے سامنے ایک ڈی ایس پی فقیر محمد خان جو بعد میں ایس بھی بنے رہائش پذیر تھے ان کا تعلق صوابی سے تھا۔ ڈاکٹر شفیق گائنا کالوجسٹ، ڈاکٹر اشفاق ماہر اطفال اور ڈاکٹر نرگس کے والد تھے۔ ہم سب اکھٹے گورنمنٹ ہائی سکول میں پڑھے۔ سکندر پورہ کی دیگر شخصیات میں سے ڈاکٹر عبدالمجید وسعید المجید، درمنگی پشاور کے وکیل انکم ٹیکس نور الہادی صاحب (سعد الہادی، نجم الہادی، عین الہادی، فیض الہادی و فقط کے والد) امام بارگاہ کے مالکان ولایت حسین شاہ (امامت، عبادت وصباحت کے والد) نیازی برادران جو ریڈیو پاکستان میں ہوا کرتے تھے، خالد محمود سکول والے، بریگیڈیئر طارق، قیصر داروغہ شہر اور ان کے بھائی ڈاکٹر شاہین اور ڈاکٹر محمد حنیف شامل ہیں۔
اس مکان اور اردگرد کے ماحول نے میری بنیادی تربیت میں اہم کردار ادا کیا۔ عزیز واقارب کی پہچان بھی یہیں ہوئی۔

سنڈرلینڈ (Sunderland) برطانیہ (اور ہنی مون کا دور):۔

میں اور میری بیگم شادی کے دو ہفتے بعد انگلینڈ گئے تو سنڈرلینڈ ہسپتال کی طرف سے ایک اپارٹمنٹ مل گیا۔ اس میں اوپر نیچے دو فیملیز رہتی تھیں۔ ہمیں اوپر والا اپارٹمنٹ ملا۔ جس میں ایک بیڈ روم، ایک کچن، ایک چھوٹا سا سٹور، ایک باتھ روم اور نیچے ایک گیراج تھا۔ بیگم چونکہ اُس ملک میں بالکل ہی اجنبی تھیں انہیں انگریزی کلچر اور زبان کا بھی زیادہ پتا نہیں تھا لہٰذا انہیں خود کو مقامی حالات سے ہم

آہنگ کرنے کے لئے کچھ وقت لگا۔شروع کے چند دن وہ صرف گھر تک محدود رہیں۔میں نے سوچا کہ انہیں بازار وغیرہ بھیجا جائے جس کے لئے ہسپتال کی چند خواتین جن میں نرسز اور سوشل ورکر شامل تھیں نے آفر کی کہ وہ میری بیگم کو شاپنگ کروانے لے جائیں۔ایک دو بار یہ لوگ اکھٹے گھومے پھرے۔زبان کے مسئلہ کے باوجود یہ میل جول بہت کارآمد ثابت ہوا۔میری بیگم بہت جلد برطانوی معاشرے سے روشناس ہوگئیں اور یوں تنہا وقت گذارنا آسان ہوگیا۔ایک رات دو بجے کے قریب جب میں اُٹھا تو وہ بستر پر نہیں تھی گھر ڈھونڈا لیکن دکھائی نہیں دے رہی تھیں نظر سٹور پر پڑی جہاں سے روشنی آرہی تھی جا کر دیکھا تو وہ نماز پڑھ رہی تھیں۔انہوں نے مجھے بتایا کہ میں ہمیشہ سے تہجد پڑھتی آئی ہوں وہ اپنے والد کے ساتھ صبح سویرے دو یا تین بجے اُٹھنے کی عادی تھیں تلاوت کلام پاک کے بعد گھریلو کام کرتی تھی۔

ہمارے تعلقات نیچے والے اپارٹمنٹ میں رہنے والے بنگالی میاں بیوی سے ہوگئے۔شوہر ڈاکٹر تھا اور بیوی ہاؤس وائف۔میری بیگم اور خاتون خانہ کی آپس میں دوستی ہوگئی اور جلد ہی مجھے احساس ہوا کہ ہمارے گھر میں بنگالی کھانے وغیرہ پکنے لگے ہیں۔جس میں ہلدی کی بھرمار ہوتی تھی۔بہرحال خوش تھا کہ پاکستان کے علاوہ بنگلہ دیشی کھانے ملنا شروع ہوگئے ہیں۔ایک اور پاکستانی فیملی مسٹر اینڈ مسز برنی کی تھی۔برنی کراچی کے رہنے والے تھے ان کی بیگم خالدہ اگرچہ کراچی کی رہنے والی تھیں مگر کسی زمانے میں وہ پشاور اپنے والد جو ائیر فورس میں آفیسر تھے کے ساتھ رہی تھیں۔لہٰذا وہ ہمارے ساتھ جلد ہی گھل مل گئے۔جب انہوں نے ہمارے گھر کا کھانا کھایا تو ان کو پہلی بار معلوم ہوا کہ روزی جسے پہلے بہت کم کھانا بنانا آتا تھا اب بنگالی کھانے بھی بنانے لگی ہے۔خالدہ بہت اچھی طبیعت کی خاتون تھیں۔انہوں نے خاص طور پر روزی کو کھانا پکانا سکھایا۔اورآہستہ آہستہ ہمارے دیسی کھانے بہترین لذت والے بن گئے۔ ان کی دوستی نے روزی کو برطانیہ میں ایڈجسٹ ہونے میں تقویت پہنچائی۔

میں نے ارادہ کیا کہ پہلی فرصت میں بیگم کو انگریزی سکھانے کیلئے کچھ بندوبست کروں۔ایک

انگلش ٹیوٹر کے ہاں بیگم کو بھجوایا لیکن وہ وہاں سے خائف ہوگئی اور زیادہ عرصہ یہ کام نہیں چلا۔ سنڈرلینڈ میں ایک سوڈانی مسلمان لڑکا ڈاکٹر سلمان تھا جو کہ اپنی گوری منگیتر کے ہمراہ ملتا تھا۔ انہوں نے ہمارے ساتھ مل کر جھیل جانے کا پروگرام بنایا۔ ہم وہاں گئے بہت لطف آیا۔ ہم اُن کی منگیتر کی گاڑی میں گئے راستے میں وہ انڈین گانے گا تا رہا خاص طور پر انڈین فلم آوارہ کا "آوارہ ہوں میں گردش میں ہوں آسمان کا تارا ہوں"۔ یہ گانا اُس زمانے میں انتہائی مقبول تھا بلکہ آج بھی ہے۔ خصوصاً ترکی میں ترک صدر تک اس کو گاتے ہوئے واٹس ایپ کے میسجز میں دکھائی دیتے ہیں۔ ہم اس سے بہت متاثر رہے کہ ترک بھی انڈین گانے کی پیروی کر رہے ہیں مگر اب جا کر معلوم ہوا کہ دراصل گانے کی یہ موسیقی اور انداز ترکوں نے اپنی فلموں میں بہت پہلے ہی دے دیا تھا۔ جب کہ آوارہ فلم انڈیا میں 1948ء میں بنی۔ یعنی نقل انڈین فلم نے کی۔ بہر حال سوڈانی دوست سلمان کے گانے سے ماحول بڑا خوشگوار ہو گیا اور روزی یہ سمجھی کہ غالباً اس کو اردو یا ہندی گانے کی سمجھ بھی آتی ہے مگر جب اُس سے پوچھا تو وہ بالکل کورا نکلا۔ اُس نے کہا مجھے گانے تو یاد ہیں مگر ان کے مطلب کی سمجھ نہیں۔ صرف یہ گانے گانا اچھے لگتے ہیں۔ اس فیملی کے ساتھ ہمارے تعلقات کافی خوشگوار رہے۔ ہم ایک بار اس کی منگیتر کے ساتھ Newcastle Upon-Tyne جو نصف گھنٹے کے فاصلے پر تھا فلم The Message دیکھنے گئے۔ اس فلم کے دیکھنے کے کچھ عرصے بعد ہمیں پتہ چلا کہ وہ لڑکی مسلمان ہوگئی ہے۔ اس سے پہلے سوڈانی ڈاکٹر سلمان نے اس سلسلے میں کبھی کوشش ہی نہیں کی تھی۔ یہ لڑکی ہمارے بتائے بغیر The Message فلم دیکھنے بار بار گئی اور متاثر ہو کر مسلمان ہوگئی۔ سنڈرلینڈ میں کچھ عرصہ رہنے کے بعد میری ملازمت ختم ہوگئی۔ انگلینڈ میں طریقہ کار کے مطابق نوکری کی تلاش اور انٹرویوز کے لئے جانا شروع کیا۔ اور آخر کار Stoke-on-Trent جنرل ہسپتال میں دو سال کے لئے سرجری کی فیلوشپ مل گئی۔ اور یوں ہم ایک نئی جگہ منتقل ہوگئے۔

53۔ہلٹن روڈ،سٹروک آن ٹرینٹ،(باسل مفتی کی آمد اور خوشگوار یادیں):۔

دوسال کے رجسٹرار سرجری کے دورانیہ میں ہم 53 ہلٹن روڈ بلمقابل سٹروک آن ٹرینٹ جنرل ہسپتال میں دو بیڈروم پر مشتمل روایتی انگلش گھر میں رہے یہ ہمارا پہلا ایسا گھر تھا جہاں ہم نے گھر کے رکھ رکھاؤ اور آداب محلہ داری سیکھے اور نبھائے۔ ہمارا گھر ہسپتال کے بالکل سامنے واقع تھا ۔ہم یہاں دوسال رہے۔ہم میاں بیوی کو بھی ایک دوسرے کو سمجھنے کا موقع ملا۔کبھی ناخوشگوار اور کبھی خوشگوار حالات رہے زیادہ تر ماحول خوشگوار رہا۔ میری بیگم کو آس پاس ہی اچھی سہیلیاں مل گئیں۔گھر کے بائیں جانب ایک سپینش (Spanish) فیملی رہتی تھی ۔ ہسپانوی عورت ٹوٹی پھوٹی انگریزی بولتی تھی ۔دوسری طرف عراقی ڈاکٹر سعید ابن مجید جن کی بیگم نائلہ بھی انگریزی بول لیتی تھی ۔ یہ تین خواتین آپس میں اچھی خاصی گھل مل گئیں جلد ہی انہوں نے فیصلہ کیا کہ انگلش کورس میں داخلہ لے لیں۔اس کورس کیلئے ہفتے میں ایک یا دو دبار جانا ہوتا تھا۔

یہ وقت ہمارے پہلے بچے باسل کی آمد آمد کا تھا میں بہت مصروف ہوا کرتا تھا۔گھر کی تمام ذمہ داری بیگم کے حوالے ہی تھی ۔ میری بیگم خود ہی ہسپتال معائنے کیلئے چلی جایا کرتی تھیں ۔ایک تیز ہوا چلی جو انگلینڈ میں کبھی کبھار چلتی ہے اور میری بیگم کو توازن برقرار نہ رکھتے ہوئے گر گئیں ۔ مجھے ہسپتال بلوایا اور کہا گیا کہ آئندہ انہیں اکیلا نہ آنے جانے دیا جائے یوں میری بھی ذمہ داریوں میں ایک اور ذمہ داری کا اضافہ ہو گیا۔ یہ بڑی خوش آئند بات تھی کہ میری بیگم نے ڈرائیونگ سیکھ لی تھی۔ اتفاق سے انسٹرکٹر پاکستانی نژاد تھا اردو بول لیتا تھا لہذٰا میری بیگم نے اُس سے ڈرائیونگ کے سبق شوق سے لینا شروع کر دیئے ۔ مجھے یہ جان کر بڑی حیرت ہوئی کہ ایک دن یہ لوگ ٹسٹ کلیئر کر کے گھر بھی پہنچ گئے ۔ میں بیگم کو لے کر جب کبھی موٹروے پر جاتا اور اگر گاڑی کی رفتار 80 یا 70 میل ہوتی تو یہ ساتھ بیٹھی شور مچا دیتی کہ گاڑی تیز چلا رہے ہو۔اب اُسی موٹروے پر پہلی بار وہ خود گاڑی چلا رہی تھی ۔ رفتار کی سوئی 80، 90،

110، 120 کراس کر کے جب 140 کے قریب پہنچی تو میں نے اسے کہا کہ بھئی دیکھوسوئی کیا کر رہی ہے، اور جھٹکے سے اس نے بریک لگا دی۔ خیر شروع کے دن تھے اس کے بعد اس نے زندگی بھر خاصی گاڑی چلائی۔ اکثر گاڑی صاف بھی کرتی تھی۔ پاکستان میں بھی واپس آکر چلاتی رہی۔

ہمارا سٹروک آن ٹرینٹ والا گھر خاصا اچھا تھا۔ اُس میں دو بیڈروم تھے اور ایک بے بی روم تھا۔ میرے پہلے بچے باسل کی پیدائش بھی وہیں 20دسمبر 1977ء کو ہوئی۔(پری میچور تھا لہٰذا چند دن Incubator میں رہا۔ ہوم ہیلپ (ایک خاتون) کچھ دنوں تک آتی رہی بعد میں میری بیگم نے حالات کو خود ہی سنبھال لیا اور بڑی بہادری کے ساتھ ہمارا پہلا بچہ پیدا ہونے کا مرحلہ بغیر ماؤں کو بلانے کے گزر گیا)۔

انگلینڈ میں ہر بچے کی پیدائشی رجسٹریشن آٹھ دن کے اندر کرنا ہوتی ہے۔ میں ہسپتال کے مسٹر گرانٹ کا لکھا ہوا برتھ سرٹیفیکیٹ لے کر مقررہ وقت برتھ رجسٹری کے دفتر پہنچا تو معلوم ہوا کہ رجسٹرار نہیں ہے۔ میں نے ان کے اسسٹنٹ کا پوچھا تو پتہ چلا کہ وہ بھی کسی میٹنگ میں ہے۔ میں خاموشی سے واپس ہونے لگا۔ تو مجھے ری سپشنسٹ نے کہا کہ آپ کا مسئلہ کیا ہے۔ میں نے بتایا کہ میری اپوائنمنٹ تھی، بچے کا برتھ سرٹیفیکٹ بنانا تھا اس نے کہا کہ آپ مجھے بتائیں۔ میں نے سرٹیفیکیٹ انہیں دیا جس کے بعد انہوں نے کچھ ٹائپ کرنا شروع کر دیا۔ اُس زمانے میں کمپیوٹر وغیرہ نہیں تھے اور تھوڑی دیر بعد سرٹیفکیٹ کا پرنٹ نکالا، اُس پر اپنے دستخط کئے اور مہر لگا کر میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ مجھے عجیب لگا کہ یہاں پر دستخط تو رجسٹرار کا ہونا تھا یا اُس کے نائب کا نہ کہ ری سپشنسٹ کا! میں نے سوالیہ انداز میں اُس سے پوچھا کہ کیا یہ سرٹیفیکیٹ مصدقہ ہے۔ اُس نے خاصے ترش لہجے میں جواب دیا کہ جی ہاں مصدقہ ہے۔ میں نے اتھارٹی ہونے کی وجہ سے اس پر دستخط کئے اور مہر لگائی ہے۔ "You may challenge it any where" یہ کہیں بھی چیلنج نہیں ہوسکتا۔ واقعی ایسا ہی ہوا۔ باسل کی پہلی سالگرہ ہم نے سٹروک آن ٹرینٹ میں منائی۔ یہ بہت ہی خوشگوار تقریب تھی۔ لاؤنج کو رنگ برنگے غباروں سے سجایا گیا تھا۔ ہمارے قریبی دوست احباب مدعو

تھے۔خاصی گہما گہمی رہی اور مہمانوں ک ءجانے کے بعد مجھے یاد ہے کہ ہمیں رات دیر تک برتن دھونے پڑے۔روزی برتن دھوتی اور میں انہیں خشک کر کے ترتیب سے لگاتا ۔یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے کچن میں اس کی مدد کی تھی۔

اسی گھر میں اسلم اور اس کی بیگم سلمٰی پہلی مرتبہ آئے تھے ان کے یہاں جڑواں بچے سعدیہ اور شیراز تھے وہ ڈبل بگھی میں گھوما پھرا کرتے تھے جب کہ ہم بھی باسل کو لے کر بگھی میں گھومتے تھے۔ان کے ساتھ پہلی ملاقات تھی چونکہ ان کا تعلق پشاور سے تھا اور ایک دوسرے کی فیملیز کو بھی جانتے تھے۔لہذٰا جلد ہی ہم گھل مل گئے۔ہم انہیں لے کر ایلٹن ٹاور جو ہمارے گھر سے کوئی بیس پچیس منٹ کے فاصلے پر تھا۔یہ جگہ اُس زمانے میں اپنے قدرتی حسن کی وجہ سے مشہور تھی۔وہاں ایک بہت بڑی جھیل تھی جس میں کنول کی پھول کھلے رہتے تھے۔ہم نے وہاں فلم بندیاں بھی کیں۔اسی گھر میں سلیم خان جو میرے کلاس فیلو بمعہ اپنی اہلیہ آئے اور ایک موقع پر ہم بھی ان کے ساتھ سلیم جاوید اور ان کی بیگم شاہین کے ساتھ اکھٹے ہوئے غالباً یہ ڈاکٹر شاد محمد اور ان کی بیگم کا گھر تھا۔

میرے بھائی خالد مفتی 1978ء میں سیر کے لئے آئے میں اُس زمانے میں کارڈیک سرجری میں ڈیوٹی کرر ہا تھا اور اکثر گھر 24 یا 36 گھنٹوں تک نہ آتا۔چنانچہ بھائی صاحب میری گاڑی میں میرے بیوی بچوں کو لے کر صبح سویرے ناٹنگھم روانہ ہوگیا۔میری گاڑی بالکل نئ تھی میرے نام پر تو انشورڈ تھی مگر میرے بھائی کے نام پیپر نہیں تھے۔میں نے انشورنس آفس فون کیا لیکن آفس ابھی کھلا نہیں تھا، میں ہسپتال چلا گیا اور آپریشن تھیٹر میں مصروف ہوگیا۔اس سے پہلے ہاؤس کیپنگ کی خاتون سے میں نے کہا کہ تھوڑی دیر میں میں تو مصروف ہو جاؤں گا اگر آپ رجسٹریشن آفس کو میرے بھائی کا نام لکھوا دیں تا کہ اسے کوئی پریشانی نہ ہو۔میں نے اپنی گاڑی کا نمبر انہیں لکھوا دیا اور جب آپریشن تھیٹر پہنچا تو میرا باس مسٹر سینڈرسن وہاں پہنچ گیا اور مجھ سے کہنے لگا کہ میں خود ہی آپریشن کرلوں گا تم آرام کرو۔مجھے اچانک یہ فیصلہ

اگر چہ اچھا تو نہ لگا لیکن باس کی بات ماننا پڑی۔ اتفاق سے میں اس دن کیجولٹی ڈیوٹی پر بھی تھا۔ اسی اثناء ایک سینئر نرس نے مجھے کہا کہ ڈاکٹر کیوں نہ نیچے جا کر کیسز دیکھیں۔ یہ ساری بات بڑی عجیب تھی کیونکہ آپریشن تھیٹر سے کوئی ڈاکٹر واپس بلوایا نہیں جاتا تھا۔ جب میں اُس کے ساتھ جا رہا تھا تو کیجولٹی کے قریب پہنچ کر اُس نے کہا کہ غالباً تمہاری فیملی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ تمہارا بھائی اور بیوی بچے شعبہ حادثات اتفاقیہ میں آئے ہوئے ہیں۔ اور تمہیں ہی انہیں دیکھنا ہوگا کیونکہ کوئی اور ڈاکٹر دستیاب نہیں ہے۔ میرے تو اوسان خطا ہو گئے لیکن میں نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ میں نے دیکھا کہ میری بیوی اور باسل کو چوٹیں تو آئی ہیں مگر ان کی حالت خطرے سے باہر ہے۔ باسل کو سر پر چوٹیں آئی تھیں جسے فوری طور پر بچوں کے وارڈ میں بھجوایا اور روزی کو بھی الگ وارڈ میں داخل کروا دیا۔ میرے بھائی کا سر پھٹ گیا تھا اور اس سے خون جاری تھا۔ میں نے خود ٹانکے لگائے جس کے بعد ان کی حالت بھی بہتر ہو گئی۔ انہوں نے بتایا کہ حادثہ بارش کی وجہ سے سڑک پر پھسلن کی وجہ سے رونما ہوا۔ خان گل کچھ تیز گاڑی چلا رہے تھے کہ سامنے سے آنے والے 16 وہیلر ٹرک سے ٹکر ہو گئی۔ مجھے اطلاع دی گئی کہ ٹکر اتنی شدید تھی گاڑی کہ آگے اور پیچھے سے پچک گئی تھی۔ جب بعد میں میں نے موقع پر جا کے دیکھا تو میری حیرت کی انتہاء نہ رہی اللہ پاک کا شکر ادا کیا کہ اس قدر خطرناک حادثہ میں میرے خاندان کے افراد بچ گئے تھے۔ میری بیگم روزی کو سر کی چوٹ کی وجہ سے یاداشت کا مسئلہ درپیش تھا اس حد تک کہ وہ اپنے بیٹے باسل کو صحیح طرح سے پہچان نہیں پا رہی تھی۔ باسل چند دن بچوں کے وارڈ میں داخل رہا۔ ہم جاتے اُسے دیکھتے اُس کے ساتھ کھیلتے لیکن ماں اُس میں دلچسپی نہیں لیتی تھی۔ چند دن تو مجھ میں بھی کوئی خاص دلچسپی نہیں لی۔ ایسے لگتا تھا کہ شاید میں کوئی غیر ہوں! لہجہ اور رویہ سپاٹ ہو گیا۔ میں نے ڈاکٹرز سے مشورہ کیا تو انہوں نے کہا کہ بہتر یہ ہوگا کہ وہ کچھ عرصے کے لئے واپس پاکستان چلی جائے۔ لہٰذا میں نے فیصلہ کر لیا کہ دونوں کو پاکستان بھجوا دوں۔

باسل کیلئے پاسپورٹ بنانا تھا۔ میں نے لندن میں پاکستانی سفارت خانے فون کیا۔ جواب ملا

بھائی پاکستانی پاسپورٹ کیوں بناتے ہو۔آپ کو تو برٹش پاسپورٹ بنانا چاہیئے ۔ میں نے کہا کہ میں اپنے بچوں کو برطانوی شہری نہیں بنانا چاہتا بلکہ پاکستانی شہریت کو ترجیح دونگا۔ یہ بات سفارت خانہ کے اہل کار کے لئے باعث تعجب تھی۔ بہر حال انہوں نے معذرت کی کہ ہمارے پاس فارم ختم ہو گئے ہیں پاکستان سے منگوا کر بھجوا دیں گے۔ مجھے افسوس ہوا کہ ہمارے سفارت خانے میں فارم تک نہیں ہے اور مشورہ بھی مجھے عجیب دے رہے ہیں۔ بہر حال لیور پول میں برٹش پاسپورٹ کا آفس تھا ان سے رابطہ کیا۔انہیں صورت حال سے آگاہ کیا انہوں نے وہاں سے فارم ڈاک کے ذریعہ بھجوا دیا۔اور پانچ دن کے اندر باسل کو برٹش پاسپورٹ مل گیا اور وہ اپنی ماں کے ساتھ لندن سے پاکستان کیلیئے روانہ ہو گیا۔

دو ماہ پاکستان میں رہنے کے بعد دونوں واپس آ گئے۔روزی کی دماغی صحت میں خاصی بہتری آ چکی تھی، یادداشت بھی ٹھیک ہو چکی تھی۔ہم مزید چند ماہ وہیں سٹروک آن ٹرینٹ میں رہے۔جب روزی اور باسل پاکستان آ گئے تو میں کچھ دنوں کیلیئے ہاسٹل منتقل ہو گیا تا کہ سکون سے پڑھ سکوں، میری اچھی خاصی محنت کے ساتھ بیگم سے خط و کتابت بھی جاری رہی۔ یہ خطوط بڑے اہم تھے اور ہماری جذباتی وابستگی کا اظہار بھی تھے۔

اگست 1979ء میں پاکستان سے میرے سسر مفتی نثار احمد کا فون آیا کہ ایوب میڈیکل کالج، ایبٹ آباد میں ملازمت کے لئے درخواستیں طلب کی گئی ہیں۔میرا اور بیگم دونوں کا یہ خیال تھا کہ پاکستان واپس جا کر ایبٹ آباد میں رہائش اختیار کر لیں۔ یہ سوچ کر تیاری کر شروع کر دی اور سارا سامان کنٹیز کے ذریعے پاکستان بھجوا دیا۔جاپان سے ایک ٹیوٹا کرولا 80 ماڈل بھی بک کروا کر بھجوا دی۔خود عارضی طور پر کنٹر بری جنرل ہسپتال میں ملازمت حاصل کر لی چونکہ وہاں فیملی کی رہائش نہیں تھی اس لئے روزی اور باسل، اسلم اور سلمیٰ لوگوں کے گھر لندن شفٹ ہو گئے اور تقریباً ایک ماہ رہے۔

اس دوران ایک یاد یہ بھی دل و دماغ میں تازہ ہے کہ میرے چچا کی بیٹی نزاکت شاہین اپنے

میاں ونگ کمانڈر عالم جواس زمانے میں غالباً سکوارڈن لیڈر تھے۔ اپنے دونوں بچوں کاشف اور کامی (کامران) کے ہمراہ لندن آئی اور ہم نے ایک یا دو دن اکھٹے گزارے۔ یہ بھی ایک یادگار موقع تھا۔ بعد میں ایبٹ آباد بھی وہ ہمارے ہاں کبھی کبھار آیا کرتے تھے۔ کاشف عالم اب ڈپٹی انسپکٹر جنرل آف پولیس کے عہدے پر فائز ہے اور اس کا بھائی کامران مستقل امریکہ میں رہائش پذیر ہے۔ دونوں بھائی بنیادی طور پر انجینئر ہیں۔ ان کے والد عالم صاحب کی 2018ء میں رحلت ہوگئی۔

سٹروک آن ٹرینٹ رہائش کے دورانیہ میں بہت سے پاکستانی وزیٹر نے ہمیں شرف میزبانی بخشا۔ جن میں جاوید خانزادہ جو میرے سسر کے ساتھ اکھٹے ہوم ڈیپارٹمنٹ میں ڈپٹی سیکرٹری اور بعد میں سیکریٹری بھی تعینات رہے، سرجن ڈاکٹر کبیر کی فیملی اور ایڈورڈز کالج کے ساتھی اقبال ظفر جھگڑا جو بعد میں صوبے کے گورنر رہے شامل ہیں۔

13 دسمبر 1979ء کو ہم لندن ہیتھرو ایئر پورٹ سے روانہ ہوئے۔ میرے دوست اسلم نے ہمیں ایئر پورٹ سے رخصت کیا اور ہم واپس پاکستان پہنچ گئے۔ پاکستان میں اسلام آباد ایئر پورٹ پر میرے بھائی سعید گل اور بڑے بھائی خان گل ہمارے استقبال کے لئے موجود تھے جن کے ساتھ ہم پشاور پہنچ گئے۔

32۔گلبہار پشاور (اور سعد احسان کی پیدائش):۔

گلبہار کالونی پشاور میونسپلٹی کی باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت نشتر آباد سے ملحقہ وسیع علاقے پر بنائی گئی۔ دس مرلے کے رہائشی پلاٹ تمام افسروں کو الاٹ کئے گئے۔ زیادہ لوگ پشاور شہر سے تھے۔ کالونی تعمیر ہو کر ایک اچھی رہائشی علاقے میں تبدیل ہوگئی۔ میرے والد نے 60ء کی دہائی میں سترہ ہزار روپے خرچہ سے گھر بنایا۔ انگلینڈ سے پاکستان واپسی کے بعد ہم اپنے والدین کے پاس پانچ کمروں والے گھر میں رہنے لگے۔ ہمیں بالکل بیرونی کمرہ جو کہ ڈرائنگ روم کے متصل تھا دیا گیا۔ ہمارے ساتھ

والے کمرے میں کچھ عرصہ بعد میرے بڑے بھائی ڈاکٹر خالد مفتی اور اُن کی بیگم رہنے لگے اس طرح ہم دو چھوٹے خاندان یہاں تقریباً چھ ماہ مقیم رہے۔ مجھے یاد ہے کہ اس گھر میں رہائش کے دوران ہمارا بیٹا سعد بروز جمعہ 30 مئی دن بارہ بجے دن ڈاکٹر جوہر خاتون کے کلینک یونیورسٹی ٹاؤن میں پیدا ہوا۔ اس دوران ہمیں محسوس ہوا کہ شاید ہم مزید یہاں اکھٹے نہ رہ سکیں۔ وجہ غالباً یہ تھی کہ ہم انگلینڈ میں اکیلے پن میں رہنے کی عادی ہو چکے تھے مشترکہ فیملی میں رہ کر ہمیں عجیب لگتا تھا۔

گلبہار میں ہمارے قریبی خاندان کے بہت سارے گھر تھے۔ سب سے بڑی آسانی یہ تھی کہ میرا سسرال بھی ہماری گلی میں رہتے تھے۔ خاندان کی اکھٹی محفلوں کی وجہ سے ہمیں ایک دوسرے سے سماجی اور جذباتی لگاؤ ہو گیا جو ہمارے معاشرے کی خصوصیت ہے۔ رمضان کی ہر شب بعد از تراویح کسی نہ کسی گھر میں دیر گئے تک لوگ اکھٹے مل بیٹھتے۔ میرے سسر مفتی نثار احمد جو صوبائی سیکرٹیریٹ میں ایک بااثر افسر تھے کے توسط سے ہمیں خیبر روڈ پر ایک سرکاری گھر مل گیا اور ہم وہاں منتقل ہو گئے۔

اپارٹمنٹ خیبر روڈ، پشاور اور سانپ برآمد ہونے کا واقعہ:۔

یہ گھر دراصل گراؤنڈ فلور پر دو کمروں پر مشتمل ایک اپارٹمنٹ تھا۔ سہولت اس میں یہ تھی کہ اس کے پیچھے ایک چھوٹا سا حصہ تھا جسے ہم نے لان بنا لیا۔ اردگرد کے رہائشی مختلف صوبائی محکموں کے افسران تھے۔ انگلینڈ کے دو اور والدین کے گھر کے بعد یہ چوتھا گھر تھا۔ اس سے متعلق بھی بہت سی یادیں ہیں۔ اس گھر کی آرائش کیلئے ہمارے پاس سامان موجود نہیں تھا۔ میں نیا نیا پاکستان آیا تھا۔ پرائیویٹ پریکٹس کا معاملہ بھی ابھی نہیں چلا تھا۔ پیسے کی کمی کے علاوہ وقت بھی نہیں تھا۔ میرے دوست مقصود مرحوم فریج اور ایئر کنڈیشنر ریپئیر کا بزنس سنہری مسجد روڈ پشاور صدر میں کوائٹ کول کے نام سے کرتے تھے۔ ان کے ذریعے پتہ چلا کہ اسلام آباد میں نیلامی ہوتی ہے اور اس میں بہت ہی سستا فرنیچر مل جاتا ہے۔ ہم اسلام آباد گئے۔ یورپین فرنیچر، صوفے و قالین اُٹھا کر لئے آئے۔ جو بڑی سستے مل گئے۔ اور اس طرح میرا گھر و

ڈرائنگ روم فرنش ہوگیا۔ بیڈ ہماری شادی کا پڑا تھا وہی ہم نے استعمال کر لیا۔

میرے تمام دوست جن میں حاجی مختیار، حاجی یعقوب، شفیق جان، مقصود جان۔ یوسف جانی کون، ڈاکٹر چنگیز، ہمایون اور دیگر رشتہ دار احباب اکثر و بیشتر رات کو فارغ ہو کر وہاں آجاتے آدھی رات تک میلہ جاری رہتا۔ میرے برادر نسبتی ڈاکٹر وقار جو اس وقت راولپنڈی میڈیکل کالج میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ ایم بی بی ایس سال سوئم کی تیاری کے سلسلے میں ہمارے پاس رہتے رہے چونکہ ہمارا بیٹا سعد اکثر بیمار رہتا اور مسلسل روتا رہتا تھا۔ بڑی مشکل ہوتی تھی۔ اس سارے ماحول میں ہم سب کی دیکھ بھال کرنے والی میری سالی تھی جو بچوں اور بڑوں سب کا فکر رکھتیں اور بعد میں بھی انہوں نے بہت حد تک ان بچوں کو پالا۔ آج یہ بچے انہیں اپنی ماں سے بھی زیادہ چاہتے ہیں اور اس طرح سسرالیوں سے قربت میں اضافہ ہوا۔ میرے سسر اور ایک برادر نسبتی اشفاق مفتی کے ساتھ میں گھل مل گیا۔ یہ ابتداء تھی اور پھر جب تک میرے ساس سسر زندہ رہے ہمارے تعلقات بہترین اور مثالی رہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ زندگی کے بڑے خوشگوار ترین ماہ و سال تھے۔

خیبر روڈ اپارٹمنٹ کا ایک مشہور واقعہ یہ ہے کہ ہمارے ہمسائے میجر (ر) احسن مختار اشرف جو پولیس میں اے آئی جی تھے کے پولیس گارڈ نے ایک رات ہمارے گھر پر دستک دی۔ اندھیرا تھا، میں نے دروازہ کھولنے کیلئے جوں ہی لابی میں قدم رکھا اچانک ایک پھنکار محسوس ہوئی اور کوئی چیز مجھ پر لپکی، میں بہت سرعت سے چھلانگ مار کر روشن لاؤنج میں آ گیا۔ دیکھا تو ایک لمبا کالا سانپ تیزی سے دروازوں کے نیچے سے ڈرائنگ روم کی طرف چلا گیا۔ میں نے گھر کا مین دروازہ کھولا روشنیاں کیں اور سپاہی پر برس پڑا۔ اس نے کہا جی میں آپ کو اطلاع دے رہا تھا کہ آپ کے گھر کے اندر سانپ آ گیا ہے۔ میں نے کہا کہ واہ رے پولیس والے، سانپ مارنے کی بجائے مجھ پر سامنے سے ہی حملہ کروا دیا۔ بہر حال میری نیند کافور ہوگئی۔ دروزاہ بند کیا۔ وقار مفتی جنہیں ہم ''انجم'' کہہ کر بُلاتے ہیں کو کہا کہ آؤ یار

ڈھونڈتے ہیں۔ پورا گھر اوپر نیچے کر لیا لیکن سانپ نہ ملا۔ ہم سمجھے کہ سانپ دروازوں سے نکل کر شاید باہر چلا گیا ہے۔ میں آرام سے سو گیا۔ رات کا کچھ ٹائم گزرا تھا کہ مجھے انجم نے جگایا کہنے لگا ۔

''میں کچن میں گیا۔ میں نے دیکھا کہ کچن کے ٹاپ پر ایک چوہا ہے۔ گھر میں چوہے کہیں ہوں تو میں جا کر اُس کو دُم سے پکڑ لیتا ہوں۔ اس نیت سے اندھیرے میں جوں ہی میں اس کے قریب گیا تو ڈر گیا کیونکہ یہ چوہا نہیں تھا بلکہ ایک کالا سانپ تھا۔ جو پاؤڈر دودھ کے ڈبے کے گرد لپٹا ہوا تھا''

یہ سن کر ہم میں بہت دہشت پھیل گئی اور پھر سے سانپ ڈھونڈنا شروع کر دیا۔ مگر سانپ نہ ملا۔ سمجھے کہ سانپ کچن میں کہیں موجود ہے۔ خوف اور دہشت سے رات بھر نیند نہیں آئی۔ صبح میں نے جلدی سے سب کو مطلع کر دیا۔ میرے رشتہ داروں کے علاوہ میرے دوست بھی پہنچ گئے جن میں حاجی یعقوب مرحوم بھی شامل تھے یوں سارا دن ہم نے سانپ کی تلاش میں گزار دیا۔ بین بجانے والا بھی بلایا لیکن کوئی بات نہ بنی۔ سیانوں نے فیصلہ کیا کہ گھر کے باہر کی نالیاں بند کر دی جائیں اور دروازوں کی نیچے پٹیاں لگوائی جائیں۔ اس طرح اگر سانپ باہر چلا گیا ہے تو اندر نہیں آ پائے گا۔ میرے دوست میرے ساتھ رات بھر رہے۔ دوسرے دن ہم نے سانپ کو پھر سے ڈھونڈنا شروع کیا۔ اس دوران ہم نے دیکھا کہ میری بیگم کمرے میں ننھے سعد کے ساتھ سوئی ہوئی ہے۔ حاجی یعقوب نے کہا کہ بہتر ہے اُس کو اُٹھاؤ اور بتاؤ کہ سانپ گھر میں ہی ہے۔ اسے اُٹھایا اور بتایا کہ جی گھر میں سانپ گھس آیا ہے اور لگتا ہے کہ ابھی تک باہر نہیں گیا اسے کہا کہ اپنی اور بچے کی حفاظت کرو ابھی ہم نے سانپ تلاش کرنے کے لئے دروازہ بند ہی کیا تھا کہ محترمہ خراٹے لینے لگیں اور ننھا سعد بھی غوں غاں کر رہا تھا۔

ایک بار پھر سب ایک دوسرے کو تسلی دینے لگے۔ مجھے ابھی بھی چین نہیں آ رہا تھا میں نے کہا جب تک سانپ نہ ملے ہم چین سے نہیں بیٹھ سکتے۔ حاجی یعقوب نے سب جگہ چھان لی۔ تمام باہر کے

راستے بند کر دیئے کسی نے کہا کہ سنک کے نیچے سوراخ ہے اور وہاں ڈرینج پائپ میں کہیں نہ چھپا ہو۔حاجی یعقوب نے آؤ دیکھا نہ تاؤ بازو اُس سوراخ کے اندر ڈال کر خوب گھومایا پھرایا اور کہا کہ دیکھو کچھ بھی نہیں ہے۔کسی نے اُبلے پانی کی بالٹی سنک میں ڈال دی۔ یہ سوچ کر کہ اگر کہیں بھی سانپ ہوتو وہ نکل کر باہر آجائے گا یا گھر سے باہر چلا جائے گا یا کچن میں سنک کے نیچے سوراخ سے باہر آجائے گا۔گرم پانی ڈالنے سے تو کچھ نہیں ہوا۔البتہ اسی اثناء ٹھنڈے پانی کا نلکا اچانک پھٹ گیا۔ پانی تیزی سے بہنے لگا۔ہم اسے بند نہ کر پائے ۔گلبہار میں پہلوان سنیٹری والے کو اطلاع دی کہ جلدی گھر پہنچو جب تک پہلوان آیا تو تب تک گھر میں ٹخنوں تک بھر چکا تھا۔تمام بیرونی راستے تو ہم نے پہلے ہی بند کر دیئے تھے۔ پانی ایک ایک فٹ ہر جگہ کھڑا تھا، کچن میں بھی پانی تھا۔اچانک کسی کی نظر سنک کی نیچے پڑی۔وہ جگہ جہاں حاجی یعقوب ہاتھ مار کر اچھی طرح تسلی کر چکا تھا وہاں سے ایک کوبرا سانپ اپنا سر نکالے ہمیں دیکھ رہا تھا۔ پہلوان سنیٹری والا اپنے ساتھ دونالی بندوق لے کر آیا تھا۔اس نے حالات کا جائزہ لیا اور کہا کہ میں اس پر فائر کروں گا اور سانپ مر جائے گا۔وہ ایک دہشت ناک منظر تھا۔ہیرو پہلوان نے ڈبل بور رائفل سے سانپ پر فائر کیا۔سانپ نے سر نیچے کر لیا اور وہ صاف بچ گیا۔اب سانپ بھی بپھر گیا۔اُس نے سر کچھ اور اوپر کر لیا۔سخت پریشانی تھی کہ اسے کس طرح قابو کیا جائے۔ سانپ اور وہ بھی بڑا خطرناک ۔حاجی یعقوب نے کمال ہوشیاری سے بیلچے کے وار سے سانپ کو زخمی کر دیا اور بیلچہ اُس کی گردن پر اس وقت تک رکھا جب تک وہ مر نہیں گیا۔ یہ سانپ لگ بھگ دو میٹر لمبا تھا۔

ہم نے مرا ہوا سانپ اٹھایا اور باہر لیجا کر نمائش کے لئے رکھ دیا۔خبر علاقے میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی قریبی گھروں سے لوگ سانپ دیکھنے آ گئے ایک میلہ سا لگ گیا۔ وہیں کچھ مزدور بھی تھے جنہوں نے یہ عمارت بنائی تھی ۔ انہوں نے ہمیں بتایا کہ اسی قسم کا ایک سانپ انہوں نے عمارت بناتے وقت مارا تھا اس کا مطلب یہ لیا گیا کہ غالباً یہ جوڑا تھا۔سانپ سے متعلق مشہور ہے کہ جب جوڑے

میں سے ایک مرجائے تو دوسرا سانپ اُدھر ہی بے چینی میں گھومتا رہتا ہے۔ اور انتہائی خطرناک ہوجاتا ہے ہر آنے والی چیز کو ڈستا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ سانپ اپنے مرنے والے ساتھی سانپ کی آنکھوں میں مارنے والے کو دیکھ لیتا ہے اور اس کی تلاش میں وہیں رہتا ہے۔ اس واقعے کے بعد مجھے سانپوں سے شدید خوف رہنے لگنے لگا آج تک ڈر اور خوف قائم ہے۔

خیبر روڈ فلیٹ کے کچھ واقعات اور بھی ہیں مثلاً میں پشاور لیڈی ریڈنگ ہسپتال، سرجیکل بی وارڈ کا سینئر رجسٹرار تھا۔ ہسپتال کی گیلی سیڑھیوں سے سلپ ہوگیا اور میرے پاؤں کی ایک ہڈی میں فریکچر ہوگیا۔ پلستر لگا۔ ایڑی پر ایک خصوصی پلستر کا کپ لگایا گیا۔ میں گھر میں دو تین ہفتے کیلئے محصور ہو گیا۔ یہ تین ہفتے مکمل طور پر گھر میں رہنے کا تجربہ انتہائی بوریت اور اذیت کا تھا۔ پہلی بار اندازہ ہوا کہ ہماری خواتین کو بطور رہاؤس کس قدر اُکتاہٹ ہوتی ہوگی۔ میں ایک ہاکی کے سہارے گھومتا پھرتا تھا۔ چھت نسبتاً کم سطح کی تھی گرمی کے دن تھے اوپر والی منزل پر مقیم خواتین سینڈل سمیت جب چلتی تھیں تو ٹک ٹک کی آوازیں ہمیں نیچے آتیں۔ ایک رات جب چھت پر بڑی تعداد میں مچھر تھے۔ تو میں نے ہاکی سے اُنہیں مارنا شروع کر دیا۔ اگلے دن اے آئی جی احسن مختار مجھے کہنے لگے یار آپ ہمیشہ ہمارے پاؤں کی ٹک ٹک کی شکایت کرتے ہیں۔ مگر مجھے یہ سمجھ نہیں آئی کہ رات کو آپ کے گھر کی چھت پر ٹک ٹک کر کے کون اُلٹا چل رہا تھا۔ مجھے اس بات سے بڑی خفت ہوئی اور محظوظ بھی ہوا۔ میں نے انہیں حقیقت بتائی پھر ہم خوب ہنسے۔ اور آئندہ ہاکی سے میں نے مچھر مارنے بند کر دیئے۔

9 محرم کو اطلاع آئی کہ جلدی سے ہسپتال پہنچو۔ میرے دوست حسینی (مرحوم) زنجیر زنی کرتے ہوئے زخمی ہو گئے تھے۔ پلستر والی ٹانگ سمیت جب میں ہسپتال پہنچا تو دیکھا کہ ایک چھ انچ لمبے بلیڈ کا ساڑھے چار انچ حصہ چھاتی میں اندر تک گیا ہوا تھا۔ اس کے باوجود وہ ہوش میں تھا۔ دل کی حرکت کے ساتھ یہ بلیڈ بھی ہل رہا تھا۔ بڑی ایمرجنسی تھی۔ میں جلدی سے اُسے آپریشن تھیٹر لے گیا چونکہ

میں نے کارڈ یک سرجری کی ہوئی تھی لہذا اُس کی چھاتی کو اعتماد سے کھولا تو دیکھا کہ تیز دھار والا زنجیر کا بلیڈ دل کی جھلی میں دھنسا ہوا تھا جو میں نے آسانی سے نکال دیا جبکہ دل کو ضرر نہیں پہنچا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ محرم کے دوران جب حسینی بہت جوش سے زنجیر زنی کرتے تو قریب میں کھڑے دوسرے ماتم کناں ان کا ہاتھ پکڑ لیتے اسی طرح حسینی نے بھی کسی زنجیر زنی کرنے والے کا ہاتھ پکڑنے کو کوشش کی تو زنجیر کا ایک بلیڈ کڑی سے نکل کر حسینی کے سینے میں دھنس گیا۔ بحر حال اس گھر میں ہم چند ماہ رہے۔ مارچ 1981ء میں مجھے ایوب میڈیکل کالج ایبٹ آباد میں اسسٹنٹ پروفیسر کی جاب مل گئی اور ہم ایبٹ آباد منتقل ہو گئے۔

سیٹھی مسجد مانسہرہ روڈ ایبٹ آباد:۔

یوں ہمارا پانچواں گھر سیٹھی مسجد مانسہرہ روڈ ایبٹ آباد تھا۔ جہاں ہم اپریل 1981ء سے اکتوبر 1981ء تک چھ ماہ رہے یہ گھر ہم نے ماہانہ کرائے پر لیا جو تین کمروں پر مشتمل اور صوبے کے سابق وزیر اعلیٰ خان عبد القیوم خان کے گھر سے متصل تھا۔ کچھ حسیں یادیں اس گھر سے بھی جڑی ہیں۔ گھر میں پانی کی موٹر خراب پڑی تھی میں نے صدیق نامی ایک سنیٹری ورکر کی خدمات حاصل کیں۔ ٹھیک کر کے اپنے مزدوری لے کر چلا گیا۔ دوسرے دن معلوم ہوا کہ مشین ٹھیک کام نہیں کر رہی اُسے دوبارہ بلوایا اُس نے انتہائی معذرت کی اور چند گھنٹے لگا کر پمپ ٹھیک کیا اور مزید مزدوری لئے بغیر روانہ ہو گیا۔ میں اُس کے رویے سے بہت متاثر ہوا اور بعد میں صدیق اور اُس کی ضعیف والدہ کے ساتھ میرے خاندانی روابط رہے۔ صدیق نے بہت ترقی کی اور آج کل بہت صاحب ثروت اور میرے بچوں جیسا ہے۔

شروع کے دن تھے۔ وقت بہت تھا۔ کلینک کے اوقات سے پہلے اور بعد میں ایبٹ آباد کمیونٹی ہال وغیرہ کی محافل میں شرکت سے صاحبان زوق اور اہل زوق سے تعلق قائم ہوا۔ یوں ہمارے گھر میں بھی ادبی وسماجی محفلیں منعقد ہونا شروع ہوئیں۔ ان میں چند سکول ٹیچرز مرد و خواتین بہت فعال تھیں۔

پشاور سے آئے ہوئے میرے دوست حاجی مختیار نے کئی باران محافل میں شرکت کی اور شرکاء کی تخلیقی، ذہنی اور شخصیاتی خوبیوں سے متاثر رہے۔ وائے خوبیِ نصیب کہ میری بیگم کی منہ بولی ماں ''بجے ماں'' کو یہ محفلیں کچھ زیادہ نہ بھائیں اوران کی خواہش پرمحافل کا یہ سلسلہ منقطع ہوگیا۔ البتہ میرا کلینک کامیاب ہو گیااورمریضوں کی بڑی تعداد کی وجہ سے تقریبات کے لئے وقت بھی کم پڑ گیا۔

کلائمکس فین ہاؤس جناح آباد، ایبٹ آباد اور عزیز صاحب سے ہماری جان پہچان:۔

ہمارا اگلا ٹھکانہ (چھٹا گھر) جناح آباد میں 4 کنال پر محیط کلائی میکس فین کے مالک عزیز صاحب کا گھر تھا۔ یہاں ہم نومبر 83-1981ء کے آخرتک رہے۔ یہ گھر مجھے حاجی لطیف (مرحوم) پاکستان ریڈیو والے جو کہ کلائی میکس پنکھوں کے لوکل ڈیلر تھے نے خصوصی سفارش پرعزیز صاحب سے لے کر دیا۔ یہ تین بیڈرومز کا ایک ماڈرن گھر تھا۔ ایک وسیع اور عریض لان میں میری بیگم نے اپنی باغبانی کا شوق پورا کیا۔ ہمیں ایک نئی پہچان ملی۔ عزیز، دوست اور اقارب کی میزبانی کا شرف حاصل ہوا۔ عزیز صاحب سال میں چند دنوں کیلئے گھر کے اوپر والے حصے میں آ کر رہتے۔ مجھ سے دوستی ہوگئی انہوں نے بتایا کہ میاں نواز شریف کے والد میاں شریف پاکستان بننے سے پہلے ان کے لئے کام کرتے تھے۔ اُس زمانے میں عزیز صاحب دوموریا پُل لاہور کے قریب دکانوں میں پنکھا سازی کا کاروبار کیا کرتے تھے۔

اس مکان میں ایک بار میں شدید بخار میں مبتلا ہوا تو میری بیگم نے ناسمجھی میں قریب ترین ڈاکٹر جوایک گائنا کالوجسٹ تھی کو بلوالیا۔ ڈاکٹر نے مجھے دیکھا اور ہنستے ہوئے بیگم سے کہا کہ ڈاکٹر طارق صاحب کا گلہ خراب ہے نہ کہ انہیں گائنا کالوجسٹ کی ضرورت ہے اس لئے کسی اور ڈاکٹر کو بلایا جائے۔ چنانچہ ای این ٹی سرجن بلوائے گئے۔ دوسری طرف بیگم نے پشاور میں بھی بیماری کی طلاع کر دی تھی، لہذا شام تک کئی گاڑیوں میں مہمانوں کی بڑی تعداد عیادت کیلئے پہنچ گئے یوں محفل کا سماں ہوگیا۔

N - 13 جناح آباد، ایبٹ آباد:۔

13-N جناح آباد سترہ مرلے پر محیط ایک پلاٹ میں نے 1982ء میں خریدا اور ایک سال میں اُس پر چار بیڈ روم کا گھر تعمیر کر لیا۔ یہ ہمارا ساتواں مگر ذاتی ملکیت کا پہلا گھر تھا۔ ہم یہاں 1983ء کے آخر میں شفٹ ہو گئے۔ اپنے ذاتی گھر میں منتقل ہونا بلاشبہ خوشی کا باعث ہوتا ہے اور ہم بھی یقینی طور پر بہت خوش تھے۔ ہم یہاں چار سال رہے۔ مہمانوں کی وجہ سے اکثر گہما گہمی رہتی تھی۔ ساتھ والا سوا کنال کا پلاٹ میں نے اپنے سسر کیلئے خرید لیا۔ چار دیواری کر کے اسے اندر سے اپنے گھر سے منسلک کر دیا۔ جیسا کہ پہلے ذکر ہوا میری بیگم کو باغ بانی کا بہت شوق تھا یہاں پر ہم نے سبزیاں اُگائیں جو اس قدر زیادہ ہوتی تھیں کہ ہم محلہ میں بانٹتے اور پشاور بھی عزیز و اقارب کو دینے ساتھ لے آتے۔ مجھے اپنی بیٹی عائشہ کا پیار کرنے والا وہ انداز آج بھی یاد ہے جب وہ تین سال کی تھی کہ ایک دن مجھے گاڑی سے نکلتے ہوئے خوش آمدید کہنے آئی اور بوسہ لینے کے انداز میں میری جانب دیکھا تب مجھے احساس ہوا کہ بیٹیاں کتنی محبت والی ہوتی ہیں۔ ہمارا ملازم بابا خانی زمان جو کوٹھیالہ شیروان کا رہنے والا تھا ہمارے ساتھ بڑی وفاداری سے 10 سال رہا۔ حفاظت کیلئے جرمن شیپرڈ (السیشن) کتیا ہم نے پال رکھی تھی۔ جس سے بہت بچے بھی پیدا ہوئے۔ سکن سپیشلسٹ ڈاکٹر رضا خان پشاور سے ایک مرتبہ اپنا ہاتھی سائز کا السیشن کتا مجھے تحفتاً دے گئے۔ یہ کتا اکثر ہمارے گھر کی پردہ وال کراس کر کے سڑکوں پر گھومتا پھرتا۔ پولیس والوں کا دشمن تھا۔ ایک بار پولیس والوں کے کپڑے بھی اُس نے پھاڑ دیئے۔ آخر کار ہمیں اُس سے جان چھڑانا پڑی۔ کتوں کا آنا جانا اور تربیت کے لئے خصوصی ماہر آتے۔ جنہیں میری بیٹی کتوں کا استاد محترم سمجھتی تھی۔

میرے دوست واجد (مرحوم) نے اپنے جاننے والے بنگش صاحب اور ان کی فیملی کو میرے پاس اس غرض سے بھیجا کہ میں انہیں جناح آباد میں فروخت ہونے والے گھروں کی سیر کراؤں کیونکہ وہ ایبٹ آباد میں آباد ہونا چاہتے تھے۔ چند گھر دکھائے واپسی پر انہیں چائے پلانے اپنا گھر لا یا اور رخصت کر

دیا۔شام کو واجد کے بلوانے پر میں وہاں گیا تو بنگش صاحب وہاں موجود تھے کہنے لگے کہ اُن کے بچوں کو صرف میرا گھر پسند آیا اور وہ ہم سے یہ گھر خریدنے پر اصرار کر رہے ہیں ۔ میں نے انکار کر دیا مگر واجد (مرحوم) نے مجھے مجبور کر دیا اور اس طرح اس گھر کا سودا دس لاکھ میں ہو گیا جبکہ چار سال پہلے مجھے یہ چار لاکھ کا پڑا تھا۔

A - 78 جناح آباد، ایبٹ آباد:۔

اس شفٹنگ اور پرانے مکان بیچنے کے درمیان کا ایک سال/ ڈیڑھ سال کا عرصہ ہم نے بطور کرایہ دار ملک سرور کے گھر میں بسر کیا۔ یوں یہ آٹھواں گھر دیکھا جو ذرا تنگ تھا لیکن ہماری ضروریات پوری کرتا تھا اور چونکہ بالکل نئے زیر گھر تعمیر کے ساتھ ملحق تھا تو مجھے بڑی سہولت ہوتی۔ آتے جاتے اپنی مکان کی تعمیر دیکھتا۔

77۔ جناح آباد، ایبٹ آباد اور سکون !:۔

40 مرلے پلاٹ 77 جناح آباد ایبٹ آباد تین لاکھ بیس ہزار روپے کے عوض 1987ء میں میرے ایکسین دوست ملک محمد سرور (مرحوم) جو سی اینڈ ڈبلیو اور ایوب میڈیکل کالج کے پراجیکٹ انجینئر تھے کے اصرار پر ان کے گھر سے متصل گھر واقع سٹریٹ نمبر 11 خریدا۔ ملک سرور کا کہنا تھا کہ اگر میں نے گھر بیچ کے دوسری جگہ بنانا ہے تو وہ دوسری جگہ ان کے ساتھ والا گھر کیوں نہ ہو۔ ان کے ساتھ ہمارے تعلقات بہت پہلے یعنی گلبہار پشاور میں بڑوے بزرگوں کے زمانے سے چلے آرہے تھے۔ ملک سرور بنیادی طور پر صوابی سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے والد پشاور گلبہار میں میرے والدین اور سسر کی رہائشی گلی میں مسجد کے قریب رہتے تھے۔ غالباً وہ بھی سرکاری ملازم تھے۔ ان کی بیگم بانو بہن انتہائی شائستہ خاتون تھیں۔ ملک سرور کی چار بیٹیاں اور دو بیٹے ہیں۔ جن میں زیادہ تر امریکہ میں مقیم ہیں۔ ایبٹ آباد میں ان کی بڑی بیٹی اور اس کے بچے مقیم ہیں جبکہ ان کا بیٹا علی آرمی میں خدمات انجام دے رہا ہے۔ پھر انہی کی وساطت سے میر محی الدین جو نیسپاک میں تھے اور ایوب میڈیکل کالج کے پراجیکٹ میں سینئر

انجینئر تھے سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے میرے گھر کا ڈیزائن اور نقشہ بنوا دیا۔قاضی علی اصغر جنہوں نے میرے پچھلے گھر کی تعمیر کے دوران ٹھیکیدار کے ساتھ تنازعہ کے حل کرنے میں بہت مدد کی تھی کو میں نے ورک لیبر سپر وائز کرنے کو کہا جو انہوں نے بڑی جان فشانی سے کیا۔ یہ گھر تعمیر کرتے وقت میرے پاس خاصے پیسے موجود تھے جو پچھلے گھر کی تعمیر کے وقت نہیں تھے ۔ ہاؤس بلڈنگ سے قرض بھی لیا۔گھر کی بنیادوں میں قاضی صاحب ایک خاص ڈیزائن سے پتھر لگواتے تھے۔جس کو وہ دوسلو کہتے تھے ۔ دوسلو شاید ہر دو پتھروں کے بعد ایک پتھر لمبے طریقے سے رکھنے کو کہتے ہیں اور اس طرح یہ ایک بڑا مضبوط جائنٹ بنتا ہے۔شاید یہ دوسلو کی ہی وجہ ہو کہ 8 اکتوبر 2005ء کے زلزلے اور اس کے علاوہ بھی مزید زلزلوں کے بعد آج تک الحمدللہ اس گھر میں کوئی کریک یا سٹرکچر فالٹ نہیں آیا۔ بہرحال اس کے بعد مکان بنتا رہا معماروں میں سب سے نوجوان معمار جس کا نام فرید تھا۔ وہ ہم سے منسلک رہا اور درحقیقت میرے مکان بننے کے بعد ہم بھی اُسے کریڈٹ دیتے رہے۔ وہ بھی کہتا رہا کہ جی یہ مکان مکمل طور پر اُس نے بنایا ہے۔اور اس مکان کی تعمیر کی بنیاد پر اسے بہت سارے دیگر مکانات کی تعمیر کا کام بھی مل گیا۔ میں مکان کی تعمیر کے دوران بیگم کو لے کر یورپ کے دورے پر چلا گیا اور اُسی دوران حج بھی کیا، مکان کی تعمیر کے دوران نگرانی انجینئر صاحبان کرتے رہے۔ مجھ سے کسی نے معاوضہ طلب نہیں کیا۔ یہ مکان تقریباً سترہ لاکھ روپے کی لاگت سے مکمل ہوا اور ہم یکم جنوری 1989ء کو اس میں شفٹ ہو گئے ۔ اس گھر میں بلاشبہ ہمیں بہت سکون ملا۔ گھر کی تعمیر کے دوران جن لوگوں نے تعمیر میں حصہ لیا۔ اُن میں کارپینٹر منظور اور اُس کے اُستاد حمید قابل ذکر ہیں۔

یہ تعمیر اس قدر مضبوط ہے کہ جب ہم اپنے بیٹے ڈاکٹر سعد کی شادی کے موقع پر دو باتھ روم Re-finish کرنے لگے تو بڑی مشکل درپیش آئی اور سیمنٹ یا چپس ٹوٹ نہیں پا رہی تھی۔ لہذٰا اس کے اوپر ہی ٹائلیں لگا دی گئیں اور باقی کے دو باتھ رومز جو ٹھیکے میں شامل تھے بغیر ری فرنش کئے چھوڑ دیئے

گئے۔ اس گھر میں دو پورشن ہیں۔اوپر والا پورشن جس میں ہم خود رہتے تھے اُس میں چار بیڈ رومز تھے۔ تین بچوں کیلئے اور ایک ہمارے لئے گھر کے نچلے والے پورشن میں کچن اور کامن لاؤنج شامل تھا۔ہم نے اپنے والدین کیلئے اُس میں ایک کمرہ ان کی مرضی کے مطابق بنایا اس کے علاوہ ایک گیسٹ روم تھا۔نچلا پورشن ہمیشہ کھلا رہتا اور جتنے مہمان آتے اس میں پورے آ جاتے لیکن اگر مہمان زیادہ ہوتے تو اوپر والے پورشن میں بھی بھرے رہتے تھے۔ایک وقت تو ہم نے محسوس کیا کہ اب اتنے مہمان آنے لگے ہیں کہ صبح کے وقت ناشتے کی جگہ نہیں ہوتی۔لہٰذا پیچھے لان میں گیراج اور سرونٹ کوارٹر کے متصل ایک چھپڑ ڈال کر اُس کے نیچے ٹیبل ٹینس کی ٹیبل اور سرونگ ڈشز خرید کر مستقل رکھ دی تھیں جہاں بسا اوقات مہمان ناشتہ کرتے۔جو پہلے اٹھتے وہ جا کر ناشتہ کر لیتے اور یوں یہ سلسلہ جاری رہتا۔کبھی کبھار تو دوپہر کا کھانا بھی وہیں لگا دیا جاتا۔اس گھر میں میرے ایبٹ آباد کی پروفیشنل لائف کے سب سے زیادہ سال گزرے۔کئی اہم مواقع یعنی میری شدید بیماری، بچوں کے ختم قرآن دیگر تقریبات جن میں میرا چیف ایگزیکٹیو/ پرنسپل بننا یا سروس سے ریٹائرڈ ہونا شامل تھا میں مہمانوں کی بڑی تعداد شرکت کرتی جبکہ اسی گھر میں تینوں بچوں کی شادیاں بھی ہوئیں۔موجودہ وقت میں اس گھر میں میرا بیٹا ڈاکٹر سعد اُن کی بیگم عائشہ اور ہماری پوتی لائبہ رہائش پزیر ہیں۔

خوشحال باغ، ورسک روڈ کا تجربہ رہائش !:۔

80 کی دہائی میں یہ کالونی بہترین منصوبہ بندی سے بنی تھی۔ہم سب نے اس میں پلاٹ خریدے۔میرے سسر، میری بہن اور میرے ماموں یوسف قریشی نے یہاں مکان تعمیر کئے۔2008ء میں، میں جب میں کوہاٹ انسٹی ٹیوٹ فار میڈیکل سائنسز میں تعینات تھا تو کچھ عرصہ خوشحال کالونی ،ورسک روڈ پر ہمشیرہ پینزی کے گھر اپنی والدہ کی وجہ سے رہا۔ جو 1997ء میں والد کی رحلت کے بعد تا حیات انہی کے گھر میں رہیں۔میرا دل چاہا کہ میں والدہ کی رہائش کے قریب اپنا گھر خرید یا تعمیر کر

لوں۔ایک سنگل گھر بالکل سامنے مل گیا۔جس کی دوسری منزل میں نے اپنی رہائش کے لئے خود بنوائی اور میرے بھانجے ارسلان پاشا کے سسر شیخ اعجاز نے اپنی نگرانی میں خوبصورت کام کروایا۔اس مکان میں ہم تقریباایک سال رہے۔کچن کی کھڑکیوں سے میرے رشتے کے بھتیجے خالد اقبال کا وسیع اور دیدہ زیب صحن اور باغ والا گھر'چنار ہاؤس' یوں لگتا تھا کہ جیسے ہمارے گھر کا حصہ ہو۔ یہ ہمارا دسواں گھر تھا۔ ہر رات گئے چوکیدارا اپنے ایک درجن کتوں کے ساتھ چہل قدمی کرتا اور ہمیں و یقینا دیگر رہائشیوں کومتفرق اقسام کی غلیظ گالیاں سکھاتا تھا!!! میں وہیں سے روزانہ کوہاٹ آتا جاتا۔میری والدہ کچھ عرصہ بعد وفات پا گئیں۔جس کے بعد ہمارا اس گھر میں دل نہ لگا۔

2 - A پارک ویو اپارٹمنٹس، کنال روڈ، پشاور کے آٹھ سال!:۔

میں نے اور میری بیگم نے کوئی دوسری جگہ رہنے کیلئے تلاش شروع کردی۔اتنے پیسے نہیں تھے کہ ہم بڑی جگہ کسی معقول کالونی میں پلاٹ و مکان خرید لیتے۔لہذٰا متعدد مختلف جگہیں دیکھنے کے بعد ہم پارک ویو اپارٹمنٹس (جو کہ چارسدہ کے میاں گان کی شراکت سے بنے تھے) میں منتقل ہو گئے (یہ ہمارا گیارہواں گھر تھا) پہلا گھر اچھی قیمت بعوض (پینتالیس لاکھ) میں بک گیا۔پارک ویو ایک اچھی رہائشی کالونی ہے۔آٹھ سال یہاں ہم بڑی آسودگی سے رہے۔آخری سالوں میں یہاں ایک شادی ہال بن گیا جس سے ہماری ذاتی زندگی کے امور متاثر ہونے لگے۔رات گئے تک شور شرابہ، ہنگامہ اور گانا بجانا جاری رہتا۔چند گانے اس قدر سنے کہ مجھے یاد ہو گئے۔کمیونٹی رہائش کے مسائل میں ایک یہ بھی ہے کہ اوپر والوں کا نلکا لیک ہوتو دیواریں نیچے رہنے والے فلیٹ کی خراب ہوجاتی ہیں۔جو تعمیراتی نقصان اور بدنمائی کے علاوہ تعفن کا باعث اور مضر صحت بھی بنتی ہیں۔یہ کام اکثر و بیشتر ہوتا رہتا اور ہم گراؤنڈ فلور پر رہنے والے سب سے زیادہ متاثر ہوتے چونکہ اصل مالکان یا کرایہ دار اس مسئلے کو حل کرنے میں ہمیشہ تاخیر کرتے۔ شامت اعمال مجبوراً ہمیں یہ بوجھ اُٹھانا پڑتا۔

A - 32 شامی روڈ، پشاور:۔

بیگم کے اصرار نے مجھے مزید مکان تعمیر کرنے پر مجبور کر دیا۔ہم نے گالف کلب کے قریب واقع اولڈ شامی روڈ پر ایک کنال کا پلاٹ خرید کر ایک مکان تعمیر کیا۔ ہم اپنے بارہویں گھر میں جون 2019ء کو شفٹ ہو گئے۔ اب جبکہ ہم تقریباً چار سال سے یہاں مقیم ہیں۔ ہمیں اللہ پاک کی خصوصی عنایت کا احساس ہو رہا ہے اور بیگم کے ازلی شوق یعنی باغبانی کی بھی تشفّی ہو رہی ہے۔ اللہ پاک ہمیں یہاں سکون عافیت، عزت، آبرو و آسودگی سے رکھے۔

باب نمبر 13

تندرستی ہزار نعمت ہے

انگریزی کا محاورہ ہے کہ First and last love is self love یعنی پہلی اور آخری محبت اپنی جان سے ہوتی ہے۔خود پرستی شیوہ انسان ہے یعنی یہ عین بشری تقاضہ ہے کیونکہ انسان عقلی تقاضوں کو پورا کرنے سے پہلے جسمانی تقاضوں کا محتاج ہوتا ہے۔انسانی صحت اس جسمانی تقاضے کا بنیادی عنصر ہے۔

بقول شاعر:

تنگدستی اگر نہ ہو سالک

تندرستی ہزار نعمت ہے۔

اکثر اوقات صحت کی قدر اُس وقت تک نہیں آتی جب تک کہ کوئی بیماری یا معذوری نہ ہو جائے یا اس سے متعلق تشویش شروع نہ ہو جائے۔ مجھے اپنی صحت سے متعلق احساس اُس وقت ہوا جب میری والدہ شٹل کاک برقع میں ملبوس ہم بہن بھائیوں سمیت تحصیل گور کٹھری کے سامنے وڈے بازار کی اترائی پر واقع ڈاکٹر یوسف علی کے کلینک گئیں۔ایک کمرے پر مشتمل یہ کلینک مجھے انتہائی متاثر کن لگا۔ڈاکٹر یوسف علی سفید پینٹ شرٹ اور سفید ڈاکٹری کوٹ پہنے بڑی عمر کے ایک خوبصورت انسان تھے جن کی چھوٹی سفید ی مائل داڑھی ایک نمایاں نشانی کی طور پر میرے ذہن میں رہ گئی۔ مجھے کیا بیماری تھی یا اُنہوں نے میرا معائنہ کیا یا نہیں یہ یاد نہیں۔بہر طور اُنہوں نے میرا منہ کھلوا کر میرے حلق میں ایک روئی کے بوڑے والی تیلی سے کوئی دوائی لگائی جس کا ذائقہ حلق چننے والا تھا اور بڑی دیر تک قائم رہا (اس دوائی میں شاید پھٹکڑی کا عنصر بھی ہو)۔غالباً مجھے گلے کا انفیکشن جسے عرف عام میں ٹانسل کہتے تھے ہو گیا تھا۔

اُنہی دنوں ہمارے گھر واقع گنج پشاور میں کچھ بے چینی اور اضطراب کے آثار نظر آئے۔معلوم ہوا میرا چھوٹا اور پیارا بھائی سنی بیمار ہو گیا تھا۔کسی کو اسکے قریب جانے کی اجازت نہ تھی۔ پھر یوں محسوس ہوا

کہ وہ گھر سے گم ہو گیا ہے۔کئی سالوں بعد بتایا گیا کہ سنی چیچک کی بیماری سے فوت ہو گیا تھا۔یہ واقعہ غالباً پچاس کی دہائی کے شروع میں رونما ہوا۔شاید اُس زمانے تک ہمارے ہاں چیچک بڑی عام بیماری ہوا کرتی تھی۔میرے چھوٹے ماموں میاں محمد یوسف قریشی ایڈوکیٹ کے چہرے پر بھی نشانات تھے جو بتائے بغیر مجھے اُن کے ماضی میں چیچک کے مرض میں مبتلا رہنے کا احساس دلاتے تھے۔ہمارے گھر میں ایک ڈسپنسر آیا کرتا اور ہمارے بازو پر پانچ نوکی آلے سے کوئی دوائی پنچ کرتا تھا۔یہ چیچک کی ویکسین تھی۔ اس کے تین عدد زخم چند دن بعد مندمل ہو جاتے۔

اسی دورانیہ میں لیڈی ریڈنگ ہسپتال پشاور میں اس زمانے کے مشہور ڈاکٹر عبد الخالق جو سرجری بھی کیا کرتے تھے سے میری ملاقات لیڈی ریڈنگ ہسپتال پشاور میں آپریشن تھیٹر میں ہوئی۔بیڈ پر مجھے نیند آنے لگی پھر کانوں میں ڈرم بجنے کی آواز آہستہ آہستہ معدوم ہو کر ختم ہو گئی۔کچھ عرصہ بعد مجھے معلوم پڑا کہ غالبا میرا کوئی چھوٹا موٹا آپریشن ہوا تھا۔چند ایک بار وڈے بازار کی مصروف ڈسپنسری کی بھی سیر ہوئی۔سرخ پینٹ شدہ دیواروں والے کمرے میں عملے کے ارکان انجکشن اور ویکسین لگانے میں مصروف ہوتے تھے۔یہ ڈسپنسری میرے ڈاکٹر بننے کے بعد 1970ء میں بھی قائم تھی۔موجودہ وقت میں بھی وہاں شاید ڈسنپسری یا بی ایچ یو قائم ہو۔

گھنٹہ گھر کے نیچے ڈاکٹر موسیٰ جو غیر کوالیفائیڈ لیکن بہت مصروف ڈاکٹر تھے کے کلینک پر بھی کبھی کبھار حاضری بھی دی جاتی۔یہ کلینک تنگ اور لمبوترا یعنی گلی نما تھا۔مریض بنچوں پر بیٹھتے جبکہ ڈاکٹر صاحب کی ڈسپنسری آخری سرے پر ہوتی تھی۔ہر کلینک میں ایک واضح ڈسپنسری کا ہونا ضروری تھا جس کے اندر مختلف رنگوں کی بوتلوں میں موجود کیمیائی محلول ہوا کرتے تھے جن کی آمیزش سے مختلف قسم کے نسخے بنائے جاتے۔سفید کاغذ سے بنی ہوئی ڈوز سلپ شیشے کی بوتلوں کے اوپر چپکا کر دوا مریض کو دی جاتی۔

مارکیٹ میں کمپنیوں کی سر بہ مہر دوائیاں مجھے اپنی میڈیکل تعلیم کے دوران تک یاد نہیں۔

فارما کالوجی ڈیپارٹمنٹ کے شوکیسوں میں کمپنی کی دوائی اور انجکشن کے چند نمونے ضرور تھے۔ ہمیں اس کی معلومات کم ہی دی جاتی تھی۔ جب میں چھٹی یا ساتوں جماعت میں تھا تو پہلی دفعہ بلوغیت کے آثار شروع ہوئے۔ میرے کلاس فیلو 'وہاب' جو مجھ سے عمر میں سال دو بڑا تھا اور محلہ ریتی میں والد کی دکان پر بیٹھتا تھا کی گفتگو سے کچھ اہم نکات تک رسائی ہوئی۔ مگر ذہنی کشمکش تھی کہ یہ سب ٹھیک ہو رہا ہے یا مجھ میں کوئی خرابی واقع ہو رہی ہے۔ آج کل مغربی تعلیم میں بلوغیت کے حقائق کا ادراک خصوصی طور پر شامل کیا گیا ہے جس پر بہت سے طبقے سیخ پا ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا والدین اپنے بچوں کے اس عمر کے ذہنی کرب سے آشنا ہیں اور ان کو خاطر خواہ معلومات مہیا کر پاتے ہیں یا نہیں؟ یہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ کم عمری میں جنسی مسائل کسی سے ڈسکس کرنا مناسب نہیں سمجھا جاتا حالانکہ موجودہ دور میں اس حوالے سے کم عمر بچوں اور بچیوں کو جنسی مسائل سے متعلق مکمل آگاہی کی ضرورت ہے تاکہ وہ نہ صرف برائیوں سے محفوظ رہ سکتے ہیں بلکہ خود کوئی بیماریوں سے بھی بچا سکتے ہیں۔

آٹھویں جماعت میں مجھے اپنے پرائیویٹ جسمانی مرض کے مبتلا ہونے کا وہم ہو گیا۔ شرم کے مارے کسی سے مشورہ بھی نہیں لے سکتا تھا۔ سوچتا رہا کہ کیا بنے گا۔ ایک دن جب میں اپنے نانی کے گھر واقع محلہ عطائی خان، ہشتنگری سے اپنی پھوپھو جی کے گھر ڈھکی شریف خان جا رہا تھا کہ راستے میں میری نظر چاچا یونس کی گلی میں بیٹھے ایک حکیم کے تھڑے نما کلینک پر پڑی۔ میں نے سوچا کہ حکیم صاحب تو مجھے نہیں جانتے کیوں نا انہی سے مشورہ کر لیا جائے۔ گھنٹہ ڈیڑھ تھڑے پر انتظار میں گزر گئے کہ وہ اکیلے ہو ں تو مسئلہ بتاؤں وہ بھی ٹیڑھی آنکھ سے مجھے دیکھ رہے تھے بلا آخر انہوں نے مجھے اپنے پاس بلوا لیا۔ میں نے اُنہیں صورت حال بیان کی اور انہوں نے مجھے ایک چھوٹی سبز رنگ کی گول ڈبیا میں مرحم استعمال کرنے کو دی۔ ایک اٹھنی (موجودہ وقت کے پچاس پیسے کے برابر) فیس لی۔ میں کئی ماہ تک اپنی ہر ضرورت اور آمدن سے بچائی ہوئی اس اٹھنی کو ہر ہفتے حکیم صاحب کی نذر کرتا رہا۔ آخر کار انہیں میری حالت پر رحم آ گیا

اور مجھے کسی بڑے ڈاکٹر کو دکھانے کو کہا۔

اس صورت حال نے پریشانی کو مزید بڑھا دیا۔ میرا اُٹھنا بیٹھنا محال ہو گیا۔ ڈاکٹر تو نظر میں بہت تھے۔ ایک ڈاکٹر اوپل صاحب (جو پروفیسر ڈاکٹر تاج بہادر اوپل کے والد تھے۔ اور ہمارے سکندر پورہ والے گھر کے ہمسائے بھی۔ بلکہ میں یہ کہوں کہ ہم اُن کے ہمسائے تھے تو غلط نہ ہو گا کیونکہ وہ ایک وسیع اوپل بلڈنگ کے مالک تھے اور اسی میں ان کی رہائش اور کلینک تھا یہ بلڈنگ اب بھی موجود ہے۔) ڈاکٹر اوپل ایک شفیق اور خوش اخلاق انسان تھے۔ میں نے ڈاکٹر اوپل کے پاس جانے کا سوچا مگر معلوم ہوا کہ وہ ملک چھوڑ کر بھارت جا چکے ہیں۔ اب کسی ایسے ڈاکٹر کی تلاش شروع کی جو مجھے نہ جانتا ہو، فیس بھی کم لیتا ہو اور میرا علاج بھی کر سکے شہر پشاور کی چار دیواری کے اندر مارا مارا پھرتا رہا۔ کسی نے ناصر خان چوک میں ایک ڈاکٹر کا پتہ دیا۔ میں اپنی عیدی اور پاکٹ منی لے کر اُن کے پاس پہنچ گیا ۔مرض کا بتایا انہوں نے معائنہ کئے بناء ہی کہہ دیا کہ یہ آتشک (Syphilis) کی بیماری ہے جس میں مجھے کئی ماہ ایک دقیق سا انجکشن لگانا ہو گا۔ دو روپے فیس ہو گی اور ہر ہفتے آنا ہو گا''۔ ہفتہ واری کا تو میں پہلے سے ہی عادی تھا۔ ہر ماہ دو ماہ بعد وہ پوچھتے کچھ افاقہ ہوا۔ میں کہتا کہ نہیں جی۔ آخر تقریباً دس یا گیارہ ماہ کے بعد وہ بھی ہمت ہار گئے۔ معائنہ کیا اور ہنسنے لگے۔ مجھے کپڑے سنبھالنے کو کہا اور تسلی دی کہ بیٹا یہ تو سب کچھ نارمل ہے۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا۔ میں بار بار اُن سے پوچھ رہا تھا اور وہ بار بار تسلی دے رہے تھے اور آئندہ نہ آنے کی ہدایت بھی کر دی۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ میرا فراٹے بھرتا ہوا دل ٹھہر گیا ہے اور شکریہ کے جذبات لئے پرسکون دل کے ساتھ گھر روانہ ہو گیا تب سے آج تک نارمل ہوں۔ اب خیال آتا ہے کہ کاش حکیم صاحب یا وہ کوالیفائیڈ ڈاکٹر صاحب میرا معائنہ شروع ہی میں کر لیتے تو کتنا اچھا ہوتا۔ میرے لئے یہ عرصہ نفسیاتی طور پر بڑے دکھ کا تھا۔

اسی دور میں مجھے ٹائیفائیڈ بخار ہو گیا۔ کوئی مخصوص ادویات نہ ہونے کی وجہ سے کہا گیا کہ

چالیس دن کے بعد خود ہی اُتر جائے گا۔کئی دن تک سکول سے چھٹی کی اور گھر میں آرام کرتا رہا۔بخار اُترنے کے کچھ دن بعد سکول جانے کی تیاری ہوئی شاید دو دن گیا بھی ہوں گا اس دوران سکندر پورہ میں ہمارا معمول تھا کہ فجر کی نماز مولانا فضل حق کی جامع مسجد میں پڑھ کر ہم بھائی اور دیگر دوست شاہی باغ فٹ بال کھیلنے جایا کرتے تھے۔لہذٰا بخار اترنے کے بعد میں پھر اُن کے ساتھ فٹ بال کھیلنے لگا۔میرے بڑے مرحوم بھائی نے مجھے تاکید کی کہ تم فٹ بال نہیں کھیلو گے بلکہ گراؤنڈ کے باہر آنے والے بال کو ہماری طرف پھینکو گے۔بال باہر آیا۔میں نے کک لگا کر اسے گراؤنڈ کے اندر تو پھینک دیا لیکن ٹانگ میں شدید درد اٹھا اور پتہ چلا کہ ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ گئی۔کئی ماہ پلستر لگا رہا اور سکول سے پھر چھٹی۔میرے بڑے ماموں میاں محمد اسماعیل قریشی کے لامحدود احسانات میں یہ بھی شامل ہے کہ میرے بھاری بھر کم جسم کو اپنی کمر پر اُٹھا کر ہمارے گھر کے کوٹھے سے سیڑھیوں کے ذریعے اُوپر نیچے لاتے لے جاتے تھے حالانکہ وہ اپنے علیحدہ گھر میں رہتے تھے۔بہرطور کچھ عرصہ بعد پلستر اتر گیا اور ٹانگ بالکل ٹھیک ہوگئی یوں ٹائیفائیڈ کے بعد فریکچر کا مسئلہ بھی حل ہوا۔

میٹرک کے دو سال اور ایڈورڈ کالج میں پری میڈیکل کے دو سال صحت کے لحاظ سے بہت اطمینان بخش تھے۔میٹرک کے بعد 1963ء میں مجھے پائلٹ بننے کا شوق ہوا تو ایئرفورس کیلئے مجھے آئی ایس ایس بی کے میڈیکل ٹسٹ میں معلوم ہوا کہ میری دور کی نظر کمزور ہونے کی وجہ سے میری سلیکشن نہیں ہوسکتی۔حیرت کی بات یہ ہے کہ نظر تو کافی عرصے سے کمزور ہوگی مگر مجھے احساس نہیں ہوا جب کہ میرے گھر میں چند سال پہلے چھوٹی بہن کی نظر کمزور ہونے پر اسے میں نے خود چشمے بنوا کر دیئے تھے اور خوب مذاق بھی اُڑایا تھا کہ اتنا عرصہ بن دیکھے ہی گزار لیا اور پھر بادل ناخواستہ مجھے خود بھی عینک لگوانا ہی پڑی۔ اور اب یہ میرا اٹوٹ انگ ہوگئی ہے۔

1965ء کی جنگ کے دوران جبکہ مجھے ابھی میڈیکل کالج میں داخلہ نہیں ملا تھا۔میرا آرمی

جائن کرنے کا شوق پھر سے اُبھرا۔ میں اور سعید کاکڑ جو میرے ممانی کے بھائی تھے فارم بھر کر کوہاٹ آئی ایس ایس بی تک پہنچ گئے لیکن اس بار بھی مجھے میڈیکل گراؤنڈ پر دل میں ایک مرمر (Murmur) ہونے کے وجہ سے ریجیکٹ کر دیا گیا۔ سعید کاکڑ (مرحوم) بھی آنکھوں میں کسی کمی کی وجہ سے کامیاب نہ ہوسکے۔

میڈیکل کالج کے تیسرے سال میں ایک شدید غلط فہمی کے بنا پر فینوباربیٹون کی اوورڈوز کا مرتکب ہوگیا۔ بمشکل جان بچی۔ اس حوالے سے چند دن لیڈی ریڈنگ ہسپتال میں گزارنے کا بطور مریض تجربہ بھی ہوا۔ چند اعلیٰ اخلاق کے مالک ڈاکٹر صاحبان سے شناسائی ہوئی جن میں ڈاکٹر علی مرحوم اور ڈاکٹر ولی آفریدی جو اُس وقت رجسٹرار سرجری تھے جیسے خوش خلق اور ملنسار ڈاکٹروں کا نقش ہمیشہ دل ودماغ پر نقش رہے گا۔ ان دنوں دوستوں و رشتہ داروں نے جس ہمدردی کا اظہار کیا وہ بھی یاد ہے۔ اس واقعہ نے مجھے زندگی میں جینے کا عزم اور حوصلہ دیا۔ جسے میں آج بھی شد و مد سے اپنائے ہوئے ہوں۔ ایک بار میرے بھائی خالد مفتی سال سوئم خیبر میڈیکل کالج میں مجھے ایک سائکاٹرسٹ ڈاکٹر شفیق کے کلینک واقع فقیر آباد بھی لے گئے۔

خیبر میڈیکل کالج میں تعلیم کے شروع کے سال میں اپنے آپ کو دوسروں کے مقابلے میں کئی لحاظ سے بحوالہ صحت کم تر سمجھتا رہا۔ ایم بی بی ایس سال سوئم میں مریضوں سے ہسٹری لینے کا جب موقع ملا تو حیرت کی انتہا نہ رہی کہ اللہ نے مجھے ان سب کے مقابلے میں بہتر جسم اور صحت دی ہے۔ شکر کی یہ کیفیت قائم ودائم ہے۔ میڈکل کالج میں میری نفسیاتی نشوونما ہوئی جس کا سہرا میں دوستوں کی خوش گپیوں کے علاوہ اپنی کھیلوں کی سرگرمیوں کو بھی دیتا ہوں۔

1971ء میں ہاؤس جاب کے دوران پاک بھارت جنگ کیلئے تمام ڈاکٹروں کو آرمی میڈیکل کور جوائن کرنا لازم تھا۔ یہ حسن اتفاق ہے کہ اس بار بھی آرمی میڈیکل ٹسٹ کے دوران یہ کہہ کر مجھے رد کر

دیا گیا کہ میرے دل میں مرمر (Murmur) ہے۔بعد میں کسی سٹیج پر دل کا ایکو (ECHO) امریکہ سے آئے ہوئے ایک ڈاکٹر خاور (خارو) نے کیا اور بتایا کہ معمولی درجے کا MVP ہے یعنی ایک وال میں پھلڑا ہے۔کوئی تشویش نہیں ہوئی اور زندگی کا کاروبار معمول کے مطابق چلتا رہا۔

1973ء سے لے کر 1979ء تک انگلینڈ میں رہائش کے دوران کام کی سخت مشقت، امتحانات کا ذہنی دباؤ، ملازمت کا حصول اور ازدواجی زندگی کی ذمہ داری کے باوجود سکواش سمیت مختلف کھیلوں میں حصہ لیتا رہا اور صحت کے معاملے میں کوئی غیر معمولی فکرمندی نہیں ہوئی۔معدے کی تیزابیت کبھی کبھار اُبھر کر سامنے آجاتی جسے میں نے خاندانی بیماری تصور کیا اور بس اس سے زیادہ کچھ نہیں۔1978ء ایک بار میری اہلیہ اور بیٹا میرے بھائی ڈاکٹر خالد مفتی سمیت ایک ٹریفک حادثہ میں شدید زخمی ہوگئے اور ہسپتال میں داخل رہے ان دنوں کسی حد تک شدید ذہنی دباہ کا شکار رہا مگر حوصلہ نہیں ہارا۔

پاکستان واپس آنے کے بعد جب میں نے ایبٹ آباد میں ایوب میڈیکل کالج جوائن کیا تو کئی بار محسوس کیا کہ میرا پیٹ مسلسل خراب رہتا ہے اور اکثر اس کی کوئی خاص وجہ بھی نہ ہوتی۔دہی اور لسی کھانے کا شوقین تھا اور اس بات پر کئی بار اہلیہ سے تلخی بھی ہوجاتی۔ایران کے ایک دورے کے دوران یہ احساس ہوا کہ غالباً میرے پیٹ کی خرابی کی وجہ گندم سے بنی ہوئی روٹی ہو۔بعد میں جب اس مسئلے کو مزید جانچا گیا۔تو یہ بات بے نقاب ہوگئی کہ میں گلوٹن (جو کہ گندم میں پائی جانی والی ایک پروٹین ہے) کی الرجی کا مریض ہوں۔تب سے لے کر آج تک گلوٹن فری کھانے کھا رہا ہوں۔شروع میں متعدد بار شاید میں نے خوراک کی کمی محسوس کی کیونکہ دودھ دہی اور لسی بھی اس بیماری میں تکلیف دیتے ہیں۔

1988ء میں اہلیہ کے ہمراہ حج بیت اللہ کی سعادت دوسری بار حاصل ہوئی۔منیٰ میں قیام کے دوران شیاطین کو کنکریاں مارنے روانہ ہوئے۔شدید رش اور بدنظمی تھی۔شیطانوں کے ستون زمین کی سطح کے

علاوہ پل پر چڑھنے کے بعد اوپر کی سطح پر بھی تھے ہم نے سوچا کہ شاید اُوپر والے پُل کے شیطانوں تک رسائی آسان ہو اور پُل کے اُوپر روانہ ہوگئے۔ذرا نزدیک ہوئے تو رش ناقابل برداشت ہوگیا۔ میرا خیال تھا کہ میری نازک اندام بیگم ان دھکوں اور دباؤ کو برداشت نہ کر سکے گی۔لہٰذا میں نے رخصت کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے اُس کی کنکریاں خود مارنے کا فیصلہ کیا۔اسے کہا کہ یہ سامنے ائرلائن کا بورڈ ہے تم اس کے پاس میرا انتظار کرو۔میں کنکریاں مار کر تمہارے پاس پہنچتا ہوں۔اس دوران مجھے محسوس ہوا کہ میں اپنی مرضی سے نہیں چل رہا۔مجھے آس پاس اور آگے پیچھے والے زبردستی چلا رہے ہیں۔مجھے اپنی سمت متعین کرنے کا بھی کوئی اختیار نہیں تھا۔میں نے اپنے دائیں کندھے کے اوپر دیکھا تو دہشت کے مارے چیخ نکل گئی میرے ساتھ ایک مردہ تھا جو اس ہجوم جم غفیر میں پیدل چل رہا تھا۔اس سے خوفناک بات یہ تھی کہ ہم سے کچھ آگے لوگ گر پڑ رہے تھے اور باقی لوگ انہیں پاؤں کے نیچے کچل کر آگے بڑھ رہے تھے یا پھر گرتے چلے جا رہے تھے۔بہت سے لوگوں کے پیٹ پھٹ چکے تھے اور خون بہہ رہا تھا۔ میں نے اس گھمبیر صورتحال کا فوراً جائزہ لیا اور فیصلہ کیا کہا کہ اگر گرنا ہو تو میں کمر کے بل گرنے کے بجائے پیٹ کے بل گروں تا کہ تیزی سے اُٹھ سکوں اور اس طرح اپنا پیٹ پھٹنے سے بھی بچا سکوں۔پھر میں بے اختیار گر گیا اور میرے اوپر اور لوگ۔اندھیرا چھا گیا۔کلمہ میری زبان پر تھا اور یقین تھا کہ میرا حشر بھی مجھ سے نیچے والوں کی طرح کا ہونے والا ہے۔ایسے میں ایک ہیلی کاپٹر کی آواز سنائی دی۔۔اُمید کی کرن جاگی اور پھر بجھ گئی کیونکہ ہیلی کوپٹر کی آواز دور چلی گئی ساتھ میں میرے ہوش بھی اڑ گئے۔آخری لمحے میں ہوش نہ رہا۔جب ہوش آیا تو میں ایک کپڑوں کی چادروں سے بنی چھولداری میں تھا۔پانی کی چھینٹے میرے چہرے پر پڑ رہے تھے۔تھوڑا اُوپر ایک چھوٹی داڑھی والے بابا جی مجھے دیکھ رہے تھے ایک نوجوان بھی مجھ پر جھکا ہوا تھا۔میری ہل جل سے لڑکا اور بابا دونوں باہر دوڑے اور شور مچانا شروع کیا اصعاف اصعاف۔۔۔۔۔۔۔۔میں سمجھ گیا کہ ایمبولینس منگوا رہے ہیں۔مجھے اللہ نے شعور دیا

کہ اگر ایمبولینس مجھے لے جائے تو خدا جانے میری بیگم جو ایئر پورٹ کے سائن بورڈ کے پاس کھڑی ہے اس کا کیا بنے گا؟ آیا پھر ہم مل سکیں گے یا نہیں۔ میں نے ہمت کی، زور لگایا، اُٹھا، چند قدم لئے اور پھر گر گیا۔ اب مجھے محسوس ہوا کہ میری چھاتی اور چہرے کے نیچے نسوانی بازو ہیں جنہوں نے مجھے تھام لیا ہے اور اس کے بعد دوبارہ میری آنکھیں کھلیں تو پانی مجھ پر چھڑکا جا رہا تھا۔ میری سانس پھولی ہوئی تھی۔ معلوم ہوا کہ مجھے تھامنے والی کوئی اور نہیں بلکہ میری اپنی بیگم تھی جو بہت مشکلات میں سے گزر کر حیران پریشان اس ہی چھولداری کے باہر انتظار میں کھڑی تھی۔ پنجاب کے چند جوان ایک گاڑی لے کر آ گئے تھے۔ یہ لوگ مجھے گاڑی میں ڈال کر روانہ ہو گئے اور منیٰ میں ہماری رہائش کے باہر چھوڑ گئے۔

چھولداری والے لوگ وہاں کیا کر رہے تھے؟ واقعہ یہ ہے کہ شیطان کو کنکر مارنے والے ہجوم میں جلد بازی اور بدنظمی کی وجہ سے لوگ ایک دوسرے کے اوپر گر کر کچلے جا رہے تھے۔ حج گارڈ لاشوں کو اُوپر والے پُل سے نیچے کھلی سڑک پر پھینکتے جاتے اور اس طرح راستہ صاف کرتے۔ نیچے گری ہوئی لاشوں کے انبار کو اللہ جانے کس طریقے سے ہٹایا جاتا۔ لاشوں کے اسی انبار میں مجھے بھی مردہ سمجھ کر پھینک دیا گیا۔ چھولداری والوں کی جوان بیٹی جو کچھ وقت پہلے اُوپر کے جم غفیر میں گم ہو گئی تھ اور وہ اس کی تلاش میں وقفے وقفے سے لاشوں کو اُلٹ پلٹ کر دیکھتے۔ غالباً جب مجھے اُلٹ پلٹ رہے تھے تو میں سانس لے رہا تھا۔ تو انسانی ہمدردی اور صلہ رحمی نبھاتے ہوئے چھولداری میں لا کر انہوں نے میری نگہداشت شروع کر دی۔ اگرچہ یہ واقعہ بہت شدید تھا مگر بعد میں میرے ذہن نے اس واقعے کا کوئی زیادہ نوٹس نہیں لیا۔ البتہ میری بیگم نے اس کا خوب پرچار کیا اور یہ میرے خاندان وقریبی دوستوں میں آج بھی دہرایا جاتا ہے۔

اگر مزید بیماریوں کا ذکر کیا جائے تو معدے میں گرمی اور سوجن کی تکلیف میری والدہ اور والد دونوں کے خاندانوں میں عام تھی لہٰذا جب مجھے جوانی سے یہ ہونا شروع ہوا تو میں نے اسے غلط العام سمجھتے ہوئے خاندانی تحفہ کے طور پر قبول کر لیا اور اس کی وجہ سے وقتی تکلیف کے علاوہ کوئی تشویش بھی نہ

ہوتی تھی۔1988ء کا ایک سال کافی مشکل اور دباؤ کا گزرا۔اسی اثناء مجھے شدید معدے کی تکلیف ہوئی اور مجبوراً اپنے عزیز دوست ڈاکٹر میجر (ریٹائرڈ) سلیم اختر کے ہمراہ راولپنڈی ملٹری ہسپتال کے بریگیڈیئر ارشد جو بعد میں جنرل کے عہدے سے ریٹائر ہوئے سے انڈوسکوپی کروائی۔اُنہوں نے فوٹو کھینچ کر ثبوت کے ساتھ مجھے بتایا کہ میرے فمِ معدہ (خوراک کی نالی اور معدے کا جنکشن) میں واقع گوشت کا گولہ ہے جس کی بائیوپسی لے لی گئی ہے۔ایک نیا مسئلہ اور ذہنی پریشانی شروع ہوگئی۔بائیوپسی کا نتیجہ غیر یقینی تھا۔مزید مشورے کیلئے مجھے جنرل رفیع (جو میرے جاننے والے تھے اور آرمی میڈیکل کالج میں میرے ساتھ ممتحن بھی رہے تھے) نے مجھے (Rigid Esophagoscopy) کا مشورہ دیا تاکہ اچھی طرح سے اس گلٹی کو جانچا جا سکے۔

مقررہ وقت پر میں ایک بار پھر ڈاکٹر سلیم کے ہمراہ سی ایم ایچ پنڈی کے آپریشن تھیٹر پہنچ گیا جہاں میری ملاقات نشہ یا بے ہوشی کی دوا دینے والے مشہور و معروف ڈاکٹر بریگیڈیئر سلیم (جو بعد میں جنرل کے عہدے پر ریٹائرڈ ہوئے)۔اُنہوں نے مجھے بے ہوشی کی دوا دینا تھی ایسا میں خود بھی بحیثیت سرجن کئی بار مریضوں کے ساتھ کر چکا تھا۔مجھے اندازہ تھا کہ ایک انچ گولائی سے کچھ موٹی اور لمبی لوہے کی نلکی میرے منہ کے راستے معدے تک جائے گی۔مجھے تو پتہ نہیں چلے گا کیونکہ میں نشے میں ہونگا۔ہلکی سی تشویش ہوئی اور میں نے اپنے آپ کو بے ہوشی کے سپرد کر دیا۔واپس ہوش آنے پر مجھے بتایا گیا کہ حالات کچھ زیادہ میرے حق میں نہیں ہیں ۔ یہ گلٹی سرطان کی نظر آتی ہے۔شدید گھبرا گیا۔دنیا تاریک نظر آنے لگی۔لمبا سانس لیا ہی تھا کہ چھاتی میں شدید درد نکلا جو مسلسل کئی دن تک رہا۔یہ درد اُس سنگین آلے کی وجہ سے تھا جو میرے اندر داخل کیا گیا اور معمول کے خلاف بھی نہیں تھا۔اب پتہ چلا کہ میں لوگوں کو جو بڑی آسانی سے یہ عمل کر کے گھر بھجوا دیتا تھا۔اُن پر کیا گزرتی ہوگی۔

میرے گھر والوں کو معلوم ہوا تو کہرام مچ گیا۔میں نے بتایا کہ آنے والے منگل کے دن جنرل

رفیع کے ساتھ بڑے آپریشن (جس میں معدہ اورخوراک کی نالی کاٹ دی جائے گی) کے لئے وقت طے ہو گیا ہے۔کوئی اور راستہ نہیں۔سوموار کی رات راولپنڈی کے سی ایم ایچ میں داخلہ ہوگا۔سارا خاندان اور دوست میرے گھر اُمڈ آئے۔آپس میں بحث مباحثہ کرتے رہے۔اتنے میں"مرحوم مولا بخش قریشی جو ایک انتہائی پرہیز گارو دین دار صاحب کشف عالم سمجھے جاتے تھے اور میرے پچیس سال سے زیادہ کے شناسا تھے ہمارے گھر تشریف لے آئے۔رات گئے اُنہوں نے مجھے اور میرے بھائی ڈاکٹر خالد کوعلیحدگی میں بلوایا اور کہنے لگے کہ میرے حساب کے مطابق ڈاکٹر طارق کو آپریشن کا چیرہ نہیں لگنا۔آپ کسی طور کل آپریشن کیلئے اسلام آباد نہ جائیں۔"جلد ہی یہ بات موجود سب عزیزوں میں پھیل گئی۔تقریباً سب لوگوں نے قریشی صاحب سے اتفاق کیا اور مجھے مشورہ دیا کہ موجودہ صورت حال میں بہتر ہے کہ آپ انگلینڈ اور امریکہ جا کر مشورہ کریں۔آپریشن بھی کرانا ہوتو وہیں کروائیں۔لہٰذا میں اور میری بیگم انگلینڈ روانہ ہو گئے۔

گلاسگو میں ڈاکٹر وقار مفتی ٹریننگ کے سلسلے میں مقیم تھے۔اُنہوں نے پہلے سے ایک متعلقہ سرجن سے وقت لیا ہوا تھا۔اگلے دن بہت سارے رٹسٹ ہوئے۔اُن سرجن صاحبان کا خیال تھا کہ آپریشن کر لینا چاہئے لیکن چونکہ میں امریکہ کا ٹکٹ اور ڈاکٹر کی ملاقات کا ٹائم بھی لے چکا تھا۔لہٰذا ہم نے سوچا کہ بہتر ہے کہ وہاں سے واپس آکر انگلینڈ میں گلاسگو میں آپریشن کروالوں گا۔یہ طے کر کے ہم امریکہ چلے گئے۔امریکہ کا تفصیلی واقعہ کسی دوسری جگہ درج ہے۔میرے دوست اور کلاس فیلو ڈاکٹر اشفاق احمد کی وساطت سے ایک انڈوسکوپک کنسلٹنٹ سرجن (جو اُس زمانے میں جانوروں پر تجرباتی بنیادوں پر لیزر کے ذریعے ٹیومر تحلیل کر رہے تھے) مشورہ کیا گیا اُنہوں نے کہا کہ وہ جانوروں میں تو لیزر کا تجربہ کر سکتے ہیں لیکن کسی انسان پر نہیں۔میں نے اسرار کیا کہ میں خود سرجن ہوں زیادہ سے زیادہ فمِ معدہ میں سوراخ ہو جائیگا۔اگر سرجری کی ٹیم موجود ہو تو میں اور میری بیوی لکھ کر ذمہ داری لینے کو تیار ہیں۔ امریکہ عجیب ملک ہے جہاں ذاتی خواہش پر نشے کی دوا کو بھی غیر قانونی ہونے کے باوجود برداشت کر لیا

جاتا ہے۔ بہرحال مجھے ایک خاموش معاہدے کے تحت انڈوسکوپی کیلئے لٹا دیا گیا۔ میرے ہاتھ میں پنسل اور کاغذ دے دیا گیا۔ سکرین پر میں دیکھتا رہا اور انہوں نے مجھے کہا کہ اگر شدید درد محسوس ہو تو فوراً کچھ لکھ دوں۔ لیزر آپریشن شروع ہوا مجھے لگا کہ تھوڑا سا دھواں اٹھا ہے جو ختم ہو گیا مجھے قطعی اندازہ نہیں ہوا کہ لیزر کے ذریعے کچھ کر لیا گیا تھا یا نہیں۔ معاہدہ کے مطابق مجھے پوچھنے پر بھی کچھ نہیں بتایا گیا۔ معمولی سی جلن کے علاوہ زیادہ تکلیف نہیں ہوئی اور چند گھنٹوں بعد میں ڈاکٹر اشفاق کے گھر منتقل ہو گیا۔ دو تین دن آرام کرنے کے بعد معمول کا کام شروع کر دیا پھر کئی ہفتے امریکہ اور کینیڈا گھومنے پھرنے کے بعد اللہ پر توکل کرتے ہوئے میں گلاسگو واپس جانے کی بجائے پاکستان لوٹ آیا۔ وہ دن اور آج کا دن سب خیریت ہے وقتاً فوقتاً ٹیسٹوں کے بعد اب میں اس طبی مسئلے کو بھول ہی گیا ہوں۔

بیماریوں کا باب ہے تو 2000ء میں میرے داہنے پاؤں کے بڑے انگوٹھے کے ناخن کے نیچے ایک کالا نشان پیدا ہو گیا۔ بطور سرجن مجھے معلوم تھا کہ کوئی بھی بڑھتا ہوا کالا تل یا ناخن کے نیچے کالا یا سفید نشان کا اُبھرنا خطرے کی گھنٹی ہے۔ میلانوما سرطان بھی ہو سکتا ہے۔ تشویش تو ہونا ہی تھی۔ تین چار دن اس کا مشاہدہ کیا اور آرتھوپیڈک سرجن پروفیسر ڈاکٹر علی اصغر شاہ کے مشورے پر اُنہوں نے میرے ناخن اور اس کے نیچے ٹشو کو ہٹا کر بائیوآپسی کے لئے بھجوا دیا۔ میرا دل ایک بار پھر تیزی سے دھڑکنے لگا۔ آخرکار بائیوآپسی کا رزلٹ آیا جس میں لکھا تھا کہ یہ ایک لمبا داغ لکڑی کے ایک تیلے کے ناخن کے اندر جانے سے ہوا ہے۔ کینسر کا کوئی نام ونشان نہیں اور یوں غیر ضروری بڑے آپریشن کا خطرہ ٹل گیا۔ کئی مہینے انگوٹھے پر پٹی لگائے اور سینڈل پہن کر ڈیوٹی پر جاتا رہا۔

چالیس پینتالیس سال کی عمر میں سکریننگ کیلئے میں نے لپڈ پروفائیل یعنی خون میں چربی کا ٹسٹ کروایا تو نتیجہ آنے پر معلوم ہوا کہ میرا کولیسٹرول بھی کچھ زیادہ ہے لیکن ٹرائی گلسرائیڈ بہت زیادہ ہے۔ کوئی ڈھائی سو یا تین سو کے ارد گرد ہوگا۔ میں نے اس کا ذکر اپنے فزیشن ساتھیوں سے کیا۔ سب نے ایک

ہی طرز کا جواب دیا کہ خیر ہے یہ مشرقی قوموں میں نارمل ہے ۔اُس کے بعد کئی مرتبہ سکریننگ ٹسٹ پر ٹرائی گلیسرائیڈ اسی طرح زیادہ آیا۔ مجھے کئی دفعہ اچانک تناؤ محسوس ہوتا۔معلوم ہوا کہ میری نبض کا دباؤ کم ہوجاتا ہے یعنی اوپر اور نیچے والے بلڈ پریشر کے درمیان چالیس ڈگری کی بجائے بیس ڈگری یا اُس سے کم مثلاً 120/100 یا 110/90 ہوجاتا ہے۔بار بار تنگ کرنے پر میرے ایک فزیشن ساتھی نے مجھے زبان کے نیچے رکھنے والی ایک بلڈ پریشر کم کرنے کا کیپسول گھول کر پلا دیا۔میرے برادر نسبتی اور چچا زاد بھائی دونوں کارڈیالوجسٹ تھے۔ایک برطانیہ اور دوسرا امریکہ کا سند یافتہ تھا۔اُنہوں نے بھی کسی تشویش کا اظہار نہیں کیا۔میں باقاعدگی سے کھیلتا بھی رہا اور زندگی کے امور بھی نبھاتا رہا۔خوراک بھی معمول کے مطابق تھی۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ یہ آنے والے وقت میں کسی خاص بیماری کا الارم تھا جسے سب لوگ آسان لے رہے تھے۔

9 جنوری 2001ء کی ایک برفانی سرد شام میں جب کہ دو تین دن سے میرے معدے اور پیٹ میں تکلیف تھی اور معمولی پیچس کی شکایت بھی تھی۔ احد ہسپتال ایبٹ آباد میں مجھے تین آپریشن کرنا تھے ۔ پہلا آپریشن ایک امام مسجد کے ہرنیا کا تھا۔اُنہوں نے مجھ سے یہ طے کیا تھا کہ میں یہ آپریشن نشے کی دوا دیئے بغیر کروں گا اور مزید برآں فیس بھی نہیں لوں گا۔دوران آپریشن مجھے محسوس ہوا کہ قینچی کاٹ نہیں رہی اور پکڑنے والے آلے پکڑے نہیں جا رہے۔اسی دوران ڈاکٹر حفیظ جو نشہ دینے والے ڈاکٹر تھے نے مجھ سے پوچھا کہ ''سر کیا کوئی آپریشن میں کوئی مسئلہ ہے؟''میں نے کہا نہیں تو! وہ بولا ''لیکن آپ کو تو اس سخت سردی میں پسینے آ رہے ہیں۔'' مجھے محسوس ہوا کہ میری پیشانی ٹھنڈے پسینے سے تر ہوگئی ہے۔ابھی اس حیرانگی کو چند لمحے ہی گزرے تھے کہ مجھے یوں لگا کہ میری چھاتی پر ایک پہاڑ سا گر پڑا ہے اور میں اس کے نیچے دب رہا ہوں۔میں سمجھ گیا کہ مجھے ہارٹ اٹیک ہوگیا ہے۔میں نے فوراً یہ بات ڈاکٹر حفیظ کو بتائی اور ساتھ ہی کہا کہ ہسپتال کے مالک مسٹر احد کو کہو کہ وہ اپنی گاڑی سٹارٹ اور گرم

کریں تاکہ میں اُس میں ہسپتال جا سکوں میرے رجسٹرار ڈاکٹر سیمسن گریفن (موجودہ پروفیسر آف سرجری) کو بلوایا گیا تاکہ وہ مزید آپریشن سنبھال لے۔ مولوی صاحب نے یہ سارا کچھ سن کر جھٹ سے کہا ڈاکٹر میرا آپریشن چھوڑ کے تو نہیں جاؤ گے؟ میں نے کہا کہ آپ کا آپریشن تقریباً مکمل ہو چکا ہے اب صرف جلد کو بند کرنا ہے تو کہنے لگا سارے ٹانکے خود ہی لگا کے جانا۔ میں پریشانی میں تھا اور مولوی صاحب مطالبات کئے جا رہے تھے عجیب صورت حال تھی لیکن بھر طور مجھے جلد ہسپتال پہنچنا تھا۔ شدید ہارٹ اٹیک کے دوران ایوب ٹیچنگ ہسپتال، جس میں میں خود انتہائی سنیئر ڈاکٹر تھا اور ایڈمنسٹریٹر رہ چکا تھا پہنچا تو شروع کے لمحات میں جب میرا بلڈ پریشر تیزی سے گر رہا تھا۔ تمام سنیئر و جونئیر ڈاکٹر بمعہ میرے برادر نسبتی جو کہ کارڈیالوجی ڈیپارٹمنٹ کے ہیڈ بھی تھے موقع پر موجود تھے۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ مجھ پر غنودگی طاری ہو رہی ہے۔ ایک میل نرس مسلسل میرا بلڈ پریشر چیک کر رہا تھا۔ اچانک اُس نے میرے کان میں آہستہ سے کہا: "سر آپ کا بلڈ پریشر پچاس سے کم ہو گیا ہے"۔ میں نے سوچا کہ مجھے کہنے کا کیا فائدہ سامنے کھڑے ڈاکٹروں کو کہو لیکن مجھ میں تو سکت ہی نہیں تھی کہ کہتا۔ میں نے بڑی کوشش سے آنکھوں کے اشارے کئے اور پھر مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔ آج میں سوچتا ہوں کہ ایمرجنسی حالات میں چنگے بھلے لوگوں سے (نرس و ڈاکٹروں سے) کتنی فحش غلطیاں سرزد ہو جاتی ہیں اور میرے جیسے مریض بچ جانے پہ شاید ہی اُنہیں کبھی معاف کر پائیں۔ شاید میں بلڈ پریشر کا سننے کے بعد بے ہوش ہو گیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ شاید میں مر کے دوبارہ جی اُٹھا ہوں۔ اس دوران یوں لگا کہ میں جنت میں ہوں اور زی روح میرے قریب موجود ہے، سمجھا کہ شاید یہ حور ہے۔ ہائے افسوس کہ فوراً مردانہ آواز میں وہ مخاطب ہوا۔"سر آپ کیسے ہیں"۔ میرا نشہ حرام ہوا۔ میں نے اشارتاً کہا کہ ٹھیک ہوں! وہ کوئی حور نہیں بلکہ ڈاکٹر موصوف تھے اور میں ہوش میں آ چکا تھا۔

ہارٹ اٹیک کے بعد ایوب ٹیچنگ ہسپتال میں میرے قیام کے دوران بیمار پُرسی کرنے والوں

کا مسلسل تانتا بندھا رہا۔ ماسوائے چند کے تمام لوگوں کو وزیٹر رجسٹر میں اپنے جذبات لکھنے کے بعد رخصت کر دیا جاتا اُس وقت لوگوں کا میرے ساتھ ہونا کبھی تو باعث سکون تھا تو کبھی اکتاہٹ کبھی کبھار دل چاہتا کہ کوئی بھی بات نہ کرے۔ہسپتال کی چھتیں مجھے بہت نیچے معلوم ہوتی تھیں جس سے گھبراہٹ ہوتی یوں لگتا کہ سانس بند ہو جائے گا۔ پہلی بار محسوس ہوا کہ ایک چھوٹے سے کمرے میں مریض کتنی اُکتاہٹ ،گھبراہٹ اور بے چینی محسوس کرتا ہوگا۔تب سے لے کر آج تک متعدد بار میں پاکستان اور انگلینڈ وامریکہ کے ہسپتالوں میں بڑے کمروں میں گیا لیکن ہر بار ہر کمرہ مجھے تنگ ہی محسوس ہوا۔ ہارٹ اٹیک سے ریکوری کے دوران ہسپتال میں تیسرے روز وہیل چیئر پر گھومتے ہوئے میں نے اصرار کرنا شروع کر دیا کہ مجھے یہاں سے نکالو۔آخر چار و نا چار عملے کو مجھے گھر بھیجنا پڑا۔

گھر آتے ہی مجھے راحت محسوس ہوئی۔ یوں لگا کہ میں چودہ سال قید کاٹ کر جیل کی سلاخیں توڑ کر آزاد ہو گیا ہوں ۔ڈاکٹر وقار مفتی کی ہدایت پر ہلکا پھلکا چلنا شروع کیا۔ میں بظاہر بہت سنبھلا دکھائی دیتا۔سب کو حوصلہ اور تسلی بھی دیتا۔آنے والوں کے ساتھ گپ شپ بھی لگاتا لیکن درحقیقت میں وقت کو دھکا دے رہا ہوتا۔ جب بھی اکیلا ہوتا تو ایک انجانا خوف مجھ پر چھا جاتا۔انٹرنیٹ استعمال کرنا میرا شغل رہا ہے لہٰذا میں اپنی بیماری کے متعلق نت نئی معلومات کرتا رہتا۔ ایسا مریضوں کے ساتھ عام طور پر ہوتا ہے وہ علاج بھی کرواتے ہیں اور گوگل پر جا کر اپنی تشخیص کردہ بیماری سے متعلق بہت کچھ جاننا بھی چاہتے ہیں۔ گوگل سرچ کے علاوہ اس مشکل وقت میں اوروں کی طرح مجھے بھی اللہ کی یاد ستاتی اور ذکر و فکر کرتا۔ جلد ہی میں حالات کا عادی ہو گیا اور گھر کے اندر بہتر واک کرنے لگا۔ میری بہو ڈاکٹر سبین میرے ساتھ اکثر کمروں اور لاؤنج کے اندر واک کرتی اور اپنی خوشگوار باتوں سے مجھے مصروف رکھتی۔ میں ہمیشہ ان لمحات کو اور اس کی خصوصی توجہ اور محنت کو اپنے دل میں یاد رکھے ہوئے ہوں یہی یادیں آپ کی زندگی کا حسن قرار پاتی ہیں۔

ایک دن میں کسی دوسرے کمرے میں آرام کر رہا تھا۔مرحوم ڈاکٹر رونق زمان (جن کا ذکر روحانیات کے باب میں بھی ہے) میرے مہمانوں کے ملنے والے بیڈروم میں آکر میرے سرہانے کی دیوار پر ایک قرآنی آیت کا ترجمہ لگا کر چلے گئے۔اور وہ ترجمہ یہ ہے۔

"ہر انسان پر انیس فرشتے نگہبان بنائے گئے ہیں۔اس آیت کا مجھ پر بہت اثر ہوا۔

لیڈی ریڈنگ ہسپتال پشاور میں میری انجیوگرافی کی تاریخ طے ہوئی اور میں وقت سے دن دو پہلے پشاور اپنے بھائی پروفیسر ڈاکٹر خالد مفتی کی رہائش گاہ واقع شامی روڈ چلا گیا۔اگلے دن ڈاکٹر خالد مجھے اپنے ساتھ لیڈی ریڈنگ ہسپتال شعبہ سائیکاٹری جس کے وہ انچارج تھے میں لے گئے۔وہاں ایک پر اعتماد خاتون سے ملاقات ہوئی۔ڈاکٹر خالد کسی کام کے بہانے مجھے اُس کے پاس اکیلا یہ کہہ کر کہ ''گپ شپ لگاؤ'' چھوڑ گئے۔میں سمجھ گیا کہ خاتون سائیکالوجسٹ ہے۔اور غالباً میرے ساتھ کونسلنگ سیشن کریں گی حالانکہ میں اپنے آپ کو بظاہر کسی دباؤ میں نہیں سمجھ رہا تھا اور میرے خیال میں اس سیشن کی ضرورت بھی نہ تھی۔میں نے سوچا ایک اچھی کمپنی سے لطف اندوز میں کیا حرج ہے؟

بڑی مہارت سے خاتون سائیکاٹرسٹ نے مجھ پر واضع کر دیا کہ " آپ کو تو کسی کونسلنگ کی ضرورت نہیں بلکہ آپ میری کونسلنگ کریں۔آدھ گھنٹہ یا کچھ زیادہ کے بعد ڈاکٹر خالد مفتی واپس آگئے اور میں ان کے ساتھ چل پڑا۔ہنستے ہوئے شرارت کی کہ آپ مجھے کن حالات میں چھوڑ گئے۔میں نے واضح کیا کہ میں کونسلنگ کی ضرورت محسوس نہیں کر رہا تھا۔انہوں نے مجھ سے اتفاق کیا۔بات آئی گئی ہوگئی۔وقت گزرنے کے بعد میں آج محسوس کرتا ہوں کہ اس کونسلنگ سیشن نے مجھ پر اچھا اثر ڈالا تھا۔ آج میں بہت سے لوگوں کیلئے سائیکالوجسٹ کے سیشن کی حمایت کرتا ہوں بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ آج کے پریشان کن دور میں ہر آدمی کو کونسلنگ کی ضرورت ہے۔اگلے دن لیڈی ریڈنگ ہسپتال پشاور، شعبہ کارڈیالوجی میں پروفیسر ڈاکٹر صاحبزادہ وحید اور عزیز گل مفتی نے میری انجیوگرافی کی۔معلوم ہوا کہ میری

دل کی داہنی شریان مکمل طور پہ بند ہے۔ لمبا سٹنٹ پڑنے کی ضرورت تھی جو اس بڑی بندش میں پورا آتا۔ مگر یہ موجود نہ تھا۔ سٹنٹ لگانے کا رواج ان دنوں پاکستان میں شروع ہوا تھا جب اکثر و بیشتر مغربی ممالک کے ماہر کارڈیالوجسٹ ہمارے ملک کے مختلف یونٹوں میں آیا کرتے تھے۔ اتفاق سے ایک ٹیم اس وقت بھی وہاں موجود تھی جن سے لمبے سائز کا سٹنٹ نکل آیا۔ (یہ بات مجھے ہسپتال کے عملے نے بتائی۔ واللہ علم بالصواب)۔ دوران انجیوگرافی و پلاسٹی میں نے انجیوگرافی کی مشین کو زندگی میں پہلی بار دیکھا۔ انتہائی متاثر کن تھی۔ کافی چیزیں اس میں میری تحقیق کے شوق کیلئے دلچسپی کا باعث تھیں۔ جلدی مانیٹر سکرین پر میری ای سی جی چل پڑی۔ میں آخری وقت تک پرسکون رہا۔ شاید مارفین کا اچھا اثر تھا۔

Inguinal region میں سے داخل کی گئیں انجیوگرافی کی ٹیوبس (sheath) نکالنے کے بعد وہاں ایک سخت قسم کی پٹی (Pressure bandage) باندھ دی گئی۔ اگلے چھ گھنٹے تک ٹانگ کو بالکل سیدھا رکھنا تھا۔ چند ہی منٹوں میں ساکن ٹانگ کی بے چینی سے دماغ ہلنے لگا اور میں نے اسے ہلانا شروع کر دیا۔ مزید چھ گھنٹے ٹانگ کو ساکن رکھنا ناممکن لگ رہا تھا۔ اس دوران میرے برادر نسبتی اشفاق مفتی اور میرے قریبی دوست حاجی مختیار نے زبردست تیمارداری کی جس میں ٹانگیں دبانا، انگلیوں کو ہلانا اور خوش گپیاں شامل تھیں) اُن کی مہربانی نے اس تکلیف دہ مرحلے کو آسان کر دیا۔ چھ گھنٹے بعد انجیوگرافی کی نلکی نکلنے کے بعد ٹانگیں ہلانے کی راحت مجھے آج بھی یاد ہے۔ انجیوگرافی کے بعد واپس ایبٹ آباد آ گیا اور ہسپتال میں اپنے فرائض کی انجام دہی میں مصروف ہو گیا۔

شروع کے دنوں میں کئی بار محسوس ہوا کہ شاید مجھے دوبارہ انجائنا ہو گیا ہے اور میں سی سی یو میں جا کر داخل ہو جاتا تاہم ڈاکٹرز مجھے گھر بھیج دیتے۔ ایک بار اسی قسم کے ایڈمشن کے دوران سی سی یو کی ایک تجربہ کار نرس رخسانہ نے مجھے کہا کہ ''سر کیا اچھا نہیں ہو گا کہ ہم آپ کا بلڈ شوگر ٹسٹ کر لیں''، میں نے کہا'' یہ سب تو میں بار بار کر چکا ہوں۔ میرا شوگر لیول صحیح رہتا ہے''۔ بہر حال اُس کی تکرار کے بعد میں نے بلڈ

شوگر ٹسٹ کروایا۔تو مجھے حیرت ہوئی کہ بلڈ شوگر 60 کے قریب تھی۔اب رخسانہ نے مجھے گلوکوز پلایا اور میں فوراً ہی ٹھیک ہوگیا۔آج اتنے سال گزرنے کے بعد بھی مجھے کئی بار جب اس قسم کی بے چینی محسوس ہوتی ہے تو میں تھوڑا سا میٹھا کھالیتا ہوں اور اکثر و بیشتر یہ اپنا اثر کر دیتا ہے۔یہ بات کتابوں میں مضموم نہیں ہے لیکن ہمیں ضرور اپنا بلڈ شوگر ٹسٹ گاہے بگاہے کرواتے رہنا چاہیئے۔

سال ڈیڑھ بخوبی گزرنے کے بعد 2002ء کے موسم بہار میں اپنے یونٹ سرجیکل اے وارڈ کے دفتر میں بیٹھا تھا کہ مجھے اپنی چھاتی میں دباؤ محسوس ہوا، مجھے فوراً انجائنا ہونے کا احساس ہوا۔وقتی علاج کیا پھر پشاور روانہ ہوا اب کی بار ڈاکٹر صاحبزادہ وحید و عزیز گل رحمان میڈیکل انسٹی ٹیوٹ میں پریکٹس کر رہے تھے۔مجھے دوبارہ انجیوگرافی کی ٹیبل پر لٹا دیا گیا۔اس بار سب کچھ جانا پہچانا تھا۔ٹیبل پر ہی پتہ چل گیا کہ اس بار دل کی باہنی شریان میں رکاوٹ ہے۔جس میں سٹنٹ ڈال دیا گیا۔داہنی شیریان جس میں پہلے سے ہی سٹنٹ پڑا تھا وہ بھی کچھ بلاک ہوگیا تھا جسے صاف کر دیا گیا۔مجھے تمام تفصیلات سے باخبر رکھا گیا۔یوں میں ایک بار پھر صحت مند ہوگیا البتہ دل کی دھڑکن کبھی کبھار بے ترتیب ہوجاتی جو بہت تشویش کا باعث بنتی۔

سعودی عرب میں ایک سال کی کنسلٹنسی کے دوران بہترین سہولیات کی موجودگی بہت کام آئی اور ایک بار ہلکا پھلکا سا دل کا مسئلہ ہوگیا۔تب میں بالکل اکیلا گھر میں رہتا تھا۔میرے پاکستانی نژاد امریکن ڈاکٹر نوید اور ان کی بیگم سنبل جو میرے گھر سے بہت قریب غرناطہ میں ہی رہتے تھے نے کمال ہوشیاری سے مجھے چند دیگر غیر ملکی ڈاکٹروں کے تعاون اور ہسپتال کی مینیجمنٹ سے بچا کر علاج کیا۔کسی کو کان و کان خبر نہ ہوئی۔میرا حوصلہ ان کی وجہ سے بلند رہا میں نے اپنے بیوی بچوں کو بھی خبر ہونے نہ دی۔وزن خاصا کم ہوگیا تھا۔حرکت قلب کی بے ترتیبی کئی دفعہ ذہنی مشکل میں ڈال دیا کرتی تھی۔جب چھٹی پر پاکستان آیا تو (Holter) بھی لگائے گئے۔

2004ء میں وطن واپس لوٹا۔ صحت کے حالات بہتر ہوتے گئے اور سال 2012ء تک اچھے رہے۔ اب جب کہ میں خاصا پر اعتماد ہو گیا تھا کہ شاید تادم حیات دل والا معاملہ صحیح رہے ایک سہ پہر بیسمنٹ کی سیڑھی پر قدم رکھا ہی تھا تو محسوس ہوا کہ میرے قدموں اور جسم میں جان نہیں ہے۔ سخت کھٹکا ہوا۔ غور کیا۔ سینے کا درد، بازوؤں میں درد یا سانس پھولنے کی شکایت نہیں تھی دماغ بھی کلیئر تھا پھر بھی میں نے کہا کہ اپنے آپ کو کلیئر کرانا ضروری ہے۔ قریبی لفٹ کے ذریعے اُوپر گیا۔ ڈاکٹر مومن صلاح الدین ماہر دل کو معاملہ بتایا۔ اُنہوں نے فوراً ای ٹی ٹی مشین پہ کھڑا کر دیا اور چند سیکنڈ بعد ہی بڑی تیزی سے ای سی جی میں شدید تبدیلی واقع ہونے کی وجہ سے اُتار لیا۔ ڈاکٹر مقداد علی خان کے پاس لے گئے اور اُنہوں نے بتایا کہ مجھے دل کی شیریان میں رکاوٹ کی شکایت ہے۔ کچھ دواؤں سے فوراً علاج کیا اور میرے کہنے پہ طے پایا کہ رسک کے باوجود میں رات کو اپنی بھتیجی ڈاکٹر سحر کی رسم نکاح میں پدر وکیل کے فرائض انجام دینے چلا جاؤں اور اگلی صبح انجیو گرافی کیلئے آ جاؤں۔ ڈاکٹر مقداد کی طبی صلاحیت کی داد دینا پڑی کہ اُنہوں نے اگلے دن بہت تیزی سے میری تقریباً بند خون کی نالی میں سٹنٹ ڈال دیا۔ رپورٹ میں (Excellent) رزلٹ لکھ دیا اور مجھے آئندہ کیلئے خاصی تسلی دی۔

رات حسب سابق بہت مشکل سے گزاری۔ ران پر لگی پٹی شدید تنگ کر رہی تھی۔ سی سی یو کے ایک مہربان ٹیکنیشن کے ساتھ مشاورت کر کے آدھی رات گزرنے پر پٹی کو وقت سے پہلے اُدھیڑا تو نیچے پریشر کیوجہ سے جلد پر چھالے پڑ چکے تھے۔ اندازہ ہوا کہ کئی بار مریض بھی ٹھیک ہو سکتا ہے کیونکہ کئی گھنٹے سے میں پٹی کی سوزش اور سختی کا تمام عملے کو بتا رہا تھا۔ جن کا کہنا تھا کہ ''سر ایسا ہوتا ہے''۔ بحرحال حسب معمول بہت بے چین تھا۔ صبح اتوار تھی میں نے نرس سے معمولات کی تفصیل پوچھی ویسے بھی مجھے معلوم تھا کہ کوئی سنئیر ڈاکٹر دیر سے ہی آئے گا۔ نرس نے مجھے معمول کی دوائی بتا دی۔ میں نے اپنے بیٹے سعد کو کہا کہ ذرا گاڑی میں چکر لگاتے ہیں۔ سامان بھی ساتھ رکھ لو بعد میں بھی تو رکھنا ہو گا۔ وہ میرے جھانسے میں

آ گیا۔ میں گاڑی میں بیٹھا اور صبح سات بجے گھر پہنچ گیا۔ اتنے مرحلوں کے بعد میرے اندر Confidence پیدا ہونا کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ گھر والے حیران و پریشان ۔میری بیوی اور میری بیٹی عائشہ صبح صبح میرے لئے ناشتہ تیار کرنے والے تھے۔ مجھ پر خوب برس پڑیں۔ میں نے آئیں بائیں شائیں کر دیا اور یوں خیریت ہوگئی۔

میں نے کچھ عرصے سے Epidimal Cyst پال رکھا تھا۔ یہ وقت کے ساتھ بڑھ رہا تھا۔ پروفیسر جمیل احمد نے آپریشن کر دیا۔ آپریشن کے بعد کئی دن تک شدید درد کی کیفیت رہی۔ میں نے بھی بہت سے مریضوں کے یہ آپریشن کئے تھے۔ مجھے احساس نہیں تھا کہ ان کو بھی آپریشن کے بعد کس قدر کربناک درد رہتا ہوگا۔ اب جب اپنے پر بنی تو سمجھ آئی کہ سیر کی کتنی پکتی ہیں۔ ڈاکٹر سرجن زبیر احمد خان نے میرے گھر آ کر میری دیکھ بھال کی۔ جن کا میں تہہ دل سے مشکور ہوں۔

ستمبر 2022ء میں مجھے محسوس ہوا کہ میں دن میں کئی بار تھک جاتا ہوں ، بدن کے اندر جھرجریوں محسوس ہوتی ہیں اور سردی لگتی ہے۔ کئی دفعہ تمام جسم میں درد محسوس ہوتا۔ چونکہ میں ہر روز گالف کھیلتا اسکا ذکر میں نے اپنی کیڈی راج کو کیا۔ تو اس نے ہی مجھے اپنی اسی قسم کی صورتحال بیان کی۔ ہم دونوں نے اسے موسمی تبدیلی کی بناء قرار دیتے ہوئے آئی گئی کر دیا۔ 25 ستمبر بروز اتوار میں ایبٹ آباد میں اپنے عزیز دوستوں ڈاکٹر میجر سلیم اور حبیب کو گھر میں اٹینڈ کر کے رخصت کر رہا تھا کہ اچانک میری آنکھ میں ایک عمودی لکیر ابھری اور اس سے ایک پردہ کھچ کر تمام آنکھ پر چھا گیا جس پر مجھے محسوس ہوا کہ میں اپنی دا ہنی آنکھ سے اندھا ہو گیا ہوں۔ میری عمر میں اکثر اس کی وجہ آنکھ کا پردہ (Retina) کے پھٹنے کی وجہ سے ہوتا ہے۔ پروفیسر ڈاکٹر افتخار ماہر چشم جو میرے برخورداری میں بھی آتے ہیں کو فون کی۔ وہ اپنے گاؤں اوگی میں تھے انہوں نے تشویش کا اظہار کر کے دو گھنٹوں میں ایبٹ آباد پہنچ کر ڈاکٹر عبدالسلام کے کلینک میں ہی آنکھ کا معائنہ کیا اور کہا کہ آنکھ کے پچھلے حصے میں کسی رگ کے پھٹ جانے سے خون پھیل گیا جس کی وجہ ظاہر نہیں تھی

چند لیبارٹری ٹسٹ کرنے سے معلوم ہوا کہ پچھلے چند دنوں میں جو مجھے ڈینگی ہوا اور میرے سفید خون کے سیل (Platletts) بہت کم ہو گئے تھے اس پر مزید یہ کہ میں اپنے دل کی بیماری کی وجہ سے اینٹی پلیٹلیٹس یعنی خون پتلا کرنے کی دوا کھا رہا تھا۔ فوراً پنڈی جانے کا فیصلہ ہوا اور میجر جنرل کے کلینک صبح سویرے میں ڈاکٹر افتخار کی وساطت سے پنڈی پہنچ گیا۔

انہوں نے دیکھا اور دو ہفتے انتظار کا مشورہ دیا اس دوران ہم B - Scan کرتے رہے اور اچانک پتہ چلا کہ میرے آنکھ کا پردہ پھٹ گیا میں فوراً ڈاکٹر مظہر اسحاق سے رابطہ کیا اور اگلے دن بروز جمعہ 4 - 3 گھنٹے کی سرجری ہو گئی۔ انہوں نے کوئی حتمی رائے میری آنکھ کی روشنی کے متعلق نہ دی اللہ کی مہربانی اگلے دو ہفتے میں مجھے خاطر خوا نظر آنے لگا۔ ڈاکٹر مظہر خوش ہوئے اور چند ماہ کی مزید علاج کا پلان دے دیا۔ ساتھ ماہ بعد اب میری نظر بخوبی بحال ہو گئی ہے۔

اسی اثناء میرے منہ کے اندر اور باہر دانے نکل آئے شدید درد اور کرب میں مبتلا ہوا چونکہ اس قسم کے درجنوں کیس میں نے اپنی زندگی میں دیکھے ہوئے تھے لہذا یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ یہ Trigeminal Herpes Zoster (Shingles) اور اردو میں المبا کہتے ہیں۔ اگلے دو ماہ شدید کرب میں گزرے۔

کہتے ہیں بڑھاپا بذات خود ایک بیماری ہے۔ اس بیماری کا ایک خصوصی حصہ جوانی کی خواہشات کا انبار بھی ہوتا ہے۔ جو حاصل کرنا ممکن نہیں ہوتا اس لیئے جو صحت ہاتھ آئی اُسی کو مقدر سمجھ کے گزر رہو رہا ہے۔

والے بخیر گزشت۔

باب نمبر 14

میرا فلسفۂ حیات و کائنات

میں فلسفے کا ماہر نہیں ہوں اور نہ ہی میری معلومات عام سطح سے بالا ہے۔اردو میں فلسفہ دانشمندی کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔سوچنا انسان کی بنیادی فطرت ہے۔فلسفہ کائنات اور مخلوقات کے حقائق جاننے کی علم کو کہتے ہیں۔طریقہ کار جو ماہر فلسفیوں نے لکھے وہ تو میں نہیں جانتا لیکن ایک طریقہ کار جسے منطق کہتے ہیں سے خاصا مانوس ہوں یعنی مسئلہ کا وہ حل جو عام فہم طور پر مختلف دلیلوں کے ساتھ قابل قبول ہو۔اس کا مطلب یہ ہوا کہ فلسفی حضرات مختلف حقائق کو دلیلوں اور مثالوں کے ذریعے لوگوں کی سوچ کا حصہ بنا دیتے ہیں۔

کائنات لاتعداد سیاروں، جھرمٹوں اور گلیکسیوں پر مشتمل ہے۔لامحدود کائنات کا احاطہ کرنا ہمہ وقت ممکن نہیں جبکہ نئی دریافتوں کا سلسلہ جاری ہے۔کائنات کی وسعتوں میں اضافہ انسانی عقل کا حصہ بنتا جارہا ہے۔زمین کائنات کے مدار میں ایک چھوٹے سے نقطہ کے برابر ہے۔زمین ہی وہ سیارہ ہے جس میں زندگی نباتات، حیوانات اور انسان کی صورت میں موجود ہے۔اس سوال کا جواب دینا کہ موجودہ کائنات سے پہلے کیا تھا میرے لئے ہرگز ممکن نہیں۔موجودہ کائنات جو ہماری نظر و فکر میں ہے ایک وسیع نظام ہے۔اور جو رائج نظریئے کے مطابق ایک بڑے دھماکے (Big Bang) کے نتیجے میں ظہور پذیر ہوئی۔تاریخی اور سائنسی تناظر میں یہ انتہائی منظم اور متعین طریقے سے تبدیل ہو رہی ہے۔سوال یہ ہے کہ بڑے دھماکے (Big Bang) سے پہلے کیا تھا نیز ان تمام موجودات کا خالق کون ہے؟ چند مذاہب کے علاوہ دیگر فلسفی و سائنسدان اس کا جواب دینے سے معذور ہیں۔میرا ماننا یہ ہے کہ جس طرح ماں کے پیٹ میں بچے کو ہرگز یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اس کی ماں کون ہے اسی طرح دیگر اشیاء مثلاً کمپیوٹر وغیرہ کو بھی معلوم نہیں

ہوتا کہ ان کا خالق کون ہے۔مگر اتنا تو معلوم ہے کہ کوئی ہے۔بس یہی میری منطق ہے کہ کائنات کا بھی خالق ہونا چاہئے جس کی حیثیت بظاہر ہماری سمجھ اور نظر سے باہر ہے۔یہی بنیادی کام سورۃ یٰس میں اللہ سبحانہ وتعالٰی نے ہمارے رسول کے ذمے کیا ہے۔

اِنَّمَا تُنذِرُ مَنِ اتَّبَعَ الذِّکرَ وَ خَشِیَ الرَّحمٰنَ بِالغَیب فَبَشِّرہُ بِمَغفِرَۃٍ وَّ اَجرٍ کَرِیمٍ (36:11)

یعنی تم تو صرف اس شخص کو نصیحت کر سکتے ہو جو نصیحت کی پیروی کرے اور خدا سے غائبانہ ڈرے سو اس کو مغفرت اور بڑے ثواب کی بشارت سنا دو (۳٦:۱۱)(ترجمہ: فتح محمد جالندھری)

چیزوں کو جانچنے کے لئے ضروری ہے کہ انسان سوچے اور سوچنے کے مختلف انداز سے بھی آشنا ہو،مختلف زاویوں سے چیزوں کو سوچے اور سمجھے تاہم سوچ غیر جانبدارانہ ہونی چاہئے تا کہ انسان کے اپنے نظریات وخیالات اس پر حاوی نہ ہو جائیں یہ بات ہے تو بڑی مشکل۔انسان وقت کے دھارے میں رہ کر اپنے خیالات اور خاص کر میری عمر کے لوگ کو اتنا پکا کر کے بیٹھے ہوتے ہیں کہ جائز اور عیاں چیزوں کو بھی انصاف کے ترازو سے دیکھ نہیں پاتے۔مشہور قول ہے کہ "ہر انسان اپنے لئے بہترین وکیل ہوتا ہے۔اور دوسروں کے لئے بہترین جج"۔زندگی کا فلسفہ کیا ہے اور زندگی کا مقصد کیا ہے۔اس میں اگر تمام جاندار جن میں چرند پرند انسان اور نباتات سب کچھ شامل ہے کو لیا جائے تو گفت گو طویل میری دسترس سے باہر ہو جائے گی۔میری زندگی میں میرا برتاؤ اور رویوں میں تبدیلی بنیادی طور پر معاشرتی تقاضوں کی بنیاد پر ہیں لہذا معاشرتی تقاضوں کے موضوع پر بات کر لی جائے تو زیادہ بہتر ہوگا۔

میرا دورِ حیات چار نسلوں اور پانچ مداروں پر محیط ہے۔میرے والدین، میرا بچپن، میری جوانی، میری اولاد اور میرے پوتے پوتیوں کا زمانہ۔ان سب کی سوچ،طرز بود باش و اقدار ایک دوسرے سے مختلف و معنی خیز ہیں۔زمانہ والدین میں بیٹا سوئی ہوئی ماں کے لئے تمام رات پانی لئے کھڑا

رہتا، چھوٹے چار پائی کے پائیں بیٹھتے۔خاندانی نام لوگوں کے لئے باعث عزت و احترام ہوتا ۔ بچے والدین کے گھر سے دور نہ جاتے ۔ جوائنٹ فیملی سسٹم عام تھا۔حجرہ و بیٹھک برادری کے لئے لازمی ہوتے ۔انتقال کے بعد ثواب دارین کے لئے ختم قران ،چہلم ،سالانہ ختم قران ضروری تھا،قبرستان پر باقاعدہ حاضری دی جاتی ۔قانونی و معاشرتی اقدار کا احترام سختی سے ہوتا۔نظریاتی وابستگی انفرادی عمل میں نظر آتی ۔میرے بچپن میں ہم والدین سے حاصل کردہ تربیت و اپنے برتاؤ سے پہچانے جاتے تھے ۔روپیہ سے زیادہ رویہ کو ترجیح دی جاتی ہے ۔جوانی میں دوستی یاری عام وقابل احترام تھی ۔والدین کی بات ماننا فرض تھا۔خوب سے خوب تر کی تلاش نصب العین بن چکا تھا۔سیاسی وابستگی بشرط استواری رائج تھی ۔اساتذہ کی قدر تربیت کا حصہ تھی ۔مذہبی ہم آہنگی واحترام اور گھریلو یونٹ اکھٹے لیکن نظم وضبط سے جاری تھے ۔وقت کے ساتھ ساتھ ہونے والے سیاسی انقلابات جذبات کو ٹھیس پہنچاتے رہے ۔پھر دولت ونو دولتیے، خاندانی وقار اور گھریلو اقدار سے اونچے ہونے لگے ۔مذہبی وفرقہ واریت اجاگر ہونے لگی ۔انا اور غیرت کے بے جا استعمال نے انفرادیت کو جنم دینا شروع کر دیا۔ ہمارے بچے نسل درنسل رائج روایات سے منحرف ہوتے گئے ۔حجرہ ،بیٹھک ،پنچایت کا خاتمہ ہو گیا۔سیاسی بحران واقتصادی دوڑ نے نہ صرف معاشرتی اقدار کو متاثر کیا بلکہ سبھی اپنے خاندان سے بیگانہ ہو گئے ۔سوشل میڈیا نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی اور اخلاقی اقدار کو روند ڈالا ۔

تین تعلیمی نظاموں انگریزی بمقابل اردو میڈیم اور مذہبی مدرسوں نے تاریخی دوقومی نظریے کی بجائے تین نظریئے والی قوم کو جنم دیا۔موجودہ نوجوان تین علیحدہ طبقوں یعنی ماڈرن یورپین آزاد منش ، علاقائی یا اردو بول چال والے تحت الشعور میں کمتر ذہنیت رکھنے والے اور تیسرے قدامت پسند، دینی لیبل والی اور منفرد لباس پگڑی والے حصوں میں بٹ گئے ۔نتیجتاً اس تعصب نے ایک ملت پاکستان کے بجائے

معاشرتی، مذہبی ولسانی اختلافات کو جنم دیا۔ اگرچہ تعلیم عام ہوگئی لیکن بنیادی تعلیم کے اختلافی دھارے کے باوجود اعلیٰ تعلیم کے میدان میں تمام دھاروں کے لوگوں کے لئے ایک ہی معیار نے ایک عجیب صورت حال پیدا کردی۔ انگریزی ذریعہ تعلیم نے اشرافیہ ودولتمند خاندانوں کے بچوں کو آگے بڑھنے کے مواقع آسان کر دیئے۔ نتیجتاً ہر سہولت انہی خاص لوگوں کے بچوں کے لئے زیادہ ہوگئی۔ معاشی ومعاشرتی دھاروں کی خلیج وسیع سے وسیع تر ہوتی چلی گئی۔ میرے پوتے دھوتے اب ہم سے بہت مختلف تصور کئے جا سکتے ہیں۔ ان کی اقدار سوشل میڈیا کی نذر ہوگئی ہے اور وہ اب کمپیوٹر سے ہم آہنگ ہیں۔ آخری حدیں فیس بک پر ہونے والی شادیاں ہیں۔ شادی کے بعد فیملی کورٹ میں طلاق، علیحدگی، ازدواجی حقوق و بچوں کی سپردگی کے کیسز ہمارے گھریلو زندگی کی ناپختگی کا مظہر ہیں۔ ہر بچہ دل میں پاکستان سے باہر زندگی بسر کرنے کا عزم لئے ہوئے ہے۔ حکومتیں اپنے سیاسی دور کی مطابقت اندر ہی رہ کر کام کرنے کو ترجیح بنائے ہوئے ہیں۔ لمبے عرصے کی پلاننگ مفقود ہے۔ دینی اکابرین نفسیاتی ضرورتوں اور معاشرتی حقائق سے بیگانہ وار اپنے حصے کی شمعیں سورج کی روشنی میں جلائے جا رہے ہیں۔ نجانے آنے والے ماہ وسال کیسے ہوں گے؟

یہ ماننا میرے لئے کوئی مشکل نہیں کہ تمام آسمانی (اللہ کے طرف سے نازل کیے ہوئے) ادیان کا مرکزی نظریہ ایک ہی ہے اور وہ ہے اللہ کی وحدانیت اور مخلوق کی عبدیت حضرت محمدؐ برحق اور آخری رسول ہیں۔ قرآن کلام اللہ ہے۔ قرآن کی ترتیب جو ہمارے پیارے پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے ہاتھوں سے کی اور اُس کی ابتدائی سورۃ البقرۃ کی پہلی پانچ آیات اسلامی عقائد وعمل کی بنیادی اساس ہیں۔

الٓمّٓ ۞ ذٰلِکَ الْکِتٰبُ لَارَیْبَ فِیْہِ ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ ۞ الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ وَیُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ وَمِمَّا رَزَقْنٰھُمْ یُنْفِقُوْنَ ۞ وَالَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِکَ وَبِالْاٰخِرَۃِ ھُمْ

يُوْقِنُوْنَ o وَ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِمَآ أُنْزِلَ إِلَيْكَ وَمَآ أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَبِالآخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُونَ o أُوْلَئِكَ عَلَى هُدًى مِنْ رَبِّهِمْ وَ أُوْلَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ o

پہلے غیب پر ایمان لانا (یعنی اللہ کی ذات کو بغیر دیکھے اُس طرح ماننا جس طرح کہ ہم آج کے دور میں چیزوں کی بناوٹ میں ایٹم کو بغیر دیکھے بنیادی جز کے طور پر مانتے ہیں)۔ دوئم صلوٰۃ قائم کرنا اگر کوئی شخص غیب پر ایمان رکھے تو پھر اپنی عبدیت کا عمل صلوٰۃ کے ذریعے کر کے دکھائے میں بچوں کے سمجھانے کی غرض سے نماز کو مسلمان کا دستخط یعنی Signature کہتا رہتا ہوں۔ تیسرا یہ کہ جو انسانوں کو عطا کیا ہے اُس میں وہ دوسروں کا حصہ کریں اور نفع پہنچائیں۔ چوتھا یہ کہ ہم قرآن اور اُس سے پہلے نازل کی ہوئیں آسمانی کتابوں پر ایمان رکھیں یعنی اِن میں آئے ہوئے بیان کی سچائی پر یقین رکھیں اور پانچواں یہ کہ ہم روزِ آخرت (یعنی موت کے بعد کی زندگی) پر اعتقاد رکھیں۔ کہ انسان مرنے کے بعد دوبارہ پیدا کیا جائے گا اور ازلی زندگی گزارے گا۔

مذاہب عالم کی بنیادی اساس ایک ہی ہے۔ جو کچھ یوں ہے کہ اللہ نے کائنات میں علم پہلے پیدا کیا اور اس کے بعد انسان تخلیق کیا پھر اسے یہ علم سکھایا۔مخلوق میں سب سے اعلیٰ و افضل انسان ہی ہے۔ جسے اس نے بولنا سکھایا اور یوں اُسکی باتیں دوسروں کے لیئے بامعنی ہوگئیں ۔علم کے علاوہ اُسے حکمت بھی عطا ہوئی۔علم، تجربات، مشاہدات و تفکرات کے مجموعہ سے جو حکمت انسان میں پیدا ہوتی ہے اس کے استعمال کی مقدار انسان کی اندورنی آرائش کرتی ہے۔انسان اسے مثبت و منفی زاویوں سے استعمال کرتا رہتا ہے۔سب سے بڑی کامیابی اپنے اندر کے موسم کو خوشگوار رکھنا یعنی دل کی بہار قائم رکھنا ہے۔ یہ تب ہی ہوسکتا ہے جب انسان ہر وقت ہر چیز سے پر امید رہے۔قرآن پاک میں اللہ کے دوست ان کو قرار دیا گیا جنہیں نہ کسی چیز کے جانے کا غم ہو اور نہ آنے والے خطرے سے خوف محسوس ہوتا

ہو۔جس طرح اللہ تعالیٰ سورۃ یونس آیت نمبر 62 میں فرماتا ہے۔

"أَلَآ إِنَّ أَوۡلِيَآءَ ٱللَّهِ لَا خَوۡفٌ عَلَيۡهِمۡ وَلَا هُمۡ يَحۡزَنُونَ o"

انسان کے بس میں صرف صحیح سمت میں خلوص دل سے کوشش کرنا ہے جسے کامیاب بنانے میں بلاشبہ تقدیر کا ہاتھ ہے۔میرے خیال میں مذاہب انسانوں کو دنیا میں ایک بہترین عبد (اللہ کا غلام) کے طور پر زندگی بسر کرنے کا راستہ سکھاتے ہیں۔عبادت اللہ کے بندوں پر فرض ہے جس کی افادیت یا اہمیت کو تلاش کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ اسی طرح ہے کہ کوئی اپنے غلام یا ملازم کو کوئی کام حوالے کرے تو وہ جواباً مالک سے اُس کام کے کرنے کی وضاحت نہیں مانگتا۔ بلکہ بلا سوچے کام کر دیتا ہے۔عبادت کا دوسرا پہلو انسان کے اختیار میں دے دیا گیا ہے۔انسانوں، مخلوقات اور یہ کائنات میں پائے جانی والی چیزوں سے برتاؤ کے متعلق ہے۔دوسرے انسانوں کے ساتھ برتاؤ حقوق العباد میں آتا ہے اور اس کی حق تلفی کی صورت میں اللہ تعالیٰ نے روز آخرت میں انہی لوگوں کی وساطت سے بخشوانے کا عندیہ دیا ہے۔لہٰذا حقوق العباد میرے فلسفۂ حیات میں ایک مقدم حیثیت رکھتا ہے۔

عرصہ دراز تک میں سوچتا رہا کہ میرا مشن کیا ہے؟ مشہور سائنسدان آئن سٹائن ایک دفعہ سفر کر رہا تھا تو اس کے پاس ٹکٹ نہیں تھا۔گارڈ کے پوچھنے پر ٹکٹ ڈھونڈنے لگا۔گارڈ بولا" کوئی بات نہیں ہمیں پتہ ہے آپ بہت بڑے سائنسدان ہیں اور آپ نے ضرور ٹکٹ خریدا ہوگا۔مگر آئن سٹائن پھر بھی سیٹ کے نیچے ٹکٹ تلاش کرتا رہا۔گارڈ نے پھر کہا ہمیں پتہ ہے کہ آپ کون ہیں۔آئن سٹائن نے اسے کہا "یار بات یہ ہے مجھے بھی پتہ ہے کہ میں آئن سٹائن ہوں لیکن مجھے یہ پتہ نہیں کہ میں جا کہاں رہا ہوں۔اس لئے میں ٹکٹ ڈھونڈ رہا ہوں کیونکہ اس پر میری منزل لکھی ہے"۔ گویا مجھے یہ بھی پتہ ہے کہ میرے اندر کیا کیا صلاحیت اور طاقت اور کیا کمزوریاں ہیں اور میری منزل صحیح معنوں میں کیا ہے مجھے معلوم نہیں۔ بہت

جائزہ لینے کے بعد مجھ پر یہ واضح ہوا کہ میرا مشن دوسروں کو بے لوث فائدہ پہنچانا اور اُنکی کوتاہیوں کو درگزر کرنا ہے۔ جوانی کے خاصے حصے تک میں لوگوں سے وقتی طور پر ظاہری یا خفیہ ناراض بھی ہوجایا کرتا تھا۔مگر اب میں کچھ یوں سوچتا ہوں کہ اگر کوئی شخص مجھ پر زیادتی کرے تو اُس کی تین وجوہات ہوسکتی ہیں۔اولاً اُس کو میرے کسی عمل سے (جو میرے علم میں ہے یا نہیں) تکلیف پہنچی ہے اور یہ اس کا ردِعمل ہے۔ دوئم یہ کہ شاید کسی غلط فہمی کی وجہ سے اُسے بدگمانی ہوئی ہے اور تیسرا یہ کہ بلا وجہ اُس نے مجھے زک پہنچائی ہے۔اس تیسری صورت میں غالباً اُس کا ذہنی توازن ٹھیک نہیں ہے۔ ہر تین صورتوں میں یہ شخص قابل معافی ہے۔ ہاں اگر کوئی شخص کسی ایسے کام میں مبتلا ہے کہ جس سے اجتماعی طور پر معاشرہ، افراد یا املاک کو نقصان پہنچ رہا ہے تو اصلاح کی حد تک اور رائج قانون کے تحت اسے منع کرنے کیلئے سختی برتی جاسکتی ہے۔عداوت رکھنا، بدلہ لینے کے منصوبے بنانا وغیرہ میری فطرت میں شامل نہیں۔

ذات باری تعالیٰ غفور الرّحیم ہے اور انسان خطاء کا پتلا ہے۔قرآن میں توبہ سے گناہوں کی معافی کا ارشاد ہے۔توبہ کرنے کا حق اللہ نے اپنی مخلوق کو بخشا ہے۔دُعا اُمید کا سب سے بڑا ذریعہ ہے اور اللہ کمان سے نکلے ہوئے تیر کو واپس بلوا سکتا ہے۔ ’’وَاللّٰہُ غَالِبٌ عَلٰی اَمْرِہٖ‘‘(سورۃ یوسف آیت نمبر 12)۔اللہ اور رسول کی اطاعت و اتباع کے بعد والدین کا حق ثبت ہے۔ میں نے جن افراد کو بلند مرتبوں پر فائز اور خوشیوں میں رہتے ہوئے دیکھا ہے اُن میں سے اکثر کی ظاہر خوبیوں میں والدین کی خدمت، اطاعت اور محبت واضح ہے۔ میں یہ بھی اپنے بچوں کو کہتا رہتا ہوں کہ میں نے آج تک کسی ایسے شخص کو بامراد نہیں دیکھا جس نے اپنے ماں باپ کا دل دکھایا ہو۔

معاشرتی مسائل جو کچھ لوگوں کو تو یکساں نظر آتے ہیں مگر اکثر کی رائے میں اُن کے ذاتی عمل اور سوچ کے مطابق مختلف ہوتے ہیں۔گھر کا بہترین سکون اس میں ہے کہ بیوی اپنے شوہر کے جائز کاموں

میں اس کی اطاعت کرے، ناموس کی نگہداشت کرے اور اُس کی وفادار رہے جبکہ شوہر بیوی کے نان ونفقہ کا بندوبست کرنے، اُس کی حفاظت اور اُس کی طبعی ونفسیاتی ضروریات کو پورا کرنے کا ذمہ دار ہیں۔ آج کے جوان مرد و زن مساوی حقوق کو بنیاد بنا کر گھریلو زندگی کے اندر عمل درآمد کر رہے ہیں۔ ہمارے معاشرے میں بہت سی خواتین جب ذی اختیار (Empowered) ہوجاتی ہیں تو گھریلو نظم ونسق پر بُری طرح اثرانداز ہوتی ہیں۔ چونکہ مرد حضرات ہمارے معاشرے میں نفسیاتی طور پر اس برابری کو ابھی ہضم نہیں کر پارہے نتیجتاً گھریلو خلفشار عام ہوتا جارہا ہے۔

جوں جوں سائنس نے ترقی کی اور بہت سی چیزوں کی اصلی حالت معلوم کرنے کی کوشش کی جیسا کہ درخت ہے جیسے ہم کہتے ہیں کہ یہ درخت بہت پرانا ہے کوئی کہتا ہے ایک ہزار سال پرانا ہے یا سو سال پرانا ہے۔ مگر موجودہ سائنس بتا دیتی ہے کہ یہ کتنا پرانا ہے۔ اسی طرح بائبل میں دی گئی معلومات کے مطابق حضرت آدمؑ کی پیدائش غالباً چھ یا سات ہزار سال کے اندازے میں ہے جب کہ سائنسی حوالہ کے مطابق انسان بتدریج ارتقاء کے عمل سے گزر کر موجودہ انسان بنا۔ سائنس انسان کی صورت کو ستر ہزار سال پہلے سے موجودہ حالت میں بتاتے ہیں۔ بدقسمتی سے اس موزوں پر بہت گہری تحقیق بوجہ حرمت ابھی تک نہیں ہوسکی۔ میری سمجھ کے مطابق اللہ نے مٹی سے انسان کو بنایا۔ مگر یہ کہیں ثبت نہیں ہے کہ یہ واقعہ آناً فاناً ہوا۔ ممکن ہے کہ یہ کام ایک لمبے دورانئے پر محیط ہو۔ پہلے انسان کی پیدائش کا وقت (دور) اور انسانی ادراک کی آمد کا درمیانی فاصلہ متعین کرنا ضروری نہیں سمجھا گیا۔

زندگی ایک تسلسل کے ساتھ تبدیلی کا نام ہے۔ چیزیں اپنی اشکال ومعنی بدلتی رہتی ہیں۔ مجھے انگریز فلسفی جارج برنارڈ شا کی مثال یاد آ گئی ہے۔ وہ کہتا ہے۔ ”کرسی کہیں بھی پڑی ہوتو ایک موجودہ معاشرے کا انسان اس کو بطور کرسی پہچان دیتا ہے اگر یہی کرسی بہت قدیم واولین زمانہ تاریخ میں کسی شخص کو پیش کی جائے تو وہ اس کو لکڑی کے چند باترتیب ڈنڈے سمجھے گا۔ جبکہ موجودہ دور کا ایک ماہر طبعیات

اسے مالیکیول یا خلیات کا مرکب سمجھے گا"۔ بنیادی نقطہ حیات یعنی جین کا سفر جاری رہتا ہے اور آگے ٹرانسفر ہو جاتا ہے۔ کچھ باتیں ماں کی اور کچھ باپ کی خصوصیات شامل ہو کر ایک نیا انسان دنیا میں آتا ہے۔ حضرت آدمؑ و بی بی حوا کی خصوصیات اور موجودہ لوگوں کے جسمانی عمل وفکر بنیادی طور پر ایک جیسے ہونے چاہیں۔ یہ ماننے کے بعد کہ انسان کو پوری طرح اللہ تعالی نے بنا کر بھجوایا ہے تو شاید جانوروں کو بھی اسی طرح مکمل طور پر بنایا ہو ہاں البتہ یہ بھی ذکر ہے کہ چیزوں کی شکلیں بگاڑ دی گئیں۔ سائنسی اعتبار سے یہ بات سامنے آجاتی ہے کہ چیزیں وقت کے ساتھ شکلیں بدل لیتی ہیں۔ انسان اپنی حدود سے باہر بھی نہیں نکل سکتا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ وہ اپنی صلاحیتوں کو مکمل بروئے کار لاتے ہوئے دنیا کو کیا سے کیا بنا رہا ہے۔

میرے خیال میں ہر انسان کو اللہ کے آگے اپنی ہر سانس کا حساب دینا ہے۔ اس کی کوئی ممانعت نہیں آپ سوئیں، آرام کریں، کھیلیں، غور وفکر کریں، ایک دوسرے کا خیال رکھیں آپ ہر وہ کام کر سکتے ہیں جس کی شعور اجازت دیتا ہے۔ انسان جس قدر با اختیار ہوتا جاتا ہے۔ اُتنا ہی بے اختیار بھی ہو رہا ہوتا ہے۔ ایک صاحب علم جہاں طاقتور ذہن رکھتا ہے وہیں طاقت استعمال کرنے سے گریز بھی کرتا ہے کیونکہ اسے طاقت استعمال کرنے کے بُرے نتائج بھی معلوم ہوتے ہیں۔

اکثر لوگوں کی طرح میں بھی شاید اس دنیا میں باقاعدہ پلاننگ کے بغیر آ گیا۔ پیدا ہوا تو ظاہر ہے میرے پاس کچھ بھی نہیں تھا مجھے بڑا کیا گیا اور جب میں صاحب اختیار ہو گیا تو بہت ساری باتیں ایسی ہیں جس کے متعلق میں یقینی طور پر کہہ سکتا ہوں کہ میں نے بغیر پلاننگ کے کیں اور وہ ہو گئیں۔ لہذا دوسروں پر اللہ تعالی کی رحمتوں کو گننا اور نظر رکھنا حسد پیدا کرتا ہے۔ ہمیں خواہشات کی تکمیل کی دھن بجانے کی بجائے اپنے اوپر اللہ کے احسانات کو گننا چاہیے۔ یہ بات زرا دیر سے سمجھ آئی مگر آ گئی۔

" فکر ہر کَس بقدرِ ہمت اوست "

باب نمبر 15

کھیل کے میدان میں

ہمیں بچپن سے کھیلوں میں حصہ لینے کی ترغیب دی گئی۔سکول کے زمانے میں دیگر ساتھیوں کے ساتھ صبح ہشت نگری میں واقع مولانا فضل حق کی مسجد میں بمعہ فٹ بال فجر کی نماز پڑھتے اورشاہی باغ چلے جاتے وہاں سے واپسی پر سکول جاتے سکول شروع ہونے سے پہلے میں اور میرے کلاس فیلوفٹ بال کھیلتے۔سراج بڑا اچھا گول کیپر تھا۔میرے سینئر دوست نجم الہادی اور سعد الہادی سکول فٹ بال ٹیم میں تھے۔ہماری دال سکول ٹیم میں گلتی نظر نہ آتی تھی اسی دوران معلوم ہوا کہ ہمارے سکول میں ہاکی کی کوئی ٹیم نہیں۔ماسٹر ملک منظور کی خواہش پر میں نے اور شفیق نے سکول ہاکی ٹیم بنادی سراج کو زبردستی بطور گول کیپر لے گئے۔وہ بعد میں پاکستان ٹیم کا گول کیپر بنا۔سکول ٹیم کا میں کپتان تھالیکن جب سکول ٹورنامنٹ میں ٹیم کا علان ہواتو میرا نام کہیں نہ تھا۔ماسٹر ملک منظور سے احتجاج کے بعد معلوم ہوا کہ میں سولہ کھلاڑیوں میں بھی فٹ نہیں آتا۔جذبات میں آکر میں نے کرکٹ ٹیم جوائن کر لی۔ایک میچ کھیلا۔تیسرے نمبر پر بیٹنگ شروع کی اور تمام ٹیم آؤٹ ہونے پر بغیر کوئی رنز بنائے ناٹ آؤٹ واپس آ گیا۔ایڈورڈز کالج میں پھر سے ہاکی ٹیم میں شامل ہو گیا۔لیفٹ ہاف کی پوزیشن پر کھیلتا تھا۔شاہی باغ میں شام کو نامور کھلاڑیوں نواز ،سخی، مصطفی اشرف، بنوں سے تعلق رکھنے والے قومی ٹیم کے کھلاڑی حمیدی وغیرہ کے ساتھ کھیلتا تھا۔انہوں نے میری تربیت کی۔پشاور یونیورسٹی تک کھیلتا رہا۔ٹانگ کی ہڈی ٹوٹنے کے بعد ہاکی چھوڑنا پڑی۔ایڈورڈز کالج میں 1963ء تا 1965ء ٹیبل ٹینس بریک ٹائم میں کھیلتا تھا اور اب بھی شوق سے کھیلتا ہوں۔

انگلینڈ میں ڈارلنگٹن کاؤنٹی کے ایک ہسپتال میں کام کرتا تھا۔جہاں سکواش کھیلنا شروع کی۔شروع میں زیادہ بہتر نہیں کھیل پایا لیکن پریکٹس کے ساتھ ساتھ کارکردگی بہتر ہوتی گئی اور میں نے نمایاں

طور پر سکواش کھیلنا شروع کی۔ ایک واقعہ نے دل و دماغ پر بہت برا اثر چھوڑا ہوا یہ کہ ایک جوان کارڈیالوجسٹ ڈاکٹر کارٹر دوران گیم سکواش کورٹ میں دل کا دورہ پڑنے سے انتقال کر گیا۔ انگلینڈ میں وارڈ کی نرسوں کے کہنے پر آئس سکیٹنگ میں حصہ لیا یہ کھیل بھی آسان نہیں تھا بہت سے لوگوں کی کلائی کی ہڈی ٹوٹنے کے واقعات دیکھے۔ پاکستان واپس آ کر ایبٹ آباد کلب میں کئی سال تک ٹینس مارکر مانو کے ساتھ کھیلتا تھا۔ ایبٹ آباد میں ایک صاحب جن کا نام نثار احمد تھا۔ وہ سیٹھوں کی دکان پر سیلز کا کام کیا کرتے تھے اور نوائے وقت اخبار میں رپورٹر بھی تھے۔ ان کی تجویز پر میں نے ورکنگ کلاس کے کھلاڑیوں کو یونی فارم اور فٹ بال لے کر دیا اور ایک ٹیم بنائی بعد میں میرے دوست احسن مختار اشرف جو ایس ایس پی پولیس ایبٹ آباد تھے کے تعاون سے پولیس گراؤنڈ میں باقاعدہ ٹورنامنٹ کروانا شروع کئے۔ فٹ بال سے میرے دلچسپی واپس لوٹ آئی 1987ء میں سردار بہادر خان ایڈوکیٹ کی ریٹائرمنٹ کے بعد مجھے ڈویژنل فٹ بال ایسوسی ایشن ہزارہ کا بلا مقابلہ چیئرمین منتخب کر لیا گیا۔

میں اپنے فرائض 1998ء تک سرانجام دیتا رہا ان دنوں آئی جی پولیس سعید احمد خان صوبائی فٹبال ایسوسی ایشن کے چیئرمین تھے۔ انٹرنیشنل فٹ بال کوچ و ریفری حاجی عبدالعزیز کو سیکرٹری جنرل منتخب کیا گیا۔ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ ہزارہ فٹ بال ایسوسی ایشن اختلافات کا شکار ہوگئی اس مشکل وقت میں میرے لئے تمام ڈسٹرکٹ ایسوسی ایشن کو اکٹھا کر کے فٹ بال کھیل کو آگے بڑھانا انتہائی پیچیدہ مرحلہ تھا۔ الیکشن کا شفاف ہونا ہر آرگنائزیشن کے لئے ضروری ہوتا ہے۔ کرنل مجاہد اللہ خان، وحید مفتی اور نور احمد شاہ نے ہزارہ فٹ بال ایسوسی ایشن کو متحد رکھنے اور کھیل کی ترقی و فروغ میں میری مدد کی۔ فاروق خان نواں شہر والے، سعید خان بینک والے، سالم خان مانسہرہ، نوجوان حمید خان اور ممتاز سپورٹس جرنلسٹ راشد جاوید، شجاع، نیاز پاشا جدون اور دیگر حضرات بھی تعاون کرتے رہے۔ ان سب کی کوششوں سے نہ صرف ڈویژنل فٹ بال ایسوسی ایشن متحد ہوئی بلکہ تین نیشنل فٹ بال ٹورنامنٹ آرمی سنٹرل کے گراؤنڈ

میں منعقد ہوئے۔ایبٹ آباد چھوڑنے کے بعد بھی میرا رابطہ فٹ بال ایسوسی ایشن کے عہدے داروں اور کھلاڑیوں سے قائم ہے جن میں سرفہرست عبدالحمید آف نواں شہر ہیں۔عمر کے اس حصے میں کچھ عرصہ قبل تک رحمان میڈیکل کالج میں ٹیبل ٹینس کھیلتا رہا۔چند سال پہلے کارڈیالوجسٹ آر ایم آئی ڈاکٹر مقدار اور رحمان ڈینٹل کالج کے ڈاکٹر سمیع صالح خان کے اصرار پر گالف کھیلنا شروع کیا اور اس سے بہت محظوظ ہو رہا ہوں۔میرا ٹریز راج محمد عرف راجو بہت زندہ دل اور قابل انسان ہے۔وہ میرا شوق برقرار رکھنے میں بہت مددگار رہے۔میچ کھیلنے کی بجائے اکیلے کھیلنے سے میرے وقت کی بچت اور خاطرخواہ ورزش بھی ہو جاتی ہے۔گالف تکنیکی لحاظ سے ایک مشکل کھیل ہے جس میں پریکٹس کی باقائدگی لازمی ہے۔اس کھیل کا مزا تمام کھیلوں سے زیادہ قرار دیا جاتا ہے۔شوقین لوگ زندگی کا ایک بڑا حصہ گالف کلب میں گزار دیتے ہیں۔اور بعض کھلاڑی یہ کہتے سنے گئے۔

"گالف جو نہیں ہے تو کچھ بھی نہیں ہے"

باب نمبر 16

واہ واہ پاکستان بنانے والے

ہندوستان میں مسلمان آبادی میرے خیال میں ہزار برس سے مختلف سرحدوں کے ذریعے داخل ہونے والے اسلامی مبلغین، بیرونی مسلمان حملہ آوروں کی آمدورفت یا سلطنتیں قائم کرنے کی وجہ سے ہوئی۔ سب سے اہم اور آخری سلطنتِ مغلیہ جو تقریباً (تین سو سال) قائم رہی۔ یہ سلطنت دین کے معاملات میں خاصی لچکدار واقع ہوئی۔ پہلے سے مسلمان آبادی کے علاوہ ہندو کثیر تعداد میں اس میں شامل ہوئے۔ مگر اس کے باوجود مغلیہ دور کے خاتمے پر بھی دونوں مذاہب کی آبادی کے تناسب میں بہت واضح فرق تھا۔ دونوں مذاہب کے پیروکار (ہندو اور مسلم) ہندوستانی کلچر رکھنے کے باوجود فلسفہ، عقائد، روزمرہ کے مشاغل میں اس قدر مختلف تھے کہ ان کا اجتماعی اور دلی نباہ کبھی بھی ممکن نہ ہوا تھا۔ انگریز کے دوسو سالہ راج نے مغربی طرز زندگی بہت محدود انگریزی طرز کے شہری تمدن کو رائج کیا جو ہندو مسلمان دونوں میں قائم ہو گیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ علامہ اقبال کے پیش کردہ دوقومی نظریہ پاکستان بننے پر رائج ہو گیا۔ اگرچہ مخالفین کی آراء میں زیادہ مسلم آبادی حسب سابق موجودہ بھارت میں رہی۔ بات سب ہندوستانی مسلمانوں کو ہندوؤں اور دیگر مذاہب کے پیروکاروں سے الگ کرنا نہیں تھا بلکہ مسلمان آبادی کے لئے ایک مثالی، وفلاحی سرزمین۔ کو وجود میں لانا تھا۔

بدقسمتی سے پاک و ہند کی تقسیم کے وقت فطرتی ہلڑ بازی نے سیاسی نعروں میں دونوں علاقوں سے مسلمان اور ہندو آبادیوں کو بے سروسامانی میں ہجرت کرنے پر مجبور کر دیا اور لاکھوں افراد جان کی بازی ہار گئے۔ مسلمان آبادیاں خلافت موومنٹ کی خوش خیالی کے تحت زیادہ جوش اور قربانی کے جذبے کی وجہ سے شدید مالی و جانی مشکلات میں سے گزر کر لٹے پٹے پاکستان پہنچ گئے۔ یہ سب حکومت منتظمین یا سیاسی پارٹیوں کی توقعات سے برعکس تھا۔ اگرچہ نتیجہ کے طور پر تمام ایک دوسرے کے اوپر کیچڑ آج تک

اُچھالتے رہتے ہیں۔ پاکستان بننے کا سہرا قائداعظم محمد علی جناح کے سر ہے۔اس عظیم مردمومن نے بڑی فراست سے نہ صرف ایک نئی قوم، ایک نیا ملک اور ایک نئی تاریخ پاکستان کی جغرافیائی وجود کی شکل میں رقم کی بلکہ یہ سعادت بقول پروفیسر اسٹینلے ولپرٹ آج تک کسی کے حصہ میں نہیں آئی۔ قائداعظم نے اپنی ذات کو نہ کبھی اچھالا اور نہ دوسروں کو اس کا موقع دیا۔ایک ایسا شخص جس کے مخالفین بھی کبھی اس کی ذات پر حملہ آور نہ ہو سکے۔ہم آج جو بھی ہیں قائداعظم کی مرہون منت ہیں۔ یہ تو تھا سنجیدگی اور دلی جذبات کا پہلو۔ درجہ ذیل عبارت صرف ازراہ تفنن ہے اس کو تضحیک یا تمسخر نہ سمجھا جائے۔

بچپن میں ہمارے ایک بزرگ مفتی عبدالصمد جو میرے دادا کے بھائی تھے۔کلین شیو تھے۔ اکثر صوفیانہ یعنی سبز رنگ کے کپڑے پہنتے تھے۔صبح صبح راگ گاتے اور کبھی کبھی بات چیت کے دوران ہنستے ہوئے نعرہ مارتے "واہ واہ پاکستان بنانے والے" اس زمانے میں مجھے پاکستان کا کچھ زیادہ تصور نہیں تھا میں اکثر سوچتا کہ یہ بھی کوئی شعر ہے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ یہ بات طنزیہ تب کہتے جب کوئی واقعہ ایسا ویسا ہو جاتا۔

سکول میں پاکستان کے متعلق پڑھا سنا۔مگر جب صدر بازار میں چند مقتدر لوگوں کو بری حالت میں پولیس کی حراست میں جاتے ہوئے دیکھا تو میرے والد نے کہا کہ بیٹا یہ پاکستان ہے۔حکومت کا پہلا تاثر یہ تھا کہ وردی والے لوگوں کو حکومت کہتے ہیں۔ جشن خیبر پشاور کے گیٹ پر اور ٹرکوں کی پشت پر ایک تصویر سے معلوم ہوا کہ پاکستان دراصل جنرل ایوب خان ہے۔ انھیں بہت عرصے تک میں آفاقی مخلوق جانتا رہا۔ایبڈو کا نام بطور بدمعاش سمجھتا تھا۔ پولیس ہتھ کڑی لگانے والے کو سمجھتا تھا۔سب سے بہادر اور مضبوط انسان بڑی مونچھوں والا وہ شخص تھا جو اندورن ہشتنگری گیٹ پولیس تھانے کے سامنے شراب پی کر ایک ہاتھ میں کارتوس اور دوسرے ہاتھ میں دونالی بندوق لئے بھڑکیں مارتے چلتا پھرتا رہتا تھا۔قائد اعظم کے نام و شخصیت کا تعارف آٹھویں جماعت میں ایک تقریر یاد کرتے ہوا۔

سنا ہے کہ یہ ترانہ پاکستان بننے تک پڑھا جاتا تھا۔

سارے جہاں سے اچھا ہندوستان ہمارا

ہم اس کے پاسباں ہیں وہ پاسباں ہمارا

کچھ عرصہ ہم صبح سکول میں یہ ترانہ پڑھا کرتے تھے:

"لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری

زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری"

پھر بہت عرصہ بعد ہم ایک غیر قومی زبان فارسی میں یہ ترانہ (جسکا مطلب شاید ہی طلباء، اساتذہ یا عوام الناس کو آتا ہو) پڑھنے لگے:

پاک سرزمین شاد باد کشور حسین شاد باد

میٹرک تک یا اس کے بعد بھی اس ترانے کا مطلب سمجھ نہیں آیا۔ شروع کے چند عرصہ صرف یہ سوچتا تھا۔ کہ اس میں میرے کلاس فیلو سرزمین کا نام ہے۔ اور کشور سلطانہ ایک خوبصورت خاتون ہے۔ جھنڈے کے سامنے یہ کیوں پڑھا جاتا ہے۔ سمجھ سے باہر تھا۔ جھنڈوں کے میلے کی طرح جہاں ہم رنگ برنگ کے انڈے لڑاتے۔ لکڑی کے جھولے جھولتے۔ اور چاچا شلہ کو بھنگ پی کر نوشوہادی کے میلے پر رسیوں کے پھندے سے الٹا لٹکنے کا تماشہ کرتے۔ اب سمجھ آئی کہ "واہ واہ پاکستان بنانے والے" کا مطلب کیا ہے۔

پہلی مرتبہ میٹرک کے دنوں میں فیملی کے ساتھ لاہور گئے تو پتہ چلا کہ ہم پنجاب آ گئے ہیں۔ تاریخ میں پانی پت کی لڑائیوں، 1857ء کی جنگ آزادی، لارڈ کلائیو اور ماؤنٹ بیٹن کی بوریت کے بعد پاکستان بننے کے تصور کا خاکہ نہ ہونے کے برابر تھا۔ میڈیکل کالج میں پہنچ کر ایک بنگالی کلاس فیلو کے لمبے بال دیکھ کر مشرقی پاکستان اور بنگال کچھ کچھ سمجھ آیا۔ "امار تمار کو بھالو بھاشئے" کہنے پر بمشکل مار کھانے سے بچا۔ اور بنگالی زبان بولنے سے توبہ کی۔

خواجہ ناظم الدین نامی کسی اہم حکومتی کردار کو اکثر"من بھاتا کھاجا" سے پکارا جاتا تھا۔ یہ بات مشہور تھی کہ ہر روز اس کے لئے نوتھیہ پشاور کے کریمو کباپی سے کباب بذریعہ جہاز کراچی جاتے ہیں۔ ہم سب دوست اس بات پر بہت نازاں تھے۔ پہلا الیکشن ایوب خان کے دور میں ہونا یاد ہے ایک امید وار جو اخبار کا مدیر تھا کو صرف دو ووٹ ملے۔ وہ حیران تھا کہ دوسرا ووٹر کون ہے؟۔ ہر کوئی ان کو ووٹ دینے کا دعویدار تھا۔ سادہ زمانہ تھا۔ ایوب خان کے زمانے میں بیل اور گدھا گاڑیوں کے بڑے پہیوں پر لوہے کی جگہ ربڑ لگائے گئے تا کہ سڑکیں خراب نہ ہوں اور یوں تارکول کی سڑکوں پر ہمواری پیدا کرنے کی کوشش کی گئی۔ مگر یہ ہمارے مزاج کو راس نہ آئی، آج بھی زیادہ تر سڑکیں کھڈوں سے بھرپور ہیں۔

میٹرک سے ایم بی بی ایس تک بلوچستان کے علاوہ تمام پاکستان دیکھ لیا۔ سوائے کراچی کے پانوں کی پیک۔ لاہور کی لسی اور پشاور کے چپل کباب ونسوار کی تھوک کے علاوہ کوئی خاص تہذیب محسوس نہ ہوئی۔ ہم جی ٹی ایس اور ڈبل ڈیکر کے ذریعہ چار آنے میں (موجودہ پچیس پیسے) میں شہر بھر میں گھومتے۔ ایوب خان کے زمانے میں تین پہیوں والی پیٹرول سے چلنے والا رکشہ پہلی دفعہ سڑکوں پر نظر آیا جو آج بھی مقبول عام سواری ہے۔ اس میں دو سے دس تک مسافر بیٹھ سکتے، شور اور دھواں کسی بھی طور کم نہیں البتہ اب گیس سے چلنے والے رکشہ بھی بڑی تعداد میں سڑکوں پر رواں دواں دکھائی دیتے ہیں۔ سال سوم ایم بی بی ایس (1969ء) میں ایک تولہ سونا کے سکہ کو اسی روپے میں خرید کر اپنے دوست کی دلہن کو تحفہ دیا۔ 72-1971ء میں نوے روپے کے عوض جونیئر ہاؤس جاب کی۔ رکشوں کے مزے لئے۔ پتہ چلا کہ لیڈی ریڈنگ ہسپتال کے خاکروبوں کی تنخواہ تو ایک سو روپے ہے۔ ڈاکٹروں میں غصہ اُبھر آیا۔ سڑکوں پر جلوس تین لائنوں میں چلتے نکالے۔ نعرے لگائے کہ"اس لئے ہم ملک چھوڑنے پر مجبور ہیں۔ کچھ دن بعد دوسرے ہاؤس جاب میں تنخواہ ایک سو پچاس روپے ہوگئی۔

1969ء میں کراچی میں ایک ماہ رہے۔ ٹرام چلتی تھی۔ رات بھر بازار کھلے رہتے۔ تاج محل

اور ایکسل شیئر کے مزے لوٹے۔ زیب النساء سٹریٹ کے کونوں میں شراب خانے جو دیگر شہروں میں بھی موجود تھے دیکھے۔ کوئی ہلڑ بازی نہیں تھی۔ امن تھا۔ ون یونٹ کے زمانے میں تمام صوبوں کو یکجا ایوب خان نے کیا۔ ہمارے محلہ سکندر پورہ پشاور میں پنجابی و سندھی دکاندار بھی تھے۔ بنگالی محلہ جیون مل میں رہتے میں نے یہ سب خود دیکھا۔ اردو بولنے والے مہاجر خوش اسلوبی سے پٹھانوں کے ساتھ رہتے تھے۔ ہم ان کو بھیا کہتے تھے۔ زمانہ خوب تھا۔ کراچی میں دوسری دفعہ 1982ء میں رہا۔ ٹرام کے علاوہ باقی سب کچھ وہی تھا۔ لاہور گوالمنڈی میں پورے خاندان کے ساتھ اٹھارہ روپے میں لسی، چھولے وحلوہ پوڑی کا ناشتہ بھی کیا۔ چھ آنے۔ بارہ آنے اور ایک روپے میں فرسٹ، سیکنڈ اور تھرڈ کلاس کی سیٹوں پر بیٹھ کر فلمیں دیکھیں۔ معاملات اس کے بعد بگڑے اور ابھی تک بگڑ رہے ہیں۔ آخر کلام یہ ہے کہ پاکستان پر لوگوں کو فخر ہونا کبھی یاد ہی نہیں رہا۔ البتہ اس کے زبانی کلامی وفادار رہنے کی کوشش ضرور کرتے رہے۔ وقت کے ساتھ اس کا نام زیادہ سے زیادہ کتابوں، میڈیا اور لوگوں کی زبان پر بے ساختہ مگر مہمل طریقے سے جاری وساری ہے۔

باب نمبر 17

بازار کا بھاؤ اور وقت کا تقاضا

بہت چھوٹا تھا غالبا دوسری یا تیسری جماعت میں گنج میں رہتے تھے قریب تحصیل گور کٹھری پشاور میں عزیزوں کے گھر کوئی تقریب تھی۔ گھر کے باہر گیلری میں چند مرد حضرات بیٹھے تھے۔ سب جاننے والے تھے۔ ایک جوان عزیز نے مسکرا کر زمین کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ زمین پر اٹھنی یا روپیہ کا سکہ پڑا چمک رہا تھا۔ یاد رہے ایک روپے میں دو اٹھنی چار چونی اٹھ دوانی وسولہ آنے اور ایک آنے میں دو ٹکے ہوتے تھے۔ اس پر ایک مشہور گانا یاد آیا"تیری دو ٹکیاں کی نوکری اور میرا ساون بیتا جائے"۔ بہر طور میں سکے کو کچھ دیر تک لالچ سے دیکھتا رہا۔ مگر جھجھک رہا تھا۔ اُٹھانے کی تاب نہ ہوئی۔ کافی دیر خرگوش کی طرح دیکھتا رہا۔ آخر کار دل نے فیصلہ کیا کہ سکہ نہ اُٹھایا جائے اور میں وہاں سے آگے بڑھ گیا۔ نوجوان نے اپنے ساتھی کو دیکھا اور سر ہلایا۔ جیسے میرے بلند اخلاق کی داد دے رہا ہو۔ اُنہیں معلوم نہ تھا کہ اگر صرف خدا دیکھ رہا ہوتا تو میں سکہ اُٹھا کر جیب میں ڈال لیتا۔

بارہ سال کی عمر میں علاقے میں گوشت کی دکان سے چونی (25 پیسہ) کا پاؤ گوشت خرید کر ایک دوسری دکان سے چونی کے چلغوزے خریدے اور آگے جا کر چونی کے پکوڑے لئے واپسی پر چونی کی چار روٹیاں خرید کر گھر روانہ ہو جاتا تھا۔ سوچتا تھا کہ سب سے قیمتی سکہ چونی ہے۔ یوں ایک روپیہ خرچ ہوا مگر اہمیت صرف چونی کی رہی۔ چھٹی ساتھویں کلاس میں گھر سے ایک آنہ روز ملتا۔ ایک آنہ میں سے تین پیسے کی آدھی روٹی اور ایک پیسے کے گرما گرم چھولے بمعہ کچھ جھونگا (فالتو چھولے) یہ سب بریک میں سکول میں لگی ریڑھی سے لیکر کھاتا۔ زیادہ مالدار لڑکے چھ پیسے (ایک آنہ اور ایک ٹکہ) کی پوری روٹی اور بھرے ہوئے چھولے لیتے۔

میٹرک میں تعلیم کے دنوں میں نیشنل بینک ڈبگری پشاور سے فقیر آباد والے گھر کا کرایہ وصول

کرنے گیا۔کاؤنٹر پر 80 کی جگہ 90 روپے ہاتھ میں آئے۔کچھ دن خاموش رہا مگر پکڑا گیا۔اگلی بار کرایہ وصول کرنے بینک گیا تو انکل نے کہا۔یار میرا خیال ہے پچھلی بار تمہیں دس روپے فالتو چلے گئے تھے۔میں کھسیانا ہوا۔اورانھوں نے دس روپے کاٹ کر باقی مجھے دے دیئے۔

میڈیکل کالج داخلے کے وقت 80روپے کی ہرکولیس سائیکل بیچی۔داخلے کی خوشی نے سائیکل بیچنے کا افسوس بھی زائل کر دیا۔ میڈیکل کالج تک کا سفر جی ٹی ایس کی ڈبل ڈیگر کے ذریعے ہشت نگری اڈہ سے پشاور یونیورسٹی تک چار آنہ میں طے ہوتا کبھی نشست مل جاتی اور کبھی سارا سفر لٹک کر طے کرنا پڑتا۔کبھی مردانہ سیٹوں پراور کبھی مہربانوں کی مہربانیوں سے اگلی سیٹوں پر۔خیبر بازار کے چکر لگاتے ہوئے سفر کے دوران کبھی بوریت نہ ہوئی۔اپنے بہت قریبی دوست اصغرعلی شاہ (میر جی) کی شادی پر 80روپے کا پونڈ (برابر ایک تولہ سونا)۔سنیارا بازار سے خرید کر دلہن کوتحفہ دیا۔غالبا تولہ سونا سو روپے کا تھا۔پہلی تنخواہ ہاؤس جاب میں ایک سو روپے ملی جو بعد میں ایک سو پچاس روپے ہوگئی۔مارکیٹ سے 80روپے کا فریج خریدااور گھر جا کر ماں کوتحفہ دیا۔اس کے چہرے کی خوشی اورمحبت کے جذبات آج بھی میرے دل ودماغ میں محفوظ ہیں۔جب تک وہ فریج رہا میری ماں سب کواس کی اطلاع دیتی رہی۔

حج بیت اللہ جاتے وقت 1972ء میں ہمیں کہا گیا کہ روپیہ ریال کے بدلے میں ہے سعودیہ میں ہر جگہ استعمال ہوجاتا ہے۔بینک سے ریال میں نہ تبدیل کرو۔1973ء میں نو روپے اور کچھ پیسے کا پاؤنڈ تھا۔اوراس ریٹ پر میں نے انگلینڈ جاتے ہوئے پونڈ خریدے۔کلاس ون آفیسر۔/250 وسینئر کلاس ون آفیسر -/350 روپے ماہوار کے ملازم تھے۔سپیشلسٹ ڈاکٹر کی فیس سولہ روپے تھی۔

1981ء ہمیں بطور اسسٹنٹ پروفیسر ایوب میڈیکل کالج گریڈ اٹھارہ میری تنخواہ -/2500 روپے ماہوار تھی۔گزارہ چلتا تھا۔ مریض سے فیس -/25 روپے مقرر تھی۔جب کے موجودہ وقت (2022ء) میں اسسٹنٹ پروفیسر دولاکھ یااس سے زیادہ لے رہا تھا اور مریض سے فیس پندرہ سو سے دو ہزار لی جانے لگی تھی۔

باب نمبر 18

نسبتیں

میرا خاندان:۔

میرے گھرانے سے متعلق تمام یاداشتیں جو میں یہاں رقم کر رہا ہوں ۔ مجھے میرے بزرگوں اور مختلف حوالوں سے ملی ہیں۔ ان کے مطابق مفتی خاندان پشاور میں امیر افغان دوست محمد بارک زئے کے والد پائندہ خان بارک زئی کے زمانے میں شہزادوں اور قاضی گھرانے کے ہمراہ غزنی سے غالباً 1750ء-1770ء میں پشاور آیا اور مختلف جگہوں پر آباد ہوگیا۔اس زمانے میں پشاوراور دور دور تک دیگر علاقے افغان حکومت میں شامل تھے۔ہزارخوانی کے قبرستان میں دفن ہمارے خاندان کے بانیوں میں سے ایک حافظ مفتی محمد عظیم کے مقبرے پر ان کی تاریخ وفات 1858ء کندہ ہے۔ان کے نام سے منسوب گنج وتحصیل گورگھٹر ی، پشاور میں واقع تالاب والی مسجد آج موجود ہے۔جو محلہ مفتی عاشور سے ملحق ہے۔ پشاور کے انتہائی مقتدر عالم وفاضل سید محمد امیر شاہ قادری المعروف مولوی جی کی نوشت''تذکرہ علماء ومشائخ'' طباعت مکتبہ الحسن، یکہ توت، پشاور نے صفحہ 128 تا 138 میں حضرت بحر العلوم حافظ محمد عظیم صاحب تخلص واعظ حافظ جی گنج والے کی حیات 1205ھ تا 1275ھ (1783ء تا 1853ء) بیان کی ہے۔ان کے شاگردان عزیز میں حافظ عبدالغفور المشھو راخون درویزہ صاحب شامل ہیں۔انکے چار بیٹوں میں سے بڑے بیٹے حافظ محمد امین کو والئی کابل امیر شیر علی خان نے مفتی کابل مقرر کیا تھا۔سبھی میرے دادا کے زمانے تک فارسی زبان بولتے تھے۔جو میرے والد کو بھی آتی تھی۔

میرے دادا مفتی محمد عارف ، نانا میاں فضل قادر، مفتی عبدالماجد وحکیم مفتی عبدالواسع کی شاخ اوپر جاکر غزنی میں مقیم مفتی زین العابدین کے چار بیٹوں سے جڑ جاتی ہے۔مفتی زین العابدین کا شجرہ بنو ہاشم خاندان کے ساتھ جاملتا ہے(میرے ماموں زاد جناب شہاب یوسف صاحب مقیم ورسک روڈ پشاور

نے متعدد بار مجھے یقین دلایا کہ انہوں نے اپنی آنکھوں سے یہ شجرہ دیکھا ہے اور شجرہ ابھی تک ہمارے خاندان کے ایک صاحب کے پاس موجود ہے۔ بنو ہاشم کے خاندان کے شہداء کربلا کی معلومات مجھے عسکر بشیر ولد بشیر جان صراف سے بھی ملی ہیں۔ واللہ علم بالصواب!

بہت سے مفتیوں نے چارسدہ میں مفتی آباد گاؤں آباد کیا۔ وہ سب ہماری رشتہ داری میں آتے ہیں اور چند ایک اب بھی وہاں آباد ہیں۔ ان سب کے گھروں میں دینی ماحول تھا اور باقاعدہ فتوے بھی جاری کئے جاتے تھے۔ میرے دادا مفتی محمد عارف و میری دادی جان سلطان بمعہ چچا مسعود جان و پھوپھیوں (پوپھو جی و آغا باجی) کے ڈھکی شریف خان پشاور میں رہتے تھے (مفتی شریف خان کے نام سے شریف خوانی گاؤں منسوب ہے)۔ ڈھکی کے اکثر مکان ان لوگوں کی ملکیت تھے۔ میرے بڑے تایا مفتی احمد گل بچپن سے ہی محلہ سیٹھیان میری دادی کی بہن اماں جان (شاہ جہاں بیگم) کے ہمراہ مقیم تھے۔ میرے نانا میاں فضل قادر جو ایک بااثر وصاحب جائیداد شخص تھے نے پشاور سے دس کلومیٹر دور ترناب فارم کے سامنے ایک گاؤں ناظر گڑھی آباد کیا۔ وہ ایک تین منزلہ عمارت، جو بنگلہ کہلاتی ہے میں رہائش پذیر تھے۔ یہاں انہیں حکومت وقت سے مالی تقسیم و دیگر فیصلہ جات کرانے کے حوالے سے عدالت لگانے کی اجازت دے رکھی تھی۔

پشاو کے مشہور وکیل اور سپریم کورٹ بار کے سابق صدر قاضی انور ایڈوکیٹ کے مطابق ان کے والد نے کم وبیش 1910ء میں اس بنگلے میں رہ کر مشہور ایگری کلچر ریسرچ انسٹیٹیوٹ ترناب فارم پشاور بنانے کی نگہداشت کی تھی۔ لہٰذا میرے نانا کی پیدائش 1880ء کے آس پاس ہوسکتی ہے۔ ان کی پہلی شادی سے میاں فضل عزیز (میرے بڑے ماموں) پیدا ہوئے۔ بیوی کی وفات کے بہت عرصہ بعد میرے نانا نے اپنے رشتے کی بھانجی رقیہ بیگم (ماں جی جان) سے شادی کرلی جو میری سگی نانی ہوئیں۔ میں نے اپنے نانا اور بڑے ماموں کو نہیں دیکھا مگر کہا جاتا ہے کہ وہ نہ صرف پُرکشش و پُروقار تھے بلکہ انتہائی

نیک انسان بھی تھے۔ یہ خصوصیات اُن کے پڑپوتوں ظفر شبیر (موجودہ ڈی آئی جی پولیس) اور ریٹائرڈ میجر اظہر شبیر میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔

میرے نانا اپنی پہلی اہلیہ کی وفات کے بعد اکیلے رہتے تھے۔ تقریباً ساٹھ سال کی عمر میں ان کو پیٹ کی شدید تکلیف ہوئی۔ پیشاب میں خون جاری ہوگیا ان کے بچنے کی امید نہ تھی لیکن وہ اپنے چند مصاحبوں کو بذریعہ بحری جہاز لے کر حج بیت اللہ کرنے اس نیت سے نکل پڑے کہ اس ارض پاک پر اُنکا خاتمہ بالخیر ہو جائے۔ باقی کے معاملات اپنے واحد بیٹے میاں فضل عزیز کے حوالے کر گئے۔ لیکن منشاء خداوندی کچھ اور تھی۔ زمزم پیتے رہے اس دوران پیشاب کے راستے ایک پتھری خارج ہوگئی اور وہ بالکل صحت یاب ہو گئے۔ درحقیقت ان کو گردے کی پتھری کی تکلیف تھی جو اُس وقت شاید ناقابل تشخیص تھی اور ان کی بیماری کو لاعلاج قرار دے دیا گیا تھا۔ لیکن جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے؟ وہ صحت مند واپس پشاور لوٹے اور رقیہ بیگم سے دوسری شادی کر لی جس سے پانچ بچے ہوئے۔ میری نانی کی وفات کے وقت میں چوتھی جماعت کا طالب علم تھا۔ وہ انتہائی نیک خاتون تھیں ان کے ہاں ہر وقت درجنوں بڑے اور چھوٹے بچے اور بچیاں قرآن پاک کی تعلیم حاصل کیا کرتی تھیں۔ ان کو بی بی جی کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ میری والدہ اور خالائیں بھی بچوں کو قرآن پاک پڑھاتی تھیں۔

میرے ماموں میاں فضل عزیز اور میرے نانا کی دوسری شادی ایک ہی دور میں ہوئی۔ میاں فضل عزیز کے بچے (میاں غلام دستگیر، میاں غلام شبیر، میاں ظہور الحسن عرف شہزادہ، فاروق جان عرف ببو گل، بی بی جان، بانو اور چاند بی بی) اور رقیہ بیگم کے بچے (میاں محمد اسماعیل قریشی، میاں محمد یوسف قریشی، ماہ لقاء، نور النساء و نثار فاطمہ) تقریباً ایک عمر کے تھے۔ دونوں خاندان اندرون ہشتنگری ساتھ ساتھ گھروں میں محلہ عطائی خان میں مقیم تھے۔ اور گاؤں میں بھی رہائش رکھتے تھے۔ اس خاندان کے موجودہ دور میں حیات بچے اپنی اپنی جگہ معقول اور باعزت حیثیتوں میں مقیم ہیں۔ اُن کے نام یہ ہیں۔

ماہ گل، میاں ظفر شبیر، میجر اظہر شبیر (ر) سعدیہ ذوالفقار، فرح، ہماء وعنبرین، شہاب یوسف، نورالسحر (شبنم) وشہلا رضوان ہیں۔ (مرحومین میں بانو، چاند بی بی، شہزادہ ظہورالحسن، میاں شبیر احمد، بیوگل، میاں غلام دستگیر، بی بی جان، شبانہ (لطافت بیگم) اور میاں عاصم اسماعیل شامل ہیں، میاں فضل قادر کی بڑی بیٹی ماہ لقاء (میری ماں) اور اس کے بچوں کا زکر اس کتاب کے دیگر صفحوں میں تحریر ہے۔ منجھلی بیٹی نورالنساء غیر شادی شدہ تھی۔ چھوٹی بیٹی نثار فاطمہ (شیرین گل) کے بیٹے احمد ضیاء بابر، احمد ریاض ناجی، احمد رضا خرم، احمد فیاض سکندر واحمد نوید اصغر شامل ہیں۔

والدین:۔

میرے والدین کی شادی 1942ء میں ہوئی۔ ان کے ہاں آٹھ اولادیں ہوئیں۔ پہلی بیٹی کا نام شہناز تھا جو کم عمری میں فوت ہوگئی۔ دوسرے نمبر پر خالد عطاء اللہ مفتی 1944ء میں پیدا ہوئے۔ وہ اپنی پیدائش 31 دسمبر کو مناتے ہیں۔ ان کے بعد ایک اور بھائی خالد سعید (مرحوم) 6 اپریل 1946ء میں پیدا ہوئے۔ میں تیسرے نمبر پر آتا ہوں۔ اُس کے بعد میرا بھائی احمد سعید 5 اگست 1950ء اور پھر ثروت لقاء (پینزی) 10 اکتوبر 1951ء کو پیدا ہوئیں۔ ایک اور بھائی جس کا گھریلو نام سنی تھا دو سال کی عمر میں چیچک کی بیماری کے باعث اللہ کو پیارا ہو گیا۔ 6 مارچ 1956ء کے دن میری سب سے چھوٹی بہن نزہت لقاء (روحی) گنج چوک والے گھر میں رات کے کسی پہر پیدا ہوئی۔ صبح جب میری خالہ نے مجھے اطلاع دی تو میری خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی۔ میں نے ایک پین لے کر کتابوں والی الماری کے دروازے پر مضبوطی سے تاریخ اور نام کندہ کر دیا جو 1970ء کی دہائی تک اُسی طرح الماری پر لکھا رہا۔

میرے والد مفتی احسان اللہ:۔

میرے والد مفتی احسان اللہ (آغا جان) ولد مفتی محمد عارف ولد مفتی محمد عاشق 1913ء میں پیدا ہوئے اور اکتوبر 1997ء (یکم رجب) میں وفات پا گئے۔ وہ پانچ بہن بھائیوں میں سب سے

چھوٹے تھے۔اُنہوں نے میٹرک تک تعلیم سرکاری سکول میں حاصل کی۔جب کہ اس دوران وہ مدرسہ میں بھی تعلیم حاصل کرتے رہے۔اور یہی وجہ میرے والد کی مسجد سے اُنسیت اور ان کی عربی وفارسی میں عالم فاضل ہونے کی تھی۔میٹرک کے بعد انگریز حکومت میں سرکاری سکریٹیریل سروس کے ملازم ہوئے۔شروع کے چند سال مالاکنڈ میں پولیٹیکل ایجنٹ کے دفتر میں رہے۔شادی کے بھی پہلے چند سال وہیں تھے۔اچھے دفتروں اور افسران کے ساتھ تعینات رہے۔اور میرے سکول کے دور میں وہ خوب بااثر بھی تھے۔ریٹائرمنٹ کاغذات پر اکاؤنٹنٹ کا عہدہ درج ہے۔بعد میں دس سال تک مزید ملازمت خزانہ شوگرمل میں بطور اکاؤنٹنٹ کرتے رہے۔میری والدہ کے اصرار پر ہم بھائیوں نے انہیں مجبور کر کے گھر بٹھادیا۔عمر کے آخری سالوں میں میری والدہ کے ہمراہ 32۔گلبہار کالونی پشاور میں مقیم رہے۔

اُن کے ایک عمل نے مجھے ساری زندگی کیلئے پیسوں کا دیانتدار بنادیا۔ماں نہیں تھی اور قلم لینے کی ضرورت کی بناء پر زندگی میں پہلی مرتبہ آغاجان سے ایک آنہ مانگا۔اُنہوں نے ایک آنہ (چار پیسے کے برابر) دے دیا اور کہا کہ جاؤ لے آؤ۔اور میں نے قلم لے کر باقی کے پیسے میٹھی روئی، آئسکریم اور ٹافی پر خرچ کر دیئے۔کچھ دیر بعد آغاجان نے مجھ سے باقی پیسے واپس کرنے کو کہا اور میں ایک ایک کر کے خرچہ بتاتا رہا۔''اچھا ٹھیک ہے اور باقی کے پیسے'' حتیٰ کہ جب چوتھے پیسے کا حساب دیا۔تو انہوں نے پیسوں کی اس بلااجازت خرچ کی بناء پر مجھے مارنا شروع کر دیا۔میری استانی نے آ کر بچایا۔تب سے اب تک پیسوں کے لین دین میں میں شدید احتیاط برتتا ہوں۔

میرے والد کا کردار''پچھلی'' سیٹ پہ بیٹھے ہوئے پائلٹ کا تھا۔ اگرچہ معمول کے معاملات میری والدہ نمٹاتی تھیں لیکن جب بھی کوئی انتہائی اہم فیصلہ کرنا ہوتا وہ والد ہی کیا کرتے۔جو سب کو ماننا پڑتا۔والد محترم نے مجھے انگلینڈ جانے سے قبل دو نصیحتیں کیں ایک یہ کہ''کسی سے کوئی توقع نہ رکھو اور یوں تمہیں کبھی لوگوں سے مایوسی نہ ہوگی'' اور دوسری یہ کہ'' چھوٹی چھوٹی خواہشیں پوری ہوجانے پر خوش ہوا

کرو کیونکہ زندگی میں بڑی کامیابیاں تو کبھی کبھار ہی ملتی ہیں اور اُن کی خوشی بھی چند لمحوں کیلئے ہی ہوتی ہے''۔ میں اب سوچتا ہوں کہ جب میں میٹرک میں پاس ہوا تھا یا مجھے میڈیکل کالج میں داخلہ ملا یا ڈاکٹر بنا تو بھی چند لمحوں کیلئے ہی محسوس طریقے سے خوش ہوا ہوں گا۔ تب سے آج تک چھوٹی چھوٹی کامیابیوں یا واقعات پر بہت خوش ہوتا ہوں اور خوشی کا اظہار بھی کرتا ہوں یعنی ان لاکھوں، کروڑوں لمحات کو اگر جمع کیا جائے تو تمام تر زندگی ضرور خوش رہا ہوں گا۔ میں والد آغا جان کا یہ نسخہ صدقہ جاریہ کے طور پر ہر کسی کو بتاتا رہتا ہوں۔ والد محترم حافظ قرآن تو نہ تھے لیکن ہمیشہ نماز تراویح میں امام کے پیچھے کھڑے ہوتے اور کوئی غلطی ہو جاتی تو تصحیح کرتے۔ مثنوی مولانا روم اُن کو بہت حد تک یاد تھی اور اس کے شعر کہتے رہتے۔ میرے بھائی ڈاکٹر خالد مفتی (خان گل) نے بھی ان سے کافی اشعار یاد کیئے۔

میرے والد انتہائی سادہ مزاج اور خاکسار انسان تھے۔ اور اکثر یوں لگتا تھا کہ انہیں کچھ بھی نہیں آتا۔ میرے ماموں اکثر کہتے کہ لالا جان تو بہت ہی سادہ انسان ہیں۔ مگر درحقیقت یہ ان کی منکسر المزاجی اور تحمل کا واضح ثبوت تھا۔ وہ انتہائی خوش اخلاق تھے۔ بچوں سے محبت کرتے۔ جیب میں ہر وقت میٹھی گولیاں رکھتے اور ہر بچے کو دیتے۔ میرے بچے ان کے بہت دلدادہ تھے۔ اکثر گرمی میں ایبٹ آباد میرے گھر میں مقیم رہتے اور میرے دونوں بیٹے مسجد ہمیشہ نماز پڑھنے ان کے ساتھ جاتے۔ انھوں نے ایک کتابچہ 1984ء میں ''پانچ ستارے'' کے نام سے لکھا اور ادارہ علم وفن پشاور نے اسے 1985ء میں شائع بھی کیا۔ اس میں میرے والد پر اثر انداز ہونے والی چند تاریخی شخصیات کا بیان تھا۔ عمر کے آخری دن تک صحت مند تھے اور میری والدہ کو واک کرواکر میری بہن پینزی کے گھر پہنچے۔ جہاں اچانک بیہوش ہو کر گر گئے اور چند لمحوں میں 84 سال کی عمر میں خالق حقیقی سے جا ملے۔

میری والدہ ماہ لقاء بیگم:۔

میری والدہ محترمہ ماہ لقاء بیگم المعروف بی کوجان اکتوبر 1928ء کو میاں فضل قادر اور رقیہ بیگم کے ہاں پشاور میں پیدا ہوئیں ۔ پانچ بہن بھائیوں میں سب سے بڑی تھیں۔ان کی پیدائش کے آس پاس میاں فضل عزیز (سوتیلے بھائی) اوران کی بیگم باجی گل کے ہاں ایک بیٹی فاروق جان بعرف بوگل پیدا ہوئیں۔ جو تمام عمر میری ماں کی قریب ترین سہیلی رہیں۔ میری نانا کی وفات کے بعد گاؤں کا انتظام میاں فضل عزیز نے سنبھال لیا۔جب بی کوجان بارہ سال کی عمر کو پہنچیں توان کی بھرپور کوششوں سے گاؤں کی تقسیم اراضی ہوگئی۔میرے سگے ماموں میاں اسماعیل جان ویوسف جان نے زمینوں پر نیا گاؤں بنام'' یوسف گڑھی'' بنالیا۔ میری والدہ نے حسب دستور بھائیوں کی بہت حوصلہ افزائی اور خدمت کی۔ میری والدہ نے باقاعدہ تعلیم حاصل نہیں کی تھی۔ البتہ قرآن پاک ودیگر دینی تعلیم گھر میں ہی حاصل کی۔

15 سال کی عمر میں ان کی شادی ہوگئی۔میرے والد کی ملازمت کی وجہ سے ان کے ساتھ مالاکنڈ میں رہیں۔ پہلے دوتین بچے وہیں پیدا ہوئے۔مالاکنڈ میں صوفی عمر بخش اوران کی بیگم بی بی جان (جن کے بیٹے سعید احمد خان کے ساتھ میری خالہ نثار فاطمہ المعروف شیرین گل کی شادی ہوئی) کے ساتھ ہمارے والدین کی خاصی دوستی تھی۔ پشاور واپسی پہ محلہ اسلام سے مُتصل گنج منڈی میں میرے دادا کے چھوٹے سے مکان میں رہائش پذیر ہوگئیں۔متصل ہمسایوں میں مفتی محمود جان و پھوپھو جی (میری قرآن کی اساتذہ اور میرے ماموں زاد شہاب یوسف کی نانی) اور دوسری جانب حکیم عبدالوسع کے مکان تھے۔چھت (کوٹھے) سے تمام مکان بذریعہ دروازوں کے ملے ہوئے تھے۔یوں ان تین گھروں کے لوگوں کی "ٹریفک" ایک دوسرے کے ہاں چلتی رہتی۔اس کے علاوہ چند دیگر رشتہ داروں سے بھی پرخلوص ملاپ تھا۔

ہم سکندر پورہ کے مکان میں والدہ کے ہمراہ 1954ء تا 1975ء تک رہے اس کے بعد وہ

بمعہ فیملی 32 گل بہار پشاور منتقل ہو گئے۔

میری والدہ خاندان میں انتہائی مقبول تھیں۔لوگ ہمارے گھر کو یو این او(اقوام متحدہ) کہتے تھے۔ انتہائی مہمان نواز تھیں۔میری پھوپھی زاد بہنیں فہمیدہ جان (مرحومہ)اور سعیدہ جان اکثر یہاں مختلف کھانے اہتمام سے پکاتیں اور دیگچیوں کے مینار کی صورت سجاتیں اور ہماری والدہ بہت محظوظ ہوتیں۔بی کو جان گھر کے تمام کام جان فشانی سے کرتیں۔کپڑے سلائی کرتیں۔خود دھو کر استری کرتیں۔گندم سے نشاستہ نکالتیں۔سبزیوں کو پرو کر خشک کرتیں۔اس کے علاوہ تانگہ،گھوڑے اور کوچوان ''محمد عالم'' پر کڑی نظر رکھتیں۔ہم چھ بچوں کو نفاست سے سنبھالتیں۔تعلیم کی تحریک دیتیں۔ادب و آداب سکھاتیں۔ ہمارے دوستوں تک کا خیال رکھتیں۔ہمیں بیماری کی صورت میں مقامی ڈاکٹر، ڈسپنسری و لیڈی ریڈنگ ہسپتال تک علاج معالجے کے لئے لے جاتیں۔اپنے بہن بھائیوں کے علاوہ اپنے اور میرے والد کے تمام قریبی رشتہ داروں میں غضب کی مقبول تھیں۔میرے والد کی دیکھ بھال میں کوئی کسر نہ چھوڑتیں۔

ہماری والدہ ہمیں تمیز بھی عملی طور پر سکھاتیں۔مہمان بہت آتے تھے۔اُن کی اچھی خاصی تواضع ہوتی تھی۔ہمیں حکم تھا کہ جب مہمانوں کے سامنے چائے،کھانا لگے تو ہم نہ آئیں۔لہٰذا جب مہمان چلے جاتے تو ہم بچے کھانے پینے پر ٹوٹ پڑتے۔ایک دفعہ کھا پی کر مہمان وہیں بیٹھ گئے اور جانے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔تو میں نے جرأت کر کے اپنی ماں سے کہا کہ ماں یہ مہمان کب جائیں گے! میری ماں نے مہمانوں کو بات بتائی اور سب لوگ قہقہے مار کر ہنسے۔اسی طرح بہت ساری دیگر معاملات میں بھی تربیت ہوتی رہی۔ہم 32۔گلبہار کے گھر میں تقریباً (اکیس سال) تک رہے۔والدہ انگلینڈ میں ہم سے باقاعدہ خط و کتابت کرتیں۔اپنے پوتوں اور نواسوں تک کو یاد رکھتیں۔

ایک افغان فیملی اعظم خان و گل مکئی کو اپنے گھر میں ساری زندگی پناہ دی۔ان کے بچے ہارون و

حارث یہیں پیدا ہوئے اور پلے بڑھے۔ میرے والد کی وفات کے بعد آخر کار میری بہن پینزی کے گھر مستقل منتقل ہو گئیں۔ اور وہیں 2008ء میں اپنے خالق حقیقی سے جا ملیں۔ میری بہن نزہت نے اُن کی وفات پر ایک پرسوز نظم لکھ کر اپنے جذبات کو کچھ یوں سمیٹا ہے۔

میری پیاری ماں

ڈاکٹر نزہت مفتی

میری ماں
میری پیاری ماں
تیری عظمتوں کو سلام
تیری رفعتوں کو سلام
تو ازل سے محبت کا نشان
تو ابد تک دلوں کی مہمان
تجھ سے ہی ہے کوکب ہستی
تجھ سے آباد میرے دل کی بستی
تیرا تصور، میرا سکون
تیری محبت
تیرا پیکر
میرے دل کا بیکراں سمندر
تو رہے گی اس کے اندر
کیسے بھلا میں پاؤں
وہ تیرا مسکرانا

کیسے ادا کروں اپنا فرض
کیسے چکاؤں میں تیرے قرض
تیرے قرض ہیں ان گنت
اور میں
ایک کمزور، لاغر و ناتواں
مشکل ہے تیرا دل لبھانا
بھلا تیرے دل کی چوٹ
دیکھوں میں پلکوں کی اوٹ
تیری چوٹ کا مداوا
کیسے کر سکتی ہوں میں
تیری بے چینی
تیری کسمساہٹ
تیرا بڑھاپا
تیری جوانی کی دھندل تصویر ہے
تیری محبت کی کھوئی تعبیر ہے

وہ لوریاں سنانا
اوراس پہ گنگنانا
وہ ماضی کے دریچے
مہکتے باغیچے
قربانیاں
مہربانیاں
شاخِ گل کی طرح توٹوٹ گئی
دھیرے دھیرے ہم سے چھوٹ گئی
اب تو
سمندر کے دوسرے کنارے پر کھڑی ہے
آج تیری اولاد پر آزمائش بہت کڑی ہے
جن کی آنکھوں میں بس آنسوؤں کی لڑی ہے
میری بہن نے تجھے چاہا بہت
میرے بھائیوں نے تجھے سراہا بہت
اور میں
بدنصیب
نہ سمیٹ سکی تیرے دکھوں کو
نہ کم کرسکی تیرے غموں کو
لیکن
ایک ازلی انجانی محبت
محفل ہو کہ تنہائی
ہرتصویر میں نے مٹائی
تیرے جواں مرگ بیٹے کی جدائی
اور پھر شوہر کا وداع
اے میری ماں
پیاری ماں
تیری زندگی کیلیئے گڑگڑاتی ہوں
اس خوف سے لڑکھڑاتی ہوں
کہ اگر تو نے
کبھی زندگی میں ساتھ چھوڑ دیا
تو میں
کتنی بکھر جاؤں گی
کتنی بدل جاؤں گی
لیکن
میری ماں
پیاری ماں
میں تیری صدقے
تجھ پر قربان
مجھے یقین ہے
تو مجھے چھوڑ کر نہ جائے گی

تیری مامتا کی وہ لذت
کبھی کرتی ہے بے قرار
کبھی کرتی ہے سرشار
پھر میں ہو جاتی ہوں لاچار
جب کبھی
تو مسکراتی ہے
میرے لبوں پہ لالی آتی ہے
میری آنکھوں میں سماتی ہے
اور میں
سجدہ ریز
جذبات سے لبریز
کہ میری ماں
میری پیاری ماں
بہت مضطرب ہے
اور میں
دل گرفتہ
بہت شکستہ
دوراہے پر کھڑی ہوں
سوچوں میں پڑی ہوں

تیری شفقتوں کی روشنیاں
میری زندگی کو
روشن رکھیں گی
تیری قدموں کے نشان
تیرے ساتھ یہ کارواں
تیرا تصور اشک افشاں
مشعل راہ ہو گا
اس امید کے سہارے
دعا کرتی ہوں اے میرے رب
دکھا اپنی قدرت کے نظارے
بدل دے سوچوں کے دھارے
کاش
جتنی زندگی ہے تیری
لگ جائے رحمت کی جھڑی
ملے سکوں کی گھڑی
کہ
میری ماں
پیاری ماں
بہت مضطرب ہے


Mahliqa & Mufti Ihsanullah














۳

پیش لفظ

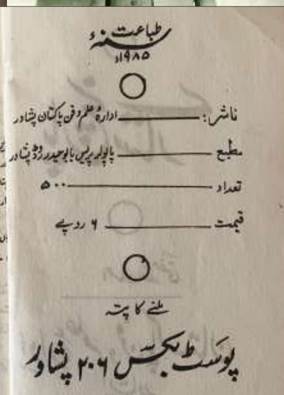
نگہ بلند، سخن دلنواز، جاں پرسوز
یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لئے (اقبال)

یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ بڑے آدمیوں کی زندگیاں آدمی کو بڑا بناتی ہیں بشرطیکہ ہم ان کے نقشِ قدم پر چلیں۔ ہمیں اپنے بزرگوں کی زندگیوں اور ان کے عظیم کارناموں کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ہم اپنے نامور مشاہیر کو رفتہ رفتہ بھلائے جا رہے ہیں۔

خاکسار نے اس چھوٹے سے کتابچے میں اس سلسلے میں مسلمان بچوں اور نوجوانوں کے لئے ایک حقیر سی کوشش کی ہے۔

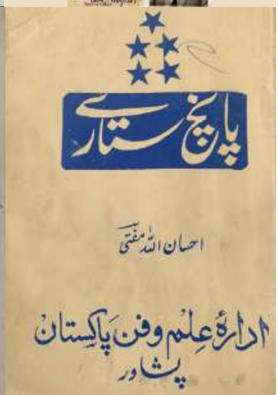
اللہ تعالیٰ ہمیں عمل کی توفیق بخشے۔

احقر احسان اللہ مفتی سرحدی
۱۹۸۳ء


طباعت سنہ ۱۹۸۵ء

ناشر: ــــــــــ ادارۂ علم وفن پاکستان پشاور
مطبع ــــــــــ پاپولر پریس بابو حیدر روڈ پشاور
تعداد ــــــــــ ۵۰۰
قیمت ــــــــــ ۶ روپے

ملنے کا پتہ
پوسٹ بکس ۲۰۶ پشاور


پانچ ستارے

احسان اللہ مفتی

ادارۂ علم وفن پاکستان
پشاور




Birth Place Gunj, Peshawar














Gentleman cadet Ahmad Zia Babar



شریک حیات و بچے

رخسانہ یاسمین مفتی:

رخسانہ میری شریک حیات ہیں ۔اپنے ماں باپ کے گھر ببلی اور سسرال میں روزی کے نام سے پکاری جاتی ہیں۔8 ستمبر 1959 کو اندرون سرکی گیٹ میں پیدا ہوئی۔مفتی نثار احمد اور ذکیہ بیگم کی تیسری اولاد اور بڑی بیٹی تھیں۔ بعد میں نئے تعمیر شدہ مکان 38۔گلبہار کالونی نمبر ا پشاور اپنے والدین کے ساتھ رہنے لگیں۔لیڈی گرفتھ سکول سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ میں جب سال 1972ء میں حج بیت اللہ سے واپس آیا اور میرے انگلینڈ جانے کا بندوبست ہوگیا تو میرے انگلینڈ جانے کے ارادے پر میری والدہ بہت اُداس تھیں۔ ان کے خیال میں بڑے بھائی کی طرح میں بھی مستقل چلا جاؤں گا اور بہت سوں کی طرح کسی گوری سے شادی کرلوں گا۔حج کی مبارکباد دینے والوں کی سلسلے میں ہمارے گھر خاندان کی بہت سی خواتین جمع تھیں۔میں نے انہیں وہی دیکھا، وہ مجھے اچھی لگیں۔اگلے دن اپنی والدہ اور خالہ سے بات کی۔میرے سسر میری والدہ کے کزن تھے۔یوں وہ میری کزن ہوئیں ۔میرا خیال تھا کہ اس فیصلے سے میری والدہ کو تسلی ملے گی کہ میں مستقل انگلینڈ میں نہیں رہوں گا۔چونکہ میری والدہ کو مکمل طور پر مجھ پر اعتماد نہ تھا۔اُنہوں نے اس موقع پر میرے ہونے والے سسر کے ساتھ بات تو طے کردی مگر ساتھ ہی کہا کہ "لڑکے کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔لہٰذا اس بات کو خفیہ رکھیں"

10 ستمبر 1973ء کو میں پی آئی اے کے ذریعے پشاور ایئر پورٹ سے براستہ راولپنڈی انگلینڈ جا رہا تھا۔میرے تمام رشتہ دار اور دوست احباب، مجھے رخصت کرنے ایئر پورٹ پر موجود تھے لوگ گلے مل رہے تھے اور روزی بھی سب کے سامنے خوب گلے ملی ۔اس بات پر جان کاری رکھنے والے لوگ یعنی میرے گھر، سسرال کے لوگ اور چند دوست بہت محظوظ ہوئے اور مجھے بھی اس کا یہ انداز بہت اچھا لگا۔

۔۔۔۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اُس وقت تک میری مانگ کو بات پکی ہونے کا علم ہی نہ تھا۔ 1975 کے آخری مہینوں میں، میں نے رخصتی کا مطالبہ کر دیا جس کو معقول بنیادوں پر رد کر دیا گیا بالآخر اس معاملے میں کامیابی 14 فروری 1977ء کو نکاح کی صورت میں حاصل ہوگئی اور 19 فروری 1977 کو رخصتی ہوئی جب کہ وہ فرنٹیئر گرلز کالج پشاور کی فرسٹ ایئر کی طالبہ تھیں۔ اسلام آباد میں اس وقت کے وفاقی سیکرٹری سیاحت حسین خان کے گھر دو دن رہائش کے دوران اُن کے بچوں سے کھیلتی رہی۔ انگلینڈ کے ویزہ کی حصولی کے لئے سفارت خانے میں جب انٹرویو کے لئے بلایا گیا تو اس نے بلا کی اہلیت اور خود اعتمادی کا مظاہرہ کیا۔ یوں بڑی آسانی کے ساتھ انہیں بھی ویزہ مل گیا اور دو، تین ہفتوں کے بعد ہم پی آئی اے کی پرواز کے ذریعہ ہیتھرو پہنچ گئے۔ جہاں سے ہم شمالی برطانیہ کے شہر سنڈر لینڈ آ گئے جہاں میں ایک ہسپتال میں تعینات تھا۔ میرے پاس اپارٹمنٹ بھی تھا اس لئے رہائش کا کوئی مسئلہ درپیش نہ ہوا۔ ہماری رہائش کے نیچے اپارٹمنٹ میں بنگلہ دیش کی ایک فیملی رہتی تھی۔ لہٰذا جلد ہی میری بیگم نے بنگالی کھانے پکا کر مجھے پیش کرنا شروع کر دیئے۔ یہ میرا پہلا انعام تھا۔ مغربی ممالک کے ماحول سے بالکل ناآشنا اور مقامی انگریزی زبان پر عبور نہ ہونے کی وجہ سے انہیں شروع شروع میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ تاہم ہسپتال میں چند نیک دل اور نوجوان خواتین رضا کار ورکرز نے انہیں روزمرہ استعمال ہونے والی گفت وشنید سے آگاہ کیا جس سے وہ آہستہ آہستہ مقامی انگریزی بولنے اور سمجھنے لگیں۔ میری پیشہ ورانہ مصروفیات کے باوجود چند ہفتے ہم خوب گھومے پھرے اور یوں لوگوں کے ساتھ معاشرتی میل جول بڑھا۔ میری بیگم کا اعتماد بھی بحال ہوگیا اور اسکے بعد وہ انگلینڈ میں قیام کے تین سالوں میں ایک بہترین معاون ثابت ہوئیں۔ اس دوران ہمارے بڑے بیٹے باسل کی پیدائش کے بعد انگلش کورس میں داخلہ بھی لیا، ڈرائیونگ ٹیسٹ پہلی ہی کوشش میں پاس کرلیا، گھر اور شاپنگ کے متعلق تمام معاملات خود انجام دیتی

رہیں۔انہوں نے وہاں کے ماحول میں خود کو بہت خوبی کے ساتھ ڈھال لیا تھا۔ہم دسمبر 1979ء میں پاکستان واپس آ گئے

ایک طرف بچے تعلیم حاصل کر رہے تھے تو دوسری جانب میری بیگم نے پہلے علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی سے ایف اے اور اس کے بعد پرائیویٹ بی اے کیا۔ دس برسوں بعد فضائیہ کالج آف ایجوکیشن پشاور سے بی ایڈ اور پھر ایم ایڈ کا امتحان پاس کرلیا۔ کچھ عرصہ رضا کارانہ ٹیچنگ بھی کی۔مگر مستقل سروس کبھی نہیں کی۔ ہمیشہ سے مذہبی رجحان کی حامل رہی ہیں۔صوم وصلوۃ کی پابند اور سچی وکھری باتیں کرنے والی۔تہجد اپنے والد (آغا) کے ساتھ پڑھنے کی عادی ہوئیں اور ابھی تک اس کی پابندی کر رہی ہیں۔ میرے ساتھ اکثر سیر وتفریح کے لئے بیرون ممالک جاتی رہیں۔امریکہ، کینڈا، یورپ وآسٹریلیا گئیں۔1988 میں جرمنی کے دوران سفر حج بیت اللہ کا موقع ملا۔اور جی بھر کے عبادت کی اس کے علاوہ سعودی عرب میری ملازمت کے دوران کئی عمرے بھی ادا کئے۔اپنے سسرال والوں کے ساتھ خوب نبھاہ کیا۔ساس اور سسر کا ہمیشہ سے ادب کیا اور بھرپور خدمت بھی کی۔ رشتہ داروں اور مہمانوں کی اچھی مہمان نوازی کرتی رہیں۔

ہماری بیٹی عائشہ کی پیدائش کے بعد کافی عرصہ کمر کے درد کی وجہ سے شدید تکلیف میں رہیں۔ اس دوران فزیوتھراپی کی اتنی ماہر ہو گئیں کہ لوگوں کو اس بارے میں گائیڈ کرتیں۔کمر کا درد 2003-04 تک رہا۔سعودی عرب میں ایم ار آئی کرنے پر ڈسک کی شدید خرابی کا پتہ چلا۔مگر ڈاکٹروں کا فیصلہ آپریشن کے حق میں نہ ہوا۔اس کے بعد سے کبھی بہتر تو کبھی بیمار بس سلسلہ چل رہا ہے۔چند سال قبل اچانک دل کی رفتار کے غیر ہموار ہونے پر کچھ ٹیسٹ کئے گئے تو پتہ چلا کہ گلے میں گلہر (Thyroid Nodule) کے اثرات ہیں۔جس کا علاج INOR ہسپتال میں ہوا۔آجکل ہڈیوں اور جوڑوں کی

تکلیف میں مبتلا رہتی ہیں۔پچھلے کچھ عرصہ سے آنکھ کے سفید موتیا (Catract) کی وجہ سے پریشان تھیں۔ اب اپریشن ہونے کے بعد بھی بہتر نہیں۔خیالات اور رویہ میں سنجیدہ اور اقدار پسندر ہی ہیں۔مضبوط ذہن کی مالک اوراپنے ارادوں کی پکی ہیں۔ میرا ساتھ گاڑی کی دو پہیوں کی طرح دے رہی ہیں۔گوکہ میرے جیسے لچکدار طبیعت والے کا ساتھ نبھانا اتنا آسان نہیں۔چھوٹے بچوں میں بہت مقبول اور پوتوں و پوتی کی جان ہیں۔باغبانی ان کی گھٹی میں پڑی ہے۔ خوداپنے ہاتھ سے پودے لگائے بغیر ان کی تسلی نہیں ہوتی۔ پھولوں کی پہچان اور نام خوب جانتی ہیں جبکہ میں اس بارے میں قطعی نہیں جانتا۔ میری بیگم کا ذکر کتاب میں ساتھ ساتھ چلتا رہے گا۔

انجینئر باسل احسان مفتی وفیملی:

باسل احسان بیس دسمبر 1977ء کو صبح سات بجے جنرل ہسپتال ہلٹن روڈ سٹروک آن ٹرینٹ انگلینڈ(Stroke on Trent, UK) میں پیدا ہوئے ا۔اتفاق سے ماہر امراض نسواں، بے ہوشی کی دوا دینے والی ڈاکٹر اور ڈیوٹی پر موجود نرس سبھی کا خاندانی نام گرانٹ تھا۔نومولود دو تین دن Incubator میں رہا۔ وارڈ میں موجود نرسنگ عملے نے اس موقع کو خوب نبھایا۔جب زچہ و بچہ کو گھر رخصت کیا جانے لگا تو سٹاف نے تصویریں بھی بنائیں جس کے بعد ہم 53 ہلٹن روڈ اپنے گھر چلے آئے۔ہمارے یہاں لوگ زچگی کے موقع پر اپنی نانی یا دادی کو بلواتے ہیں مگر ہم نے دور پردیس میں مناسب نہ سمجھا۔البتہ اہلیہ کی مدد کے لئے خاتون(Home Help) آتی رہیں۔ اس کے بعد میرے جاننے والی ایک سٹاف نرس مس فیونا چنددن ہمارے گھر رہیں۔اس طرح زچگی کے شروع کے دن آرام دہ ہوگئے۔ باسل ایک پرسکون بے بی تھا۔ہم اکثر اس کو بے بی کاٹ میں سلا کر ایک آدھ گھنٹے کے لئے باہر چلے جاتے۔ ایسے ہی ایک موقعہ پر واپس آئے تو بچہ جاگا اور رو رو کر پھر سے سو گیا

تھا۔ ہمارے دماغ بھی ٹھکانے آئے اور آئندہ ہم نے اسے کبھی اکیلا نہ چھوڑا۔ روزی جب اپنے انگلش یا آرٹ کورسز اٹینڈ کرنے جاتی تو میں اور میرا بنگالی دوست ڈاکٹر مجید، باسل کی دیکھ بھال کرتے اور نیپیاں بھی باندھتے۔ اس زمانے میں تولیہ کی نیپی ہوا کرتی تھی۔ ہر شوہر کو اپنے بچوں کو نیپی باندھنے کی لازمی ٹریننگ کرنا پڑتی تھی۔ میں نے بھی یہ کام سیکھا اور پھر اس پر عمل درآمد بھی کیا۔

ہم نے باسل کی پہلی سالگرہ دھوم دھام سے منائی۔ قریب و دور سے لوگ آئے۔ میرے ایک جین مت سے تعلق رکھنے والے ڈاکٹر کی دو سالہ بیٹی باسل کی پہلی دوست بنی۔ دونوں ایک دوسرے سے خاصے مانوس بھی تھے اور ہم محظوظ ہوا کرتے۔ جب ہم نے کسی فنکشن پر جانا ہوتا تو باسل کو بے بی سٹر (Baby Sitter) نینی کے ہاں چھوڑ جاتے جہاں وہ دیگر بچوں کے ساتھ پبلک لان میں کھیلتا۔ وہاں بڑے سائز کا ایک السیشن (German Shepard) کتا بچوں کے اردگرد دائرے میں حفاظت کے لئے گھومتا۔ اور بچوں کو حفاظتی دائرے سے باہر نکلنے نہ دیتا۔ ایک مرتبہ ہم باسل کو لینے کچھ لیٹ پہنچے۔ دیکھا تو وہ نینی کے گھر لاؤنج میں اپنا ہاتھ بے فکری سے کتے کے منہ کے اندر دیئے کھڑا تھا۔ ہم گھبرائے تو بہت۔ مگر نہ کتے نے منہ بند کیا اور نہ ہی نینی نے باسل کا ہاتھ اس کے منہ سے نکالا۔ پاکستان واپس آنے کے بعد باسل تمام قریبی رشتہ داروں کی توجہ کا مرکز رہا۔ خاص کر اپنی نانی نانا کے گھر میں اسے بہت پیار ملتا۔ پشاور میں ہی ایک پلے سکول میں داخل ہوا۔ وہاں ایک بچے جہانگیر سے اس کی نہ بنی اور یوں وہ سکول میں ایڈجسٹ نہ ہو پایا۔ ایبٹ آباد شفٹ ہونے کے بعد ایک مقامی مگر اچھی نرسری میں سال بھر داخلے کے بعد آرمی برن ہال سکول میں داخل ہو گیا اور وہیں سے ایف ایس سی پری انجینئرنگ اور یونیورسٹی آف انجینئرنگ پشاور کے شعبہ مکینکل سے انجینئرنگ کی۔ آخری تعلیمی سال میں ہسپتال کے عام بیڈ کو آٹومیٹک طریقے پر تبدیل کرنے کے عملی پراجیکٹ میں پہلی پوزیشن حاصل کی۔ جس

کی بنیاد پر اسے دی برمنگھم یونیورسٹی کے شعبہ میکاٹرنک کے ماسٹر پروگرام میں انجینئرنگ ڈگری کے اعلان سے پہلے ہی داخلہ کی پیش کش ہوگئی اور یوں وہ انگلینڈ چلا گیا۔ یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔ ماسٹرز کے ساتھ ساتھ نوکری بھی کرتا رہا۔اور آخرکار جتنے پیسے مجھ سے انگلینڈ جانے سے پہلے لئے تھے وہ تمام واپس کردیئے۔ ماسٹرز کرلیا۔سپروائیزر نے پی ایچ ڈی کرنے کو کہا میں نے بھی اصرار کیا لیکن وہ پاکستان واپس لوٹ آیا جہاں اسے نادرا میں ملازمت مل گئی اور یوں کچھ عرصہ نادرا میں رہا پھر ایک ملٹی نیشنل کمپنی جوائن کر لی۔اسی دوران اس کی شادی میجر میاں محمد عالم اور ڈاکٹر شاہین کی بیٹی ڈاکٹر سبین سے ہوگئی۔ دونوں کی جوڑی جہلم میں رہنے لگی۔ محمد ان کا بڑا بیٹا 28 جنوری 2006 کو ایبٹ آباد ڈاکٹر رقیہ کے کلینک میں شام پانچ بجے پیدا ہوا۔خوشی کا کیا سماء تھا۔سبین کچھ عرصہ ہمارے پاس 77۔ جناح آباد میں رہنے کے بعد خوش وخرام واپس جہلم لوٹ گئی۔ ہم بھی ایک دو بار جہلم ان کے پاس جا کر رہے۔ خوب سیر سپاٹے کئے۔ سبین اور روزی کی بھی خوب بنی۔ چند سال پی ٹی سی میں رہ کر باسل لاہور عبدالرحمان باٹلر کے کوکا کولا فرنچائز چلا گیا۔ یوں وہ لاہور عسکری۔ 10 میں رہنے لگے۔ ہم بھی انکے ہاں گئے اور رہے۔ باسل بعد میں بیوی بچوں کو لے کر مستقل انگلینڈ شفٹ ہو گیا۔ جہاں اس نے ایم بی اے کیا۔ پھر چند سال پہلے جیگوار اور لینڈ روور کمپنی میں الیکٹرک گاڑی کے پراجیکٹ میں مینجر کی پوسٹ پر تعینات رہا۔کورونا وباء کے دوران ڈاؤن سائزنگ کا شکار ہونے سے بچ گیا اور آجکل بھی وہیں برسرروزگار ہے۔ گپ شپ لگانے، کھانے پینے اور دوستوں سے ملنے ملانے کا شوقین ہے۔ جہان تک سبین کا تعلق ہے تو اس نے فرنٹئیر میڈیکل کالج سے ایم بی بی ایس اور ایوب میڈیکل کالج ایبٹ آباد سے ہاؤس جاب کیا۔ چار بہن بھائیوں میں سے سب سے بڑی اور میرے سٹوڈنٹ و ہاؤس آفیسر ڈاکٹر بلال جو آجکل امریکہ میں بطور کنسلٹنٹ کارڈیالوجی خدمات انجام دے رہے ہیں کی بہن ہیں۔ سبین ایک اچھی بیوی

اور ماں ثابت ہوئی۔

دس سال اپنے بچوں کو بڑا کرنے کے بعد جنرل پریکٹس کی ٹریننگ مکمل کرنے کے بعد پریکٹس کر رہی ہے۔ میرے اور خان گل کے ساتھ مل کر بہت خوش ہوتی ہے۔ ہم میاں بیوی تقریباً ہر سال ان کے پاس جا کر ایک ماہ رہتے ہیں جس پر وہ بہت خوش دلی کا مظاہرہ کرتی ہے۔ محمد کے بعد دو جڑواں بچے معید و عماد بھی ایبٹ آباد میں ڈاکٹر رقیہ کے کلینک میں پیدا ہوئے۔ یہ تینوں بچے ہم سب کی جان ہیں۔ وقت کے ساتھ بڑے ہوتے گئے اور اب انگلینڈ میں سکولوں میں پڑھ رہے ہیں۔ دادی کے ساتھ بڑے مانوس ہیں۔ تقریبا دو تین مرتبہ ہفتے میں بات چیت ہو جاتی ہے اور گرینڈ ماں واٹس ایپ گروپ میں بھی ہیں۔

سعد احسان مفتی و فیملی:

سعد 30 مئی 1980 بروز جمعہ دن بارہ بجے ڈاکٹر جوہر خاتون و ڈاکٹر شفیق احمد کے کلینک واقع یونیورسٹی ٹاؤن پشاور میں پیدا ہوا۔ ان دنوں ہم 32۔گلبہار کالونی والدین کے ہمراہ رہائش پذیر تھے۔ بعد میں خیبر روڈ والے اپارٹمنٹ میں شفٹ ہو گئے۔ سعد بچپن کے دنوں میں صحت کے مسائل کا شکار رہا۔ لگا تار روتا جس کی ہمیں سمجھ نہ آتی۔ اکثر فوزی خالہ اسے سنبھالتی بہت بعد میں پتہ چلا کہ یہ سب سانس کی تنگی کی وجہ سے تھا۔ سعد کو جب ایبٹ آباد شفٹ کیا تو کچھ بہتری آئی۔ شروع کے دو سال انٹرنیشنل سکول میں گزارے۔ بعد میں آرمی برن ہال سکول میں باسل کے ساتھ جا ملا۔ چوتھے پانچویں گریڈ میں ٹانسل اور Adenoid کے اپریشن کے بعد اس کی صحت ٹھیک ہوگئی۔ سینئر برن ہال میں میرے دوست نجم الہادی کے بیٹے زکریا سے بڑی دوستی تھی۔ بڑوں کے سامنے خاموش مگر بچوں میں بہت مقبول تھا۔ سکول کے زمانے میں انگریزی کی ایک آدھ نظم "I Saw a Rat" بھی لکھی۔ باسل کے

مقابلے میں بہت حساس واقع ہوا تھا۔میٹرک وایف ایس سی کے امتحانوں میں دوسری یا تیسری پوزیشن لی۔ایوب میڈیکل کالج سے ایم بی بی ایس کیا۔2005 کے زلزلے میں متاثرین کی بہت خدمت کی۔ سرجری کے چھوٹے موٹے آپریشن بھی کرتا۔بالاکوٹ میں چند ہفتے غیر سرکاری تنظیم ہورائزن کے زیر اہتمام زلزلہ متاثرین کے لئے دماغی صحت کے حوالے سے رضا کارانہ خدمات انجام دیں۔سعد کی پہلی منگنی دھوم دھام سے ہوئی لیکن شادی کے قریب بعض اختلافات کے نتیجے میں رشتہ ختم ہوگیا۔تاہم اپریل 2009 میں عائشہ الطاف سے شادی ہوئی۔ان کے والد انجنیئر الطاف ایک لمبا عرصہ سعودی عرب میں ملازمت کرنے کے بعد واپس پشاور آگئے تھے۔عائشہ نے انجینئرنگ کی ساتھ ایم بی اے کیا ہوا تھا۔ان کے ہاں بیٹی لائبہ 7 2 اکتوبر 2011 کو آر ایم آئی ہسپتال میں صبح سات بجے پیدا ہوئی۔سعد بمعہ فیملی چار سال دبئی میں رہے اور مئی 2020 میں وطن واپس آگئے۔جب لاہور ائیر پورٹ پہنچے تو وہاں اس کا کورونا ٹیسٹ پازیٹو آگیا جس کے بعد ایبٹ آباد میں کورنٹائن ہوگئے۔دو ہفتوں کے بعد جب دوبارہ ٹیسٹ ہوئے تو لائبہ کا ٹیسٹ پازیٹو آگیا ۔کافی بیمار رہی لیکن پھر اللہ کے فضل سے ٹھیک ہوگئی۔

سعد ایک انتہائی اچھا ہنر منداور ذہین ڈاکٹر ہے۔جس کی تشخیص اور علاج میں پختگی ہے۔آج کل ایوب میڈیکل کالج ایبٹ آباد کی فارماکالوجی کی فیکلٹی میں شامل ہے۔اور ایبٹ آباد میں مستقل رہائش کی کوشش کررہا ہے۔

عائشہ سبین مفتی اور فیملی:

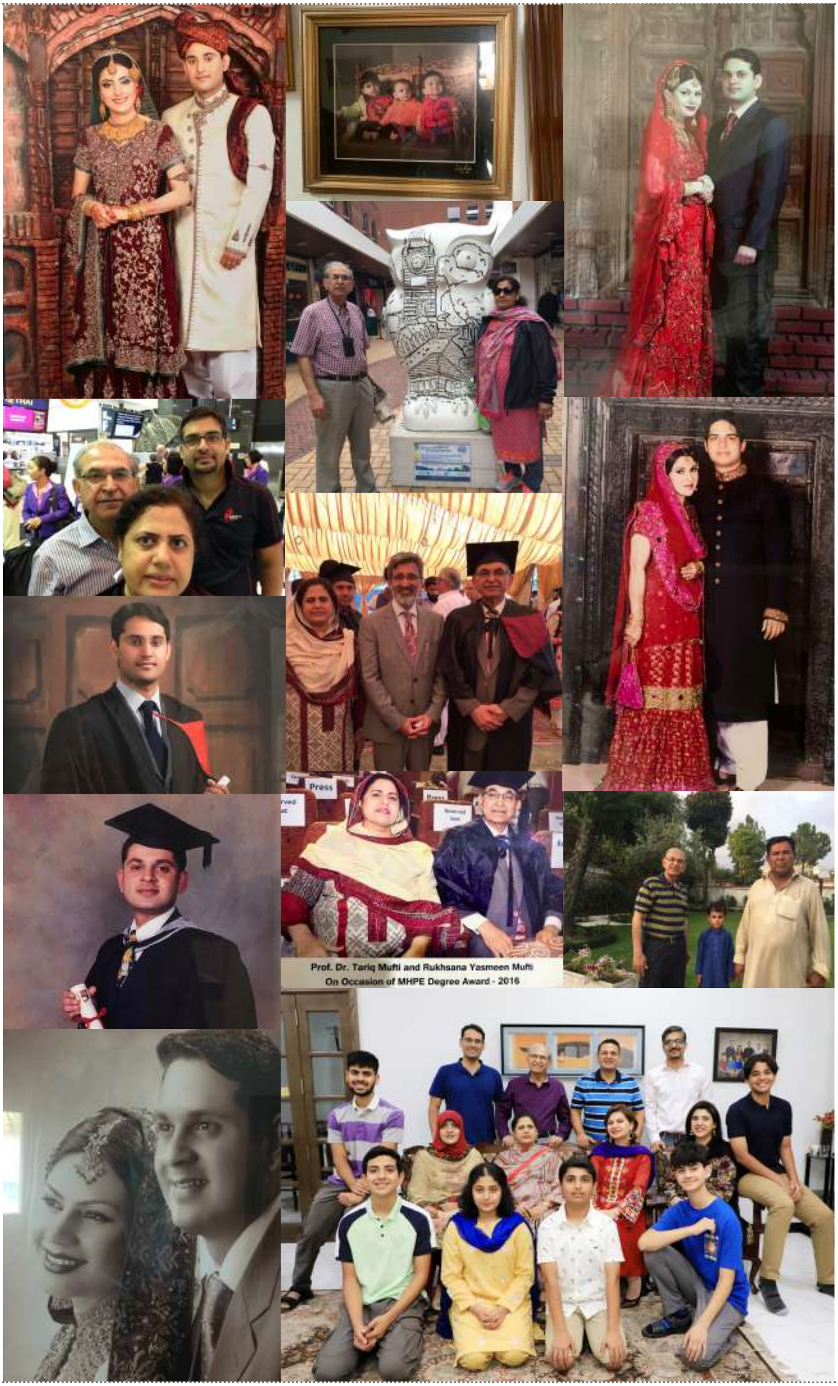
عائشہ المعروف عاشی 23 دسمبر 1982 رات دس بجے ایبٹ آباد ڈی ایچ کیو ہسپتال میں پیدا ہوئی۔عابدہ واجد میری بیگم کے پاس رہیں اور اسی نے گھٹی بھی پلائی۔ہم نے پشاور سے کسی کو نہ بلایا۔ نام میرے والد (آغاجان) نے رکھا۔جب دو، اڑھائی سال کی تھی تو میرے گھر لوٹنے پر کار پورچ

میں میری منتظر تھی کہ میں اسے پیار دوں اس کے میرے انتظار میں کھڑے ہونے کا وہ لمحہ آج بھی دل و دماغ میں محفوظ ہے۔اس سے یہ اندازہ بھی لگایا جاسکتا ہے کہ بیٹیوں کے دل میں کتنا پیار ہوتا ہے۔"سیز ر"نام کے چھوٹے کتے سے بہت ڈرتی تھی۔بچپن میں بھائیوں کی وجہ سے مردانہ الفاظ میں کہتی "میں آتا ہوں"،"میں جاتا ہوں"،"میں اٹھتا ہوں"،"میں بیٹھتا ہوں"۔سب فیملی کی لاڈلی تھی۔اپنی فوزی خالہ سے بہت زیادہ مانوس تھی۔کبھی کبھی میں اسے سکول چھوڑنے گاڑی میں خود لے جاتا۔اس دوران میں کبھی گانے گنگناتا اور کبھی شعر کہتا۔جس سے یہ بڑی محظوظ ہوتی۔ میٹرک وایف ایس سی برن ہال سکول و کالج سے کیا۔کچھ عرصہ ایم بی بی ایس سال اول ایوب میڈیکل کالج میں پڑھی۔ بچپن سے ہی اس کو پینٹنگ کا شوق تھااوراس نے کوچنگ کلاسز ایک معروف آرٹسٹ جو ہمارے گھر سے کچھ دور رہتی تھی سے لیں۔نیشنل اکیڈمی آف آرٹس لاہور جانا چاہتی تھی۔مگر ہم اسے اکیلا لاہور نہیں چھوڑ سکتے تھے۔بعد میں اسے بی ڈی ایس میں داخلہ ایوب میڈیکل کالج میں ہی مل گیا۔چار سال اس نے بہت اچھے گزارے۔تین چار سہیلیوں کا ٹولہ تھا۔جو اکثر ہمارے گھر بھی آیا کرتی تھیں۔سال اول میں گولڈ میڈل بھی لیا۔اگلی کلاسوں میں دوسرے یا تیسرے نمبر پر آتی رہی۔بی ڈی ایس اس نے ہزارہ یونیورسٹی سے کیا۔ شادی ملٹی نیشنل کمپنی آئی سی آئی میں تعینات انجینئر عمران علی سے ہوئی۔ وہ غلام اسحاق خان انسٹی ٹیوٹ کے گریجویٹ تھے۔عمران کے والد مظفر صاحب ایک جانے پہچانے میڈیکل پریکٹیشنراورمعزز خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔عمران کی والدہ شیرین گل کا تعلق پشاور سے ہے اور وہ ایک خوش اخلاق،سمجھ دار، پڑھی لکھی خاتون،اور ریٹائرڈ پرنسپل گورنمنٹ ہائی سکول رہی ہیں۔ شادی کے بعد عمران و عائشہ کھیوڑہ منتقل ہوگئے۔ ہم بھی ایک مرتبہ گئے۔آئی سی آئی فیکٹری کے بازو میں واقع نمک کی مشہور کان دیکھی۔پاک وہند کی تقسیم کے وقت ایک معاہدے کے تحت نمک کی تاعمر بھارت کو پرانے ریٹ پر ترسیل

ہوتی ہے جسے وہ کئی گنا زیادہ قیمت پر ہمالین سالٹ کی پیکنگ میں دنیا بھر میں ایکسپورٹ کرتا ہے۔کان کے اندر ریل کا ٹریک بنا ہوا تھا اور بہت بڑی بڑی ہال نما غار تھی جو نمک کی مختلف اشکال سے مزین تھی اور روشنیوں کی وجہ سے چمک رہی تھی۔ سیاحوں کے لئے مختلف سٹال اور کیفے بنے ہوئے تھے۔ہم نے بھی کچھ تحائف خریدے۔ بیٹی عائشہ کے ہاں پہلا بیٹا حمزہ ڈاکٹر رقیہ کے کلینک ایبٹ آباد میں پیدا ہوا۔ زچگی میں عائشہ شدید بیمار ہوگئی تھیں لیکن شکر کہ سب خیریت ہوگئی۔ دوسرے بیٹے ابراہیم کی پیدائش لاہور میں ہوئی۔ اس دوران عائشہ نے ایم سی پی ایس ٹریننگ ڈینٹیسٹر لاہور میڈیکل اور ڈینٹل کالج میں داخلہ لے لیا۔اپنے شعبے میں بہت اچھا کام کیا۔اور ایک ریسرچ مضمون بھی انٹرنیشل ریسرچ جرنل میں شائع ہوا۔بعد میں آسٹریلیا جانے کی وجہ سے یہ کورس نامکمل رہ گیا۔

کچھ عرصہ بعد عمران کی پوسٹنگ شیخوپورہ کی فیکٹری میں ہوگئی۔تو یہ لوگ لاہور میں عسکری۔10 اسی گھر میں شفٹ ہو گئے۔جس میں پہلے باسل اور سبین لوگ رہتے تھے۔دو چار سال گزرنے کے بعد اپنے دونوں بچوں حمزہ اور ابراہیم کے ہمراہ آسٹریلیا شفٹ ہو گئے۔آسٹریلیا میں پہلے دو سال تسمانیہ کے شہر Lauceston میں رہے۔سڈنی واٹرز میں مستقل ملازمت کی وجہ سے عمران کو بمعہ فیملی شفٹ ہونا پڑا۔۔حمزہ بڑا بیٹا ہے اور کرکٹ کھیلنے کا شوقین ہے۔ابراہیم گٹار سیکھ رہا ہے۔عمران سے قربت تب ہوئی جب ہم 2016 میں ان کے پاس تسمانیہ سات ہفتے رہے۔پاکستان سے ہی میری صحت کچھ اچھی نہ تھی۔ہم جب وہاں پہنچے تو عمران اور عائشہ دونوں نے بہت خیال رکھا،ہمیں تسمانیہ،ملبورن اور سڈنی کی سیر کرائی۔عمران نے بہت منظم طریقے سے ورزش کروانا شروع کی جس سے بہت افاقہ ہوا۔ہماری ایک مشترک عادت کتابیں پڑھنا بھی ہے مختلف موضوعات زیر بحث رہتے ہیں۔نہ صرف چلنے پھرنے بلکہ دوڑنے لگا۔عمران ایک مستقل مزاج، بردبار اور امن پسند شخص ہے۔اپنے گھر اور بچوں میں خصوصی دلچسپی رکھتا ہے۔عائشہ اور عمران دونوں نہایت معاملہ فہم جوڑی ہیں اور خوشحال زندگی بسر کرتے رہے۔

حال ہی میں وہ پاکستان واپس لوٹ آئے ہیں اور اسلام آباد میں رہائش پذیر ہیں۔


Prof. Dr. Tariq Mufti and Rukhsana Yasmeen Mufti
On Occasion of MHPE Degree Award - 2016


HAPPY BIRTHDAY
GLOW PAK

میرے بہن بھائی

ڈاکٹر خالد عطاء اللہ مفتی اوران کی فیملی:۔

خالد عطاء اللہ مفتی المعروف خان گل میرے سب سے بڑے بھائی اور پیدائش میں ہماری بڑی بہن شہناز (مرحومہ) سے سال ڈیڑھ سال چھوٹے تھے۔ 1944ء میں پیدا ہوئے۔انہیں بچپن ہی سے ہماری خالہ جانی جوغیر شادی شدہ تھیں نے پالا پوسا۔لہٰذا یہ اکثر ہم سے الگ ہماری نانی کے گھر واقع محلہ عطائی خان، ہشتنگری پشاور میں رہتے تھے۔میرے ماموں کی نگہداشت اور پرورش کا سایہ ان پر تھا۔اس وجہ سے یہ ہم سے کچھ مختلف تھے۔بعد میں میری والدہ نے انہیں پرائمری سکول مچھی ہٹہ،کریم پورہ میں داخل کروا دیا۔انہوں نے میٹرک کا امتحان گورنمنٹ ہائی سکول نمبر ا پشاور سے 1959ء میں پاس کیا۔ سکول میں بزم ادب کے سیکریٹری بھی رہے۔جب میں بہت چھوٹا تھا تو رات کو نانی کے گھر خان گل مجھے سلانے سے پہلے شیر کی کہانی سنایا کرتے تھے۔سکول کے زمانے میں وہ ریڈیو پاکستان پشاور سے بچوں کے پروگرام"گھومتے خان پھرتے خان" میں مشہور ٹی وی کردار اطہر شاہ خان (جیدی مرحوم) کے ہمراہ حصہ لیتے رہے۔گورنمنٹ ہائی سکول کے زمانے میں انہوں نے ڈرامہ "ہوش میں آ انسان" میں اہم کردار ادا کیا۔ سکول میں اُن کے کلاس فیلوز سعید خان جو بعد میں آئی جی پولیس صوبہ سرحد اور سندھ بنے، ان کے علاوہ بشیر بلور (مرحوم) جوسینئیر صوبائی وزیر بنے، اور رستم شاہ مہمند جو افغانستان میں پاکستان کے سفیر اور چیف سیکرٹری خیبر پختون خوا رہے۔ان کے علاوہ بھی ان کے کئی کلاس فیلو اعلیٰ عہدوں پہ فائز رہے۔

میٹرک کرنے کے بعد انہوں نے ایف ایس سی کا پہلا سال ایڈورڈز کالج پشاور سے اور سال دوئم گورنمنٹ کالج پشاور سے کیا۔ انہیں ایف ایس سی کے بعد میڈیکل کالج کا داخلہ جامشورو میڈیکل کالج، حیدر آباد میں ملا لیکن گھر والوں نے حیدر آباد جانے نہ دیا اور یوں انہوں نے بی ایس سی کرنے کے بعد 1969ء میں خیبر میڈیکل کالج سے ایم بی بی ایس کا امتحان پاس کیا۔میڈیکل کالج میں وہ مجھ سے دو سال سنیئر تھے۔

میڈیکل کالج کی تعلیم کے دوران سال سوئم سے ہی ان کا رجحان سائیکاٹری کی طرف ہو گیا تھا۔ اور وہ ڈاکٹر شفیق جو پشاور میں واحد سائیکاٹرسٹ تھے کے کلینک واقع فقیر آباد، زریاب کالونی آنے جانے لگے۔ایک موقع پہ مجھے بھی ساتھ لے کر گئے تھے۔ میڈیکل کالج میں ان کے خاص دوست شفیع (چچا جان) تھے۔اُن کے پاس ایک کالے رنگ کا موٹر سائیکل ہوتا تھا۔ اکثر ہمارے سکندر پورہ والے گھر آتے اور کئی دفعہ رہتے بھی تھے۔ شفیع اور خالد موٹر سائیکل پر اکھٹے گھومتے، دونوں موٹر سائیکل پر راولپنڈی تک بھی جاتے۔ یہ بات مجھے یوں معلوم ہوئی کہ میری خالہ جانی کی وفات کے دن بھی دونوں موٹر سائیکل پر گھومنے پھرنے پنڈی گئے ہوئے تھے اور زرا دیر سے واپس لوٹے۔

1968-69ء میں میڈیکل کالج تعلیم کے آخری سال میں میرے بھائی ڈاکٹر خالد اور شفیع نے ہمارے فقیر آباد والے گھر کے گیراج (جو ہمارے ٹانگے اور گھوڑے فروخت ہو جانے کی وجہ سے خالی پڑا تھا) میں کلینک کرنا شروع کر دیا جس میں ہم دیگر دو بھائی خالد سعید اور میں ان کی مدد کیا کرتے تھے۔اُس زمانے میں کئی میڈیکل سٹوڈنٹس آخری سال میں میڈیکل پریکٹس شروع کر دیتے تھے۔اس بات سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ہماری تعلیم کتنی پریکٹیکل تھی اور ہم کتنے پُراعتماد ہوا کرتے تھے۔غالباً بھائی نے ہاؤس جاب کے بعد بھی کچھ عرصہ شیخ آباد بازار بیرون لاہوری گیٹ میں اپنے دوست منیر کے ہمراہ ایک دکان کرائے پہ لے کر کلینک کھولا۔ یہ کتنا عرصہ چلا اب یاد نہیں۔

1971-72ء کے آخر میں وہ انگلینڈ چلے گئے۔ انگلینڈ سے انہوں نے میرے لئے سائیکاٹری یعنی شعبہ نفسیات کی تفصیلات بھجوائیں۔اس کا ذکر اس کتاب میں کہیں اور بھی درج ہے۔اپنی تمام ملازمت اور ٹریننگ کے دوران ناٹنگھم میں رہے اور وہیں سے سپیشلائزیشن کے امتحانات یعنی ایم آر سی سائیکاٹری اور ڈپلومہ کیا۔ ان کے پروفیسر جان کوپر (Prof. John Cooper) بہت مشہور سائیکاٹرسٹ تھے۔خالد مفتی میرے ساتھ انگلینڈ میں مسلسل رابطہ میں رہتے۔کئی دفعہ ہفتہ وار چھٹیوں کے

دوران میں ان کے پاس اور وہ میرے پاس سندر لینڈ آیا جایا کرتے تھے ۔ جب انہوں نے پوسٹ گریجویشن ڈگری حاصل کر لی تو وہ اوران کے دوست ماہر امراض جلد ڈاکٹر رضا محمد خان نوکری کے سلسلے میں لیبیا چلے گئے ۔ جہاں وہ تقریباً ایک سال رہے اور پھر پاکستان واپس لوٹ آئے ۔ پاکستان آکر خالد مفتی کو بہت مشکل حالات میں پرائیویٹ پریکٹس شروع کرنا پڑی ۔ کچھ عرصے بعد ان کو ڈسٹرکٹ سپشلسٹ کی پوزیشن مل گئی ۔ جو بعد میں سپشلسٹ سائیکاٹریسٹ لیڈی ریڈنگ ہسپتال میں تبدیل ہوگئی ۔ کئی سال اس تگ ودو میں گزارے کہ خیبر میڈیکل کالج کے اسسٹنٹ پروفیسر بن جائیں ۔ آسامی نہ ہونے کی وجہ سے اسسٹنٹ پروفیسر نہیں بن سکتے تھے ۔ اس عرصہ میں اُنہوں نے اپنے تشخص کو برقرار رکھا اور معاشرے میں نفسیات کے حوالے سے اپنی بہترین خدمات مہیا کیں ۔ اُنہوں نے گرین دسمبر نامی غیر سرکاری تنظیم کی بنیاد رکھی ۔ جس میں مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے شامل تھے ۔ اور جلد ہی گرین دسمبر مومنٹ مقبول ہوگئی ۔

1987ء میں ناموافق حالات کی بناء پر انہوں نے گرین دسمبر موومنٹ کو ختم کر کے ہورائزن (Horizon) کے نام سے نئی این جی او بنالی جو اپنے فلاحی کاموں کی بدولت آج بھی بہت مقبول ہے اور معاشرے میں سائیکاٹری اور مینٹل ہیلتھ کے حوالے سے بڑا اہم کردار ادا کر رہی ہے ۔ خالد مفتی اسسٹنٹ پروفیسر سائیکاٹری بنے اور ترقی کرتے کرتے پروفیسر اور ہیڈ آف ڈیپارٹمنٹ سائیکاٹری ہوئے اور پرنسپل خیبر میڈیکل کالج کے عہدے پر خدمات انجام دینے کے بعد 2004ء میں ریٹائر ہوگئے ۔ اپنے ایک سالہ دور میں انہوں نے خیبر میڈیکل کی پچاسویں سالگرہ شاندار طور پر منعقد کروائی جس میں اس وقت کے صدر پاکستان جنرل پرویز مشرف نے بطور مہمان خصوصی شرکت کی ۔ ریٹائرمنٹ کے بعد بھی خالد مفتی اُسی شدومد سے برسرپیکار رہیں ۔ انہوں نے سائیکاٹری پاکستان کے حوالے قومی وبین الاقوامی سطح پر نمایاں خدمات انجام دیں ۔ عبادت ہسپتال کے نام سے ایک مینٹل ہیلتھ کا ہسپتال نشتر آباد پشاور میں

شروع کیا۔ ہسپتال کے اوپر والی منزل میں حق بابا آڈیٹوریم بیاد سید مستان شاہ بنوایا۔ جہاں سائیکاٹری کے علاوہ دیگر ادبی محافل منعقد ہوتی ہیں۔ خان گل کی شادی اپنی ماموں زاد فرح عظمیٰ سے ہوئی۔ جو بہت پرخلوص و پرعزم خاتون ہیں۔ خاندان میں بہت مقبول ہیں۔ بیٹا ڈاکٹر علی احسان مفتی بھی عبادت ہسپتال کے سائیکاٹرسٹ ہیں۔ انٹرنیشنل سائیکاٹری سوسائٹی میں خاصے مقبول ہیں۔ جہاں وہ کئی پروگرام منعقد کرواتے ہیں وہ اپنی بیگم حناء اور بچوں مہک، علینہ و علیار کے ہمراہ پشاور میں رہتے ہیں۔ دوسرا بیٹا حماد یونی ورسٹی آف انجینئرنگ سے سافٹ وئیر انجینئرنگ کر کے امریکہ میں مقیم ہے۔ بیٹی مریم سحر مفتی نے بی ڈی ایس کیا اور ٹورنٹو (کینیڈا) میں مقیم رہیں جبکہ آج کل اپنی بیٹی زینب کے ہمراہ پاکستان واپس آ گئی ہیں۔

خالد سعید مفتی اور ان کی فیملی:۔

خالد سعید مفتی المعروف گل آغا 6 اپریل 1946ء کو پشاور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گنج منڈی پرائمری سکول اور میٹرک گورنمنٹ ہائی سکول نمبر ا سے 1962ء میں اور بی اے گورنمنٹ کالج پشاور سے کیا۔ انہیں ناول پڑھنے اور میوزک کا شوق تھا۔ سعد الہادی جواب ریٹائرڈ بریگیڈئیر ہیں سے بینجو سیکھتے۔ گانوں کی کیسٹس کا زخیرہ رکھتے اور کسینو ریسٹورنٹ خیبر بازار پشاور میں گراموفون پر دوستوں کے ہمراہ گانے و گیت سننے جاتے۔ ہمارے بہت سے دوست اور محافل مشترک ہوا کرتی تھیں۔ وہ تمام عمر ATCO فارما سے منسلک رہے اور عمر کے آخری چند سال لاہور میں زونل ہیڈ تعینات رہے۔ اپنے شعبہ میں انتہائی مخلص، ایماندار، مقبول اور قابل قدر مانے جاتے تھے ان کے دوستوں کی کثیر تعداد آج بھی ان کی یادیں تازہ کرتی رہتی ہے۔

یہ امر بھی باعث دل چسپی ہے کہ ان کی بارات مجھ سے ایک دن پہلے اور ولیمہ میرے ساتھ اکھٹے 19 فروری 1977ء کو ہوا۔ اپنی بیگم نسرین کے ساتھ گلبہار پشاور میں والدین کے قریب ہی رہتے

تھے۔3دسمبر 1991ء کو ملتان سے واپس اپنے گھر لاہور پہنچے،شدید قسم کا ہارٹ اٹیک ہوااور آناً فاناً خالق حقیقی سے جا ملے۔ان کی میت کو ہمارے ایک دوست کرنل نجم الہادی جو اس وقت لاہور میں متعین تھے نے پشاور روانہ کیا۔راستے میں میرے برادر نسبتی کرنل احمد ضیاء بابر جو اُس وقت گوجرانوالہ میں تعینات تھے اور میری بہن روحی میت کے ہمراہ پشاور آئے۔میرے والدین کیلئے اور ہمارے تمام فیملی کے لئے یہ بہت ہی شدید صدمہ تھا۔میں اس وقت ملک میں موجود نہیں تھا اور گیارہ دن کے بعد پہنچا چونکہ میں نے ان کی تدفین نہیں دیکھی تھی۔بہت عرصے تک مجھے ان کے انتقال کا یقین نہیں آتا تھا۔

ہماری بھابی نسرین نے شوہر کے انتقال کے بعد بہت محنت سے بچے پالے وہ بھی 2018ء میں وفات پا گئیں۔ ان کی دو بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔بڑے بیٹے قمر سعید بی اے پاس کرنے کے بعد آج کل ڈرائی پورٹ پر اپنا بزنس کرتے ہیں۔قمر سعید کی شادی شائستہ سے ہوئی۔ان کا ایک بیٹا معیز اور ایک بیٹی ذوحہ ہیں۔خالد سعید کا چھوٹا بیٹا جنید ماسٹرز کر کے آج کل بی آر ٹی میں مینجر کے طور خدمات انجام دے رہا ہے۔اُس کی شادی چارسدہ کی ایک فیملی میں رابعہ سے ہوئی جس سے ایک بیٹا حسن اور دوسرا ابرہیم ہے۔بڑی بیٹی کرن اپنے شوہر فیصل خان کے ہمراہ کینیڈا میں آباد ہے جس کے تین بچے محمد،عمر۔۔۔ہیں۔ چھوٹی بیٹی ثانیہ اپنے میاں رضوان اور بچوں اضلان،مناہل اور ہادی کے ساتھ پشاور میں مقیم ہیں۔

خالد سعید مفتی شروع سے ہی ایک انتہائی ملنسار،ہنس مکھ اور انسان دوست شخصیت تھے۔اپنے رشتہ داروں اور دوست احباب کی خدمت بدرجہ اُتم کرتے تھے۔شادیوں میں اکثر کھانے کی نگہداشت کرتے، چاول کی دیگ پر بیٹھنا اُن کا معمول تھا۔اسی طرح کسی کی بھی تجہیز اور تکفین کے موقع پر بھی آگے رہتے۔سکول اور کالج کے زمانے میں بہت اچھے کھلاڑی تھے اور کراس کنٹری یعنی 17 کلومیٹر کی دوڑ میں حصہ لیتے۔اُن کے ساتھ بہت سی یادیں وابستہ ہیں۔جب ہم چھوٹے تھے تو ہماری والدہ اگر گھر میں نہ ہوتیں تو سعید گل ہانڈی بھی پکا لیتے تھے جبکہ ہم برتن دھوتے۔ایک دفعہ گوبھی پکانے کیلئے سالن بنانے کا

فارمولا اختیار کیا اور اُس میں پانی ڈال دیا اور آخر میں بند گوبھی کی بجائے مسور کی دال کی پتلی بن گئی۔ چونکہ گوبھی کے پکانے میں پانی نہیں ڈالنا ہوتا۔ اس بات کی یاد پر میری والدہ اور ہم بہت محظوظ ہوئے۔ سعید گل کی یادیں خاندان کے ہر فرد کے دل و دماغ میں رہتی ہیں۔ میری بہن روحی نے اُن کی وفات کے بعد ایک بہت ہی پر اثر نظم لکھی۔ جنہیں وہ اب بھی پڑھ کر سناتی رہتی ہیں۔ یہ نظم کالج میگزین میں بھی چھپ چکی ہے۔

وہ ایک شخص

ڈاکٹر نزہت مفتی

وہ ایک شخص
جو بھائی تھا میرا ماں جایا
وہ کھو گیا ہے کہیں
وہ سو گیا ہے کہیں
کہاں تلاش کروں؟
اب کہاں اسے پاؤں؟
میں سوچتی ہوں
تو یادوں میں ڈوب جاتی ہوں
وہ ایک شخص
کہ باتوں میں اسکے شیرینی
وہ جس کی شاموں میں تسکین
وہ جس کی صبحیں حسین
وہ جسکی راتوں میں بیداریوں کا حسن یقین
وہ جس کا ذوق لطافت کا رنگ سرمایہ
مصیبتوں سے جہاں کی کبھی نہ گھبرایا

کہ جس کی نشیلی آنکھوں میں
سہانے خوابوں کی کہکشاں دمکتی تھی
وہ جسکی پلکوں سے رنگینیاں چھلکتی تھیں
مگر وہ خواب
وہ رنگینیاں وہ ذوق نظر
اسی کے ساتھ کہیں دور چل دیا پھر
وہ دفن مٹی کے ایک ڈھیر کے تلے ہے مگر
وہ میری نظروں سے پوشیدہ تو نہیں ہے ابھی
: گیا تو کیا میری بزم خیال سے بھی گیا:
گیا ضرور۔۔۔۔۔۔۔کہیں بے نشان منزل کو
مگر وہ اب بھی میرے دل میں ہے۔
نظر میں ہے۔
میرے خیالوں میں خوابوں میں
اب بھی زندہ ہے
وہ ایک شخص وہ ایک شخص

احمد سعید مفتی اوران کی فیملی:۔

احمد سعید مفتی کی تاریخ پیدائش 25 اگست 1950ء ہے۔ گورنمنٹ ٹیکنیکل ہائی سکول گلبہار میں داخل ہوئے ۔ 1958ء کے بعد ملک گیر ٹیکنیکل سکولوں اور ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹس کو سرکاری سطح پر ایوب خان نے مارشل لاء کے دور میں رائج کیا تا کہ طلباء کو ٹیکنیکل تعلیم دی جائے اور انہیں ہنر مند بنایا جا سکے۔ احمد سعید نے الیکٹریکل شعبے کو اپنایا۔ بعد میں انجینئرنگ کالج پشاور سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ 1973ء میرے انگلینڈ جانے کے بعد وہ عراق چلے گئے اور پھر سعودی عرب منتقل ہو گئے۔ شاہ خالد یونیورسٹی ریاض میں بیس سال سے زیادہ عرصہ خدمات انجام دیں۔ ان کی شادی جسٹس کرامت اللہ درانی کی بیٹی نزہت سے 1980ء میں ہوئی۔ نزہت پڑھی لکھی، سنجیدہ اور باشعور خاتون ہیں۔ تین بچے جواد، ثناء اور ضوہیر ڈاکٹر بن گئے۔ ثناء اور ان کے شوہر ڈاکٹر عمر دو پیاری بچیوں علییہ اور مریبہ کے ساتھ انگلینڈ میں مقیم ہیں۔ ڈاکٹر جواد آرتھوپیڈک سرجن ہیں اور اپنی بیگم ڈاکٹر کنزہ اور بیٹے عفان کے ہمراہ پشاور میں مقیم ہیں۔

سعودی عرب کے دارالحکومت ریاض میں میرے قیام 04-2003ء کے دوران کئی بار ان کے گھر جانا ہوا۔ تب سے بچوں کے ساتھ میرا اُنس بڑھا۔ بڑی گپ شپ لگتی اور ابھی تک یہ خوشگور تعلق جاری ہے۔ ریٹائرڈ ہونے کے بعد احمد سعید بمع فیملی حیات آباد میں مقیم ہیں۔ نیشنل یونی ورسٹی آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی کے انجینئرنگ کالج رسالپور میں 70 سال کی عمر تک خدمات انجام دیں۔ آجکل پشاور میں اپنی فیملی کے ساتھ خوش وخرم زندگی گذار رہے ہیں۔ احمد سعید ہمیشہ سے کم گو لیکن ہشاش بشاش، خوش پوشاک رہے ہیں، سعودی عرب کے قیام کے دوران دین کی جانب مائل ہو گئے۔ سعودی عرب میں دل کی تکلیف کے بعد آپریشن بھی کروا چکے ہیں تاہم ماشاءاللہ آجکل اچھی صحت کے مالک ہیں۔ میری والدہ بی کو جان کو احمد سعید سے خصوصی اُنس تھا۔ بچپن میں انھیں چھوٹا ہونے کے ناطے بہت کم

ذمہ داریاں دی جاتیں۔ایک دفعہ جب ان کا جی چاہا تو بی کو جان سے کہنے لگے کہ آج قہوہ میں بناؤں گا۔جب الائچی کوٹ رہے تھے تو والدہ کے ایک جملہ معترضہ کے جواب میں مزاحیہ انداز میں بڑے پر اعتماد طریقہ سے بولے "آج میں آپ سب کو وہ قہوہ پلاؤں گا جو ہمیشہ یاد رہے گا"۔اوراس کے ساتھ ہی سہواً ''چٹو کا پتھر'' نازک چائے دان پر دے مارا۔سب طرف کرچیاں بکھر گئیں۔واقعہ کی شدت کے باوجود محفل قہقہوں سے گونج اٹھی اور آج تک محفلوں میں یہ واقعہ دہرانے پر سب اس سے محظوظ ہوتے ہیں۔واٹس ایپ فیملی گروپ میں اسلامی تعلیمات پر مبنی کوئز بھی کرواتے ہیں۔ملنساری اور طبیعت کا ٹھراؤ ان کی شخصیت کا خاصہ ہے۔

ثروت منظوراوران کی فیملی:۔

ثروت منظور المعروف پینزی 25اگست 1952ء کو گنج والے مکان میں پیدا ہوئیں۔بچپن میں جلد کے ایگزیما سے بہت نالاں رہتیں۔بہت علاج معالجہ کیا گیا مگر شفاء نہ ہوئی۔ایک بزرگ ہستی جو ماچس کی تیلیوں پہ دم کر کے ہدیہ کرتے اور غالباً لنڈیکوتل (خیبرایجنسی) کے رہائشی تھے ان سے روحانی علاج کروایا اور بہت جلد افاقہ ہو گیا۔ہمیشہ سے خوش اخلاق اور بامروت شخصیت کی مالکہ ہیں۔میں نے انہیں سکول کے زمانے میں پڑھایا لکھایا۔خاص کر انگریزی گرائمر۔جب یہ الزبتھ سکول میں تھیں تو ان کی آنکھوں کی نظر کا ٹیسٹ کروایا گیا۔خیبر بازار پشاور کے مشہور عینک ساز سے میں ان کا پہلا چشمہ بنا کر لایا۔جب انھوں نے پہنا اور کمرے کی دیواروں کو دیکھا تو بے ساختہ کہا "ہائے۔دیوار میں تو بڑے بڑے سوراخ بھی ہیں۔"ہم سب بہت ہنسے کہ اس وقت تک ان کو بڑی واضح چیزیں بھی دکھائی نہیں دے رہی تھیں۔یہ واقعہ آج تک ہم سب اور وہ خود بھی مزے لے کر بیان کرتی ہیں۔یہ کہا جائے کہ وہ سکندرہ پورہ والے گھر کی رونق تھیں تو غلط نہ ہوگا۔پھوپھی زاد منظور احمد کرمانی سے 1974ء میں شادی ہوئی اور یہ ایک قابل رشک مثالی جوڑا بنا۔میرے انگلینڈ جانے سے پہلے ان کی بیٹی ارم کے علاوہ ارسلان پاشا کی

پیدائش ہوئی۔میں نے ان کوخون کا عطیہ بھی دیا۔شادی کے بعد کچھ عرصہ یہ مانسہرہ میں مقیم تھیں میں ایک مرتبہ ان کے پاس بطور مہمان گیا۔ان کے تین بیٹے اور ایک بیٹی ہے۔بڑا بیٹا ارسلان پاشا پاک سعودی فرم میں ایگزیکٹو پوسٹ پر ہیں اور اسلام آباد میں اپنی اہلیہ رابعہ اور بچوں ماہ لقا،،ایشاء،حوریا اور محمد عبداللہ پاشا کے ساتھ مقیم ہیں۔محمد عبداللہ پاشا کا نام میں نے تجویز کیا تھا یاسر سلمان جرمنی بی ایم ڈبلیو فرم کے کمپیوٹر انجینئرنگ شعبے میں خدمات انجام دے رہے ہیں جہاں وہ اپنی اہلیہ منزہ اور بچوں یمنا اور ریان کے ساتھ رہائش پذیر ہیں۔عثمان منظور کرمانی ایک غیر سرکاری تنظیم سیو دی چلڈرن میں گرانٹ مینجر کی حیثیت سے آج کل اسلام آباد میں ہیں۔انکی رہائش اہلیہ انم اور بیٹیوں حرم و آئمہ کے ساتھ پشاور میں ہے۔اس کے علاوہ بیٹی ارم کی شادی ایک سائنسدان اور پی ایچ ڈی ڈاکٹر سید جواد احمد شاہ سے ہوئی۔ جنہیں صوبائی اور ملکی سطح پر کئی ایوارڈ زمل چکے ہیں وہ اپنے بچوں رمیض اور ماریا کے ہمراہ ورسک روڈ پر مقیم ہیں۔پینزی نے ماسٹر کرنے کے بعد عالمہ کا کورس کرکے آجکل بہت سے قرآن وحدیث کے تربیتی کورس اپنے گھر میں منعقد کرتی ہیں۔

منظور احمد کرمانی:۔

منظور احمد کرمانی المعروف آغا لالہ ہمارے پھوپھی زاد بھائی تھےان کے والد کا نام عبدالکریم کرمانی (کریم جان) تھا بڑے بھائی لالہ اقبال میرے اچھے دوست تھے۔ ڈھکی شریف خان میں رہتے تھے۔نائب تحصیلدار کی حیثیت سے ملازمت شروع کی۔بہت عرصے تک قبائلی علاقہ جات میں پولیٹیکل ایجنٹ رہے۔ریٹائرمنٹ کے بعد بھی اسپیشل اور ایڈیشنل سیکریٹری کے طور پر خدمات دیتے رہے۔انتہائی فعال اور صاحب رائے تصور کئے جاتے اور حکومتی مشاورت میں شامل رہتے۔لالہ منظور اپنی ذاتی زندگی میں ایک انتہائی تعاون کرنے والے اور صلح جو شوہر اور والد تھےجنہوں نے اپنے گھر میں بھی اپنے بچوں کے ساتھ ہمیشہ ادب سے بات کی۔اور ہمیشہ تحمل سے بات سنی۔شاید ہی کسی پر غصہ کرتے!

اہلیہ پر تو غصہ درکنار بچوں پر بھی غصہ نہیں کیا۔ان کی پسند اچھے کھانے تھے۔ویسے کرمانی اچھی خوراک کے معاملے میں مشہور ہیں۔خود پکانا جانتے تھے اور گوشت کے بہت شوقین تھے۔لالہ منظور 78 سال کی عمر میں برین ہیمرج کے باعث وفات پا گئے۔

ڈاکٹر نزہت ضیاء اور فیملی:۔

نزہت لقاء المعروف روحی 6 مارچ 1956ء کو گنج والے مکان میں پیدا ہوئیں۔اسی دن میں نے ان کی تاریخ پیدائش کتابوں کی ایک الماری پر نقش کر لی ۔روحی گوری اور دادی کی طرح نیلی آنکھوں والی ہنس مکھ ہے۔ میری نانی کے سوئم کے موقع پر میں نے اُسے بغیر کسی سہارے کے پہلی مرتبہ چند قدم چلایا۔سکندر پورہ میں رہائش کے زمانہ میں باالمقابل گھر جہاں ڈاکٹر پروفیسر شفیق اور پروفیسر اشفاق رہتے تھے کی چھوٹی بہن نرگس پروین (پروفیسر آف فزیالوجی پرنسپل خیبر میڈیکل کالج اور ہیڈ فزیالوجی رحمان میڈیکل کالج) کے ساتھ اکٹھی گڑیوں کا کھیل کھیلا کرتی تھی۔الزبتھ سکول اور پھر گورنمنٹ فرنٹیئر کالج میں تعلیم حاصل کی۔ اُردو میں ماسٹر کیا۔شادی کے بعد بچوں کی دیکھ بھال کے ساتھ ساتھ سکول میں پڑھاتی رہی۔آرمی پبلک سکول پشاور میں اُردو کی ٹیچر اور بعد میں اسسٹنٹ پروفیسر کے طور پہ کام کیا۔انہوں نے اپنی دینی دلچسپی میں اضافے کی وجہ سے یہ ملازمت چھوڑ دی اور اسلامیات میں پی ایچ ڈی کر لی۔انہوں نے انتہائی تعمیری وتنقیدی ذہن پایا ہے۔بہت اچھی شاعری بھی کر لیتی ہیں۔خصوصی مقالے لکھتی ہیں۔بہت عرصے سے دین کی درس وتدریس کر رہی ہے۔خصوصی طور پر قرآن کی تعلیم ،تجوید، ترجمہ اور تفسیر کے حوالے سے بہت پہچانی جاتی ہیں۔ایک انتہائی حساس اور محبت کرنے والی بہن ہیں جنہیں ہر وقت بہن بھائیوں کا خیال رہتا ہے اور جب ان کے گھر جائیں تو خصوصی تواضع کے بغیر نہیں چھوڑتیں۔ہم سب کو بھی ان سے بہت پیار ہے۔ان کے بیٹے عدنان اپنی بیگم زوبیہ و بچوں عالیہ، عمار اور آمنہ کے ہمراہ امریکہ میں، فرحان اپنی اہلیہ شیریں، بیٹی حانیہ اور حسن اپنی اہلیہ حراء اور

بچوں ماہم اور محب کے ہمراہ کینیڈا میں رہتے ہیں۔ جبکہ ان کی بہت پیاری بیٹی تاشفین جو شہید بے نظیر بھٹو یونیورسٹی میں خدمات انجام دے رہی ہیں۔ اپنے دو بیٹوں حسان اور ریحان کے ہمراہ پشاور میں رہتی ہیں۔ میری بہن روحی آجکل آن لائن قرآن فہمی کے حوالے سے بہت جانی جاتی ہیں۔

احمد ضیاء بابر:۔

احمد ضیاء بابر میرے خالہ زاد بھائی اور برادر نسبتی ہیں 1952ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد سعید احمد خان اسسٹنٹ کمشنر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ احمد ضیاء بابر پانچ بھائیوں میں سب سے بڑے ہیں۔ احمد ریاض ناجی امریکہ، احمد رضا خرم کینیڈا، احمد فیاض سکندر پشاور میں مقیم ہیں جبکہ احمد نوید اصغر بھی امریکہ میں رہتے ہیں۔ آرمی آفیسر رہے اور بطور لیفٹننٹ کرنل ریٹائر ہوئے۔ ریٹائرڈ ہونے کے بعد کالج آف فزیشن سرجن پشاور، پاکستان میں بطور ایڈمنسٹریٹر اور بعد میں چیف منیجر کے طور پر اہم خدمات انجام دیں۔ اسی دوران انہوں نے ایم بی اے بھی کیا۔ مالاکنڈ میں دہشت گردی سے متاثرہ بچوں کی بحالی کے لئے بھی نمایاں کام کیا۔ آجکل گھر سے مختلف اداروں کیلئے کنسلٹنسی کرتے ہیں۔ شادی کے بعد جب وہ پہلی دفعہ سسرال آئے۔ تو اس وقت محفل میں ان کے لئے کرسی نہ تھی۔ یہ سوچے بغیر کہ اب وہ ہمارے بہنوئی ہیں اور ان کو خصوصی رتبہ دینا ہے۔ میرے بھائی نے انہیں کہا کہ ''بابر اپنے لئے کرسی اُٹھالاؤ''۔ انہوں نے بھی غیر محسوس طور پر عمل درآمد کر لیا۔ مگر آج تک اس بات کا ہمیں طعنہ دیتے رہتے ہیں۔ اور اکثر یہ کہتے ہیں کہ جس طریقے سے آپ لوگوں نے مجھ سے برتاؤ کیا لگتا تھا میں آپ کا بہنوئی نہیں بلکہ سالا ہوں۔ آزاد کشمیر رجمنٹ (واقع ضلع اٹک) تعیناتی میں ہمیں بطور خاندان اپنے ہاں بلاتے اور تقریبات کا انعقاد کرتے جس سے ہم خاصے لطف اندوز ہوا کرتے۔ انہیں فنون لطیفہ سے خاصی دلچسپی رہی ہے۔ ایک انتہائی خوش مزاج لیکن اصولوں کے پابند انسان ہیں۔ ہورائزن (HORIZON) کے مستقل رکن اور مقرر ہونے کے ساتھ ساتھ مینجمنٹ کے سیکریٹری کا رول بھی ادا کرتے ہیں۔

میرا سسرال

مفتی نثار احمد:۔

مفتی نثار احمد میرے سسر تھے وہ ماما گل اور آغا کے نام سے مشہور تھے۔ میری والدہ کے ماموں زاد تھے۔ پیدائش کے بعد ان والدہ کا انتقال ہوگیا۔ان کے والد مفتی فضل کریم نے اپنے بیٹے کی پرورش کے باعث دوسری شادی نہ کی۔ میری والدہ نے کسی حد تک میرے سسر کو پالا۔ ایوب خان کے دور میں سرکاری ملازمت کی وجہ سے لاہور میں مقیم تھے۔ 1971ء ون یونٹ ٹوٹنے پر پشاور اندرون سرکی دروازہ اپنے والد کے گھر منتقل ہوگئے۔ایک راشن ڈپو والد کے نام پر قائم کیا۔ بعد میں گلبہار نمبر ایک میں گھر بنایا جس کا نمبر 38 تھا بعدازاں ساری عمر وہیں مقیم رہے۔ سیکریٹری پبلک سروس کمیشن کی حیثیت سے ملازمت سے ریٹائر ہوئے۔ اپنے دفتر کے حلقوں میں انتہائی مقبول تھے۔ لاتعداد لوگوں کو سرکاری ملازمتیں دلوائیں۔ میں نے اپنی ملازمت کے معاملے میں ہمیشہ ان سے راہنمائی لی۔ صوم و صلوۃ اور تہجد کے پابند تھے روزانہ ایک دفعہ سورہ البقرہ پڑھتے۔ ایبٹ آباد ہمارے گھر آ کر رہتے اور خوش ہوتے تھے۔ عمر کے آخری حصے میں ان کو سٹروک ہوا۔ اپنے بیٹے شکیل مفتی کے پاس ایبٹ آباد میں رہے۔ ان کی وفات جون 2011ء کو ہوئی۔

ذکیہ بیگم:۔

ذکیہ بیگم المعروف گل مامی اور بی بی میری ساس تھیں۔ ان کے والد حافظ محمد یعقوب و والدہ ببو جی محلہ گنج پشاور کے معزز رہائشی تھے۔ جوان عمری میں میری ساس کی گلہڑ کے آپریشن میں پیچیدگی کی وجہ سے آواز دب گئی جس کی وجہ سے وہ نسبتاً آہستہ بولتی تھیں۔ میں اس وقت تھرڈ ایئر ایم بی بی ایس میں تھا۔ خاندان کی خواتین میں مقبول تھیں۔ مجھے انہیں زیادہ قریب سے جاننے کا موقع اس وقت ملا جب وہ 1988ء میں ہمارے گھر ایبٹ آباد میں کئی ماہ تک کولھے کی ہڈی ٹوٹنے کے علاج کے سلسلے میں رہیں۔ چونکہ ان کے جوڑ کا

آپریشن فوراً نہ ہوسکتا تھا اسلئے میں اور میری بیگم یورپ کے سفر اور حج کی سعادت کے لئے چلے گئے۔واپسی پر میں نے ان کا آپریشن خود کیا اور یہ آخری عمر تک چلتی پھرتی رہیں۔ان کی وفات اکتوبر 2005ء میں ہوئی۔

شکیل احمد مفتی و فیملی:۔

المعروف چن گل میرے برادر نسبتی، محکمہ تعلیم کے کالجوں میں شعبہ زوالوجی کے فیکلٹی رہے۔ ایک اچھی خاتون سے رشتہ ازدواج میں منسلک ہوئے۔دو بیٹیاں ل مہرین، ماریہ اور بیٹا انجنیئر حسیب سب شادی شدہ اور اپنے گھروں میں خوش وخرم ہیں۔انتہائی زہین تھے اور قانونی و تیکنیکی معاملات پر دوسروں کی راہنمائی کرتے۔ملازمت کے آخری سالوں میں انہوں نے ایبٹ آباد پوسٹ گریجویٹ نمبر 2 کالج کو بطور پرنسپل ایک تاریخی درس گاہ میں تبدیل کرنے میں اہم کردار ادا کیا اور کئی نئے شعبوں کا آغاز کیا۔ان کی یاد میں اسی درسگاہ میں شکیل بلاک کے نام سے ایک تعلیمی بلاک بھی قائم ہے۔ریٹائر ہونے کے بعد پشاور میں ایٹا کے ڈائریکٹر بنے۔اپنے والد کی شدید بیماری میں بے انتہا خدمت کی۔جوانی میں ہی ایک گردے کے کینسر کی تشخیص کے بعد سی ایم ایچ پشاور میں میری موجودگی میں کامیاب آپریشن ہوا اور سالہا سال صحت یاب رہے۔ملازمت کے اواخر میں انہیں اچانک دل کا شدید دورہ پڑا جس کے کچھ عرصہ بعد رحلت پا گئے۔اللہ ان کو غریق رحمت کرے اور جنت الفردوس عطا کرے۔

ڈاکٹر وقار احمد مفتی و فیملی:۔

ڈاکٹر وقار احمد مفتی، انجم کے نام سے مشہور ہیں۔انہوں نے راولپنڈی میڈیکل کالج سے ایم بی بی ایس کیا۔1980ء میں سال سوم ایم بی بی ایس کے امتحان کی تیاری کے لئے ہمارے ہاں خیبر روڈ پشاور کے فلیٹ میں مقیم رہے۔ایک دل چسپ واقعہ یاد آیا ایک رات وہ پانی پینے باورچی خانے گئے تو ایک چوہا خشک دودھ کے ڈبے پر بیٹھا اسے اندھیرے میں نظر آیا۔جونہی انہوں نے چوہے کی دم پکڑنا چاہی تو وہ سانپ بن کر تیزی سے کیبینٹ کے پیچھے روپوش ہو گیا۔ان کے اس زمانے کے دوستوں

میں سے موجودہ دوست ڈاکٹر انیس وندیم اور ایڈوکیٹ راجہ صاحب سے خوشگوار یادیں وابستہ ہیں۔ ہاؤس جاب میرے ساتھ ایبٹ آباد میں کی۔ میری ایک مہم جوئی میں میرے ساتھ شامل رہے۔ ممتاز بزنس مین منظورالٰہی کی دختر روزینہ سے شادی ہوئی اور آج کل اپنے تین بچوں انجینئر ثاقب، انجینئر حیدر اور ثمر کے ہمراہ ایبٹ آباد میں مقیم ہیں۔آسٹریا سے کارڈیالوجی کا ڈپلومہ اور گلاسگو برطانیہ سے کارڈیالوجی میں ماسٹرز کر کے پاکستان واپس آئے۔لیڈی ریڈنگ ہسپتال، خیبر ٹیچنگ ہسپتال اور ایبٹ آباد میں ایوب میڈیکل کالج میں ملازمت کی۔سربراہ شعبہ کارڈیالوجی رہے اور بہت کام کیا۔برطانیہ میں انہیں ایف آر سی پی سے نوازا گیا۔2019ء میں ایوب میڈیکل کالج سے ریٹائرڈ ہوئے اور آج کل وومن میڈیکل کالج کے کارڈیالوجی ڈپارٹمنٹ کے سربراہ ہیں۔بہترین معالج امراض دل ہیں۔ 2000ء میں مجھے جب دل کا عارضہ لاحق ہوا تو انہوں نے ہی علاج کیا۔

اشفاق مفتی وفیملی:۔

اشفاق مفتی میری بیگم کے چھوٹے بھائی ہیں۔ اشفاق بچپن سے ہی بڑا خوش مزاج ملنسار انسان تھا۔سکول کے زمانے سے ہی میرے ساتھ خاصا مانوس ہو گیا تھا۔ہمارے ایبٹ آباد منتقل ہو نے کے بعد اکثر چھٹیوں میں ہمارے ساتھ رہتا تھا۔ماسٹرز پشاور یونیورسٹی سے کیا اور اپنے حلقہ اثر کے مردوزن میں کافی مقبول تھا اور آجکل بھی ہے۔والد کی از حد خواہش اور کوشش کے باوجود سرکاری نوکری کی بجائے رحمت شاہ آفریدی کے اخبار فرنٹیئر پوسٹ کو سیراب کرتا رہا۔اپنا بزنس عظیم انٹرپرائز کے نام سے شروع کیا۔آج کل "الحاق" اخبار کا مالک و مدیر ہے۔پاکستان ایڈیٹر کونسل کا فعال و اہم رکن ہے۔شادی ایک نیک سیرت وخوشگوار خاتون ''لبنیٰ'' سے ہوئی۔ دو پیارے بچوں یاسین و حذیفہ کا والد ہے۔آج کل ایبٹ آباد میں رہائش پذیر ہیں۔اشفاق دوست احباب کا بہت خدمت گزار ہے۔ سفید گوشت اور دم پخت پکانے کا ماہر بھی ہے۔ماضی قریب ایک فاتحہ خوانی کے موقع پر اتنی پراثر وجامع دعا

کروائی کہ مجھے بھی حیران کر دیا۔دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ اسے اور اس کے خاندان کو صحت والی زندگی دے اور شادو آباد رکھے۔

ڈاکٹر فرزانہ ناہید مفتی و فیملی:

ڈاکٹر فرزانہ المعروف فوزی میری بیگم کی چھوٹی بہن ہے۔غیر معمولی تعلیم و تربیت کا رجحان رکھتی تھی۔بی ایس سی سائنس چھوڑ کر ایبٹ آباد گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج نمبر ایک میں قاضی منیر جیسے مقتدر انگریزی کے پروفیسر کی زیر نگرانی ایم اے انگلش کر لیا۔پشاور کے مشہور سینٹ میریز سکول میں چند سال ٹیچنگ کی ۔پشاور یونیورسٹی سے بی ایڈ اور ایم ایڈ کر لیا۔آرمی کالج آف ایجوکیشن پشاور کو نہ صرف اسٹیبلش کیا بلکہ خوش اسلوبی سے چلایا۔ایجوکیشن میں ایم فل اور پی ایچ ڈی کی ۔انتہائی خوش مزاج و تحمل والی خاتون ہیں۔ان کی جان بچوں میں ہے۔بہت سے بچے ان کو اپنی ماؤں سے زیادہ چاہتے ہیں۔ میرے بچوں کی تربیت میں ان کا بہت خصوصی ہاتھ رہا ہے۔آج کل اباسین یونیورسٹی میں ہیڈ آف ڈیپارٹمنٹ ہیں۔انتہائی محنتی اور کمپیوٹر سکلز میں ماہر ہیں۔رشتہ داروں اور احباب کی تاریخ پیدائش اور دیگر اہم تاریخیں انہیں زبانی یاد ہیں۔ان کی شادی بریگیڈیئر سلیم اشرف سے ہوئی۔یہ ایک انتہائی ملنسار اور ہر کسی کے کام آنے والے انسان ہیں۔جب بھی کسی کو ان سے کوئی کام پڑتا ہے انہیں یاد رہتا ہے۔اور یہ اسے اپنے کاموں میں اہم ترین قرار دیتے ہوئے جلد سے جلد کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ان کے والد کیپٹن ریٹائرڈ اشرف حسین مرحوم سے میری بہت اچھی بنتی تھی۔ڈاکٹر نسیم اشرف ان کے بڑے بیٹے اور ایک مشہور شخصیت رہے ہیں (ان کا ذکر اس سے پہلے اس کتاب میں آچکا ہے)۔بریگیڈیئر سلیم اشرف کے ایک بھائی ڈاکٹر نعیم (نمو) انگلینڈ میں بہت عرصہ ماہر اطفال رہے اور اب پشاور منتقل ہو گئے ہیں۔ سلیم اشرف کے دو بیٹے انجینئر اسامہ اور عثمان ہیں۔اسامہ اپنی بیگم کے ہمراہ اسلام آباد آغا خان فاؤنڈیشن میں انجینئر ہیں اور عثمان سلیم یونیورسٹی میں گریجویشن کر رہے ہیں۔

میرے عزیز واقارب

ماموں میاں محمد اسماعیل قریشی:۔

میاں محمد اسماعیل قریشی المعروف گل جی جان و باباجی میرے بڑے ماموں تھے۔ایک خوش لباس انسان تھے۔ ماڈرن سوٹنگ کے علاوہ شیروانی اور کلاہ بھی پہنتے تھے جس میں بہت متاثر کن لگتے ۔ ان کے دوستوں میں اقبال خان جو جنرل ایوب خان کے بھائی تھے ان کے خاص دوستوں میں شمار ہوتے تھے اسی طرح ان کی سابق وزیر اعظم محمد خان جونیجو (مرحوم) سے بڑی دوستی تھی وہ ان کے پاس پشاور آتے بھی تھے۔اسکے علاوہ پیر پگاڑا نے بھی انکی رفاقت سے استفادہ کیا۔تاریخ کے موضوع پر بحث کرنے کی شوقین تھے۔ ایک کامیاب اور نامور وکیل بنے اور مصر میں پاکستان کے سفیر بھی رہے۔ انکا ایک بیٹا عاصم اسماعیل اور تین بیٹیاں فرح، ہما اور عنبرین ہیں۔میاں عاصم اسماعیل بڑے فرزند اور مجھ سے 12 تا 14 سال چھوٹے تھے۔عاصم اسماعیل میرے ہاتھوں میں پلے بڑھے۔بچپن سے ہی با زوق اور اعلیٰ مزاح کا پہلو رکھتے تھے۔سلجھی اور بے باکی سے بات کرنے کی مہارت رکھتے تھے۔گورنمنٹ کے پی کے سینیئر افسران میں سے تھے۔پچھلے چند سالوں میں انہوں نے محکمہ پلاننگ اور ڈیویلپمنٹ ،سول سیکریٹریٹ ، پشاور میں عمدہ خدمات انجام دیں ۔ جوانی میں ہی ان کا دل کا بائی پاس آپریشن ہوا۔ 2021ء ان کا دل کے عارضے کے باعث انتقال ہوگیا۔

ماموں میاں محمد یوسف قریشی:۔

میاں محمد یوسف قریشی المعروف آغا ماما جان و اباجی ایک سینیئر ایڈوکیٹ تھے۔انہوں نے یوسف گڑھی کے نام سے ترناب فارم میں ایک گاؤں آباد کیا۔انتہائی ملنسار،خوش مزاج ،نرم دل اور بچوں کے لئے خصوصی گوشہ محبت رکھنے والے تھے۔ ہماری پیار و محبت سے تربیت کرتے تھے۔ انکی شادی مجھے قرآن پاک پڑھانے والی ہستی کی بیٹی نسیم (خور بی بی) سے ہوئی وہ بہت پڑی لکھی تھیں اور پرنسپل و دیگر

تعلیمی عہدوں پر فائز رہیں۔ ماموں وکالت کے سلسلے میں جب کبھی ایبٹ آباد آتے تو ہمارے گھر رہتے۔ انکا ایک بیٹا شہاب یوسف انشورنس کمپنی میں سینئیر آفیسر ہیں اور دو بیٹیاں شبنم وشہلا بچوں کے ہمراہ اپنے اپنے گھروں میں آباد ہیں۔

چچا مُفتی احمد گل:۔

مفتی احمد گل المعروف بڑے آغا جان میرے چچا تھے۔ انگریزی دور سے سرکاری ملازمت میں تھے اور محلہ سیٹھیان پشاور میں رہتے تھے۔ مفتی ممتاز اور باجی معراج انکی پہلی بیوی سے، نزاکت شاہین، صداقت اور عزیز گل دوسری بیوی سے تھے۔ مفتی ممتاز انڈسٹریز ڈیپارٹمنٹ میں سینئر عہدے پر فائز تھے۔ عزیز گل مفتی (ڈاکٹر) خیبر میڈیکل کالج میں مجھ سے ایک سال سینئیر تھے۔ میری ہاؤس جاب کے دوران انہیں گھر میں دل کا دورہ پڑا میں انہیں اُٹھا کر ہسپتال لے گیا۔ بروقت علاج ہوا اور وہ صحت مند ہو کر واپس گھر پہنچ گئے۔ انہوں نے 96 سال کی عمر پائی۔

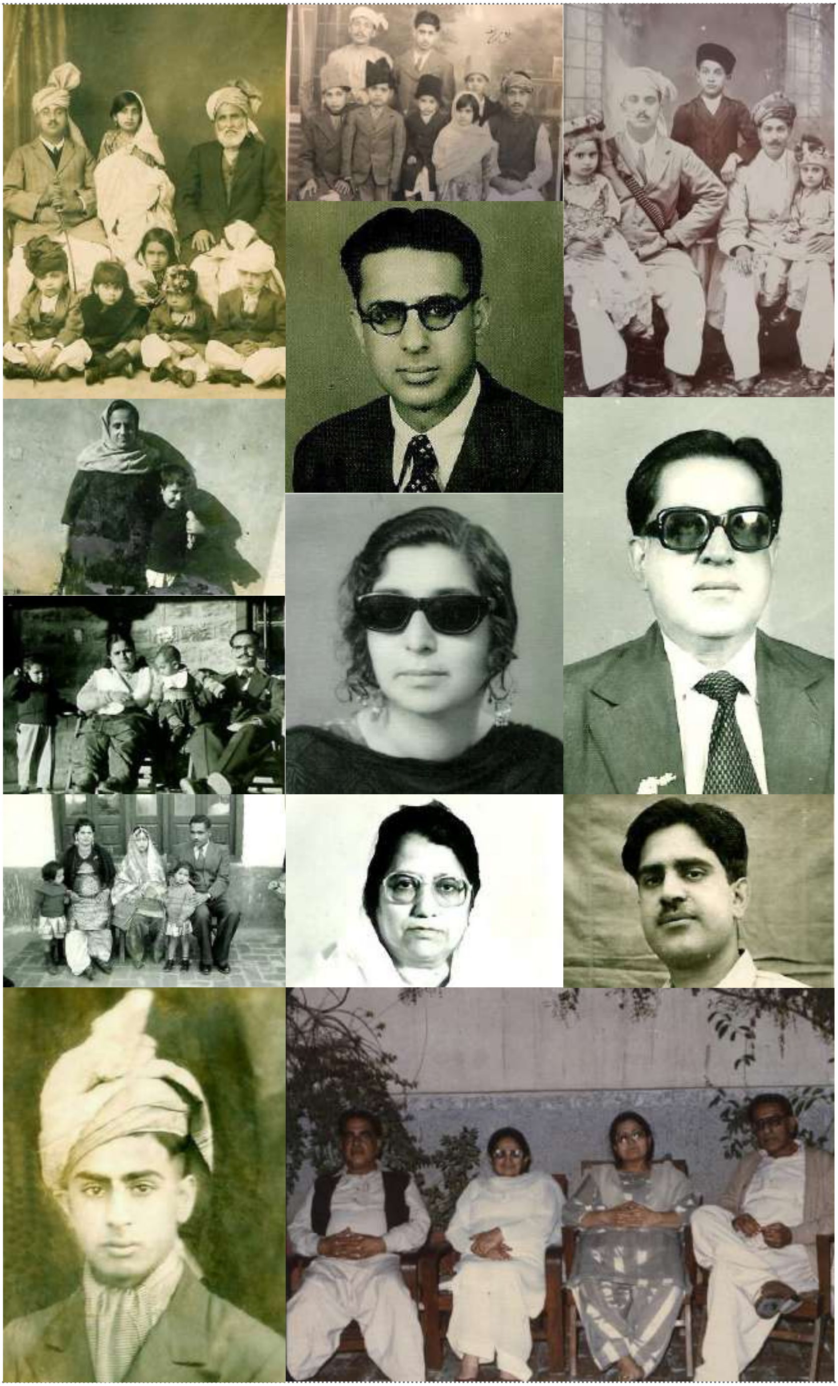
چچا مفتی مسعود جان:۔

مفتی مسعود جان چھوٹے چچا تھے اور میرے والد سے بڑے تھے۔ ڈھکی شریف میں ہمارے دادا مفتی محمد عارف کے گھر میں رہتے تھے۔ میری چچی کا تعلق کوہاٹ سے تھا اور وہ سکول ہیڈ مسٹرس تھیں۔ چچا مسعود جان کے پانچ بیٹے، مفتی ایوب جان، یعقوب جان، جہان گل، عارف منیر اور زیبی جبکہ دو بیٹیاں، ماہ جبین اور نور جہاں تھیں۔ تین بیٹے اور ایک بیٹی حیات ہیں۔ جواں سال بیٹے مفتی یعقوب جان اچانک وفات پا گئے۔ ان کی موت کا علم ان کی بڑی بہن ماہ جبین جو شادی شدہ تھیں بھی چند لمحوں بعد صدمے سے راستے میں آتے ہوئے گر گئیں اور اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ اس طرح گھر سے دو جنازے اکٹھے نکلے۔ یہ انتہائی المناک واقعہ تھا جس پر ہم سب بھی بہت زیادہ دکھی تھے۔ ہم بھائیوں نے جنازے کے تجہیز و تکفین میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ چچا مسعود جان لگ بھگ ساٹھ برس کی عمر میں دل کا دورہ پڑنے

سے انتقال کر گئے۔ میں نے اُن کی ہر ممکن دیکھ بھال کی۔اس کے علاوہ دیگر بیٹوں میں جان گل، عارف منیر (ماہ گل) اورسب سے چھوٹا زیبی ہے۔ان کا بیٹا شیراز مفتی آجکل امریکہ میں مقیم ہے۔مفتی عارف منیر فوج میں انجینئر اور لیفٹننٹ کرنل کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ کچھ عرصہ پشاور پولیس میں بم ڈسپوزل میں اے آئی جی بھی تعینات رہے۔ بعد میں انہوں نے اپنی کنسٹرکشن فرم بنالی۔ابھی تک اسی شعبے سے منسلک ہیں۔ایبٹ آباد میں ان کی بیٹی رابعہ ایوب میڈیکل کالج سے پڑھیں،شادی کے بعد انگلینڈ چلی گئیں آج کل وہیں مقیم ہیں ان کے دو بیٹے امریکا میں ڈاکٹر ہیں، ایک بیٹا جنید اسلام آباد میں آئی ٹی کا بزنس کرتا ہے۔

ڈاکٹر عزیز گل مفتی:۔

عزیز گل مفتی جنہیں ہم عزیز جان پکارتے تھے میرے چچازاد بھائی اور مجھ سے ایک کلاس آگے فارورڈ پبلک سکول پشاور، ایڈورڈ ز کالج اور پھر خیبر میڈیکل کالج سے پڑھے ۔اس دور میں وہ کرکٹ کمنٹری انتہائی جوشیلے اور جارحانہ مخصوص انداز میں کرتے۔1972ء میں انگلینڈ اور پھر امریکہ چلے گئے جہاں لگ بھگ آٹھ،دس سال کے دوران ہمارا کوئی خاص رابطہ نہ تھا۔انٹرنیشنل کارڈیالوجسٹ یعنی انجیوگرافی وغیرہ کرنے کے ماہر ہوگئے۔ پاکستان واپس آئے اور لیڈی ریڈنگ ہسپتال پشاور میں اسسٹنٹ پروفیسر کارڈیالوجی ڈپارٹمنٹ میں خدمات انجام دینے لگے ان دنوں اس ڈپارٹمنٹ کے سربراہ صاحبزادہ وحید ہوا کرتے تھے۔عزیز جان انتہائی مقبول ڈاکٹر تھے۔ 2000ء میں تدریسی ہسپتالوں کو مینیجمنٹ کمیٹی کے حوالے کیا گیا تو پشاور کے بہت سارے ڈاکٹروں کی طرح عزیز گل بھی سرکاری ملازمت سے مستعفی ہوکر آر ایم آئی میں پرائیویٹ پریکٹس کرنے لگے۔2001ء میں جب مجھے دل کا دورہ پڑا تو لیڈی ریڈنگ ہسپتال پشاور میں عزیز گل نے صاحبزادہ وحید کے ساتھ مل کر میری انجیو پلاسٹی کی۔2002ء میں وہ آر ایم آئی ہسپتال پشاور میں میری دوبارہ انجیو پلاسٹی کرنے میں میں بھی شامل





Grandpa Mufti Fazal e Karim







Mufti Nisar Ahmed (1940)





















رہے۔ پیٹ میں رسولی کی تشخیص اور آپریشن کے لئے امریکہ گئے مزید علاج بھی ہوا۔ صحت مند ہونے کے بعد پھر پاکستان واپس آگئے دس سال تک بطور کارڈیالوجسٹ پشاور میں مقیم رہے اور چند برس قبل اس جہاں فانی سے رخصت ہو گئے ۔ ان کی شادی درانی فیملی میں ہوئی ۔بیگم نیلوفر (نینو) انگلش ڈیپارٹمنٹ، پشاور یونیورسٹی میں پڑھاتی اور چیئرپرسن بھی رہیں۔عزیز گل مفتی کی دو بیٹیوں میں بڑی بیٹی حنا کی شادی مردان کے ایک ڈکٹر سے ہوئی اور امریکہ میں وہ مقیم ہے۔ چھوٹی بیٹی کا نام کرن ہے۔ وہ بھی امریکہ میں مقیم ہے۔

باب نمبر 19

میرے احباب

محمد شفیق المعروف شیقو:۔

محمد شفیق (شیقو) ولد حاجی عبد الرؤف پاکستان اسٹیٹ آئل سے ریٹائرڈ سینئر ایگزیکٹیو اور پشاور کی معروف ککے زئی فیملی سے تعلق رکھتے ہیں آج کل شامی روڈ پر مقیم ہیں گورنمنٹ ہائی سکول نمبرا پشاور میں چھٹی جماعت سے ایڈورڈز کالج تک لنگوٹیا رہے۔سکول سے گھر بھی اکھٹے آتے۔ میرا گھر سکندر پورہ میں تھا اور اُس سے ایک فرلانگ آگے شیقو کا گھر نشتر آباد میں تھا۔ہم ہمیشہ سب سے آگے والی ڈیسک پر اکھٹے بیٹھنے کیلئے تن من دھن کی بازی لگانے کو تیار رہتے۔باوجود کوشش کے اساتذہ یا طالب علم ہم سے یہ اعزاز سکول کے آخری دن تک نہ چھین سکے۔ہم نے صیغہ راز میں رکھنے کیلئے لوگوں کے بہت عجیب عجیب نام رکھے تھے۔مثلاً لتا (شاید لتا منگیشکر انڈین سنگر سے ماخوذ تھا)۔کا مطلب ' ساتھ والا شخص' ۔لہٰذا ہم اکثر کسی ساتھ والے تیسرے شخص کی بات اشارتاً یہ کہہ کر کہ ''لتے نے فلاں کام کیا''۔اسی طرح کسی کا نام' پیر، منگل، بدھ' اور کسی کا نام' On the cave' بھی رکھا تھا۔کلاس کے سب سے دبنگ لڑکے کو ہم' کنگ' کہتے تھے جو اس نام سے اتنا مشہور ہوا کہ اُس کا اصلی نام سب سے بھول گیا۔خفیہ کوڈنگ نے ہماری زندگی بہت آسان کردی۔

ہم دونوں ملکر دوسرے لڑکوں سے دنگا فساد بھی کرتے۔جب کبھی ہم دونوں میں سے کوئی بیماری کی وجہ سے سکول نہ آتا تو وہ دن ہمارے لئے شدید خطرے کا باعث ہوتا کیونکہ مخالف بدلہ لینے کیلئے تیار ہوتے۔شفیق اور میں آٹھویں جماعت میں اپنے وقت کے مشہور سکول ٹیچر علامہ صوفی غلام مصطفی ثاقب حزیں (میرے رشتہ دار بھی تھے) جو بعد میں پی سی ایس سول سروسز میں چلے گئے تھے سے شام کو ٹیوشن کے لئے اُن کے گھر جاتے تھے۔اُن کے گھر کی بیٹھک میں پندرہ، بیس دیگر طلباء بھی ہوتے۔محترم ماسٹر

مصطفی بڑے رعب داعب والے انسان تھے۔ ہمارا اُن سے دم نکلتا تھا۔ ہم دونوں ٹیوشن کے وقت اُن کے بالکل سامنے سب سے آگے ساتھ ساتھ بیٹھتے۔ ایک دن ماسٹر مصطفی کے گھر کے باہر ریڑی پر شفیق 'پھلے (Popcorn)' لینے رک گیا۔ جب وہ پھلے اپنے جیب میں بھر کر کمرے کے اندر لا یا۔ تو ماسٹر مصطفی صاحب کلاس شروع کر چکے تھے اور بلیک بورڈ کی طرف منہ کئے کوئی سوال حل کر رہے تھے۔ اُن کی عادت تھی کہ اس موقع پر جب تک وہ سوال مکمل نہ ہو جاتا اِدھر اُدھر نہ دیکھتے۔ شیقو نے موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے جیب سے پھلے نکالے اور چوری چوری مجھے دینے لگا۔ میں ماسٹر صاحب کے ڈر سے ہاتھ نہیں بڑھا رہا تھا جب کچھ دیر کشمکش اور ٹو نا ٹونی میں گزر گیا۔ تو اچانک ماسٹر مصطفی ہماری دھینگا مشتی کے دوران اُونچی آواز میں ہندکو میں بولے " لےلیس، لےلیس، لےلیس نا" یعنی لے لو، لے لو، لے لو نا۔۔۔۔

ایک دن ٹیوشن ختم ہونے پر دھکم پیل کے دوران ایک لڑکے کی چپل ڈیوڑی کے نالے میں گر گئی اور پتہ ہونے کے باوجود ہم اُس کے پریشانی کو دیکھ کر محظوظ ہوتے رہے۔ بعد میں اسے چپل مل گئی اور اُس نے مغلظات سے بھرے الفاظ کہتے ہوئے چیخ چیخ کر پوچھا " کس نے گرائی ہے میری چپل اس نالے میں " اور ہم میں سے کسی نے اُس کو ایک لڑکے کے متعلق شرارتاً کہہ دیا جو ٹیوشن پڑھ کر جا چکا تھا۔ بعد میں پتہ چلا کہ دونوں کے درمیان تلخ کلامی ہوئی اور اس نے 'وڈے بازار' (بڑے بازار) کی اُترائی پر اس لڑکے کو جا لیا اور چاقو کا وار بھی کیا شاید وہ تھوڑا زخمی بھی ہوا۔ اس واقعے سے دل بڑا بوجھل ہوا اور میں نے اپنے آپ کو بہت برا بھلا کہا۔ اگر چہ آج بھی یہ واقعہ شفیق جان بہت فخریہ طور پر لوگوں کے درمیان بیان کرتا ہے اور میں بھی اس کا ساتھ دے دیتا ہوں۔ مگر سوچتا ہوں کہ معمولی سی شرارت کس قدر نقصان دہ ہو سکتی ہے۔

ساتویں یا آٹھویں جماعت کا واقعہ ہے جب میں اپنے بھائی گل آغا (سعید گل) کو ملنے ماسٹر جان محمد کے ہاں گیا تو معلوم ہوا کہ وہ لڑکوں کے ہمراہ ٹیوشن کے بہانے فلم دیکھنے گیا ہوا ہے۔ میں نے اس کا ذکر شیقو سے کیا۔ بس پھر کیا تھا ہم نے بھی چھپ کر فلم دیکھنے کا پروگرام بنایا۔ گھر سے ٹیوشن کے بہانے

سائیکلوں پر بیٹھ کر خیبر بازار اور قصہ خوانی سے متصل تین سنیماؤں میں سے ایک سنیما ناولٹی میں 'بھائی بھائی' فلم کا میٹنی شو تین تا چھ بجے شام دیکھنے چلے گئے ۔ چھ آنے کا تھرڈ کلاس کا ٹکٹ تھا۔ دو ٹکٹ لئے سائیکلیں کرائے کے سٹینڈ پر لگا دیں۔ اندر داخل ہوئے مختلف قطاروں میں لوگ کرسیوں پر بیٹھے تھے ہم بھی بیٹھ گئے ہم سے پیچھے سیکنڈ اور فرسٹ کلاس اور ایک اوپر کی چھت ''گیلری'' ہوا کرتی تھی۔ تھوڑی دیر میں ہال کھچا کھچ بھر گیا۔ ہاف ٹائم میں ہم تیزی سے نکلے۔ سائیکلوں پہ بیٹھے اور ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت گھر پہنچے۔ ماں سے کہا کہ چائے پلاؤ۔ ٹیوشن سے تھوڑی دیر کی بریک ہوئی ہے اور واپس جانا ہے۔ ماں نے واری نیاری ہوکر ہمیں چائے پلوا کر اور دعائیں دے کر رخصت کیا اور پھر ہم سائیکلیں دوڑا کر ناولٹی پہنچ گئے۔ فلم شروع ہو چکی تھی۔ ایک پارٹ مس ہو گیا۔ جس کا آج تک افسوس ہے۔ اس طرح ہمیں گا ہے بگا ہے گھر سے چوری فلمیں دیکھنے کی عادت ہوگئی۔

ایک دفعہ ہماری سائیکلیں سٹینڈ میں دوسری لوگوں کی سائیکلوں میں پھنس گئیں۔ ہاف ٹائم میں گھر جانا لازمی تھا۔ ایک غضب ٹوٹ پڑا۔ سائیکل سٹینڈ والے کے سامنے روئے پیٹے۔ منت زاری کی پھر نجانے کس طرح اُس نے ہمیں سائیکلیں نکال کر دیں اور ہم نے اپنے گھر جانے کی رسم پوری کی۔ یہ ذکر کرتا چلوں کہ اکثر فلم لگنے کے پہلے دن پہلا شو (میٹنی) دیکھنا بھی ہمارے لئے ایک اعزاز ہوتا۔ ایک مرتبہ ایڈوانس ٹکٹ بلیک پر خرید رکھا تھا۔ پاکستانی مشہور فلم 'نیلو' فردوس سنیما میں لگی تھی۔ شیقو نے میرے گھر آکر دو بجے مجھے ساتھ لے جانا تھا۔ وہ آیا مگر میرے والد کے دوست اور مزارع ''میاں خان چاچا'' اُرمڑ گاؤں سے آئے ہوئے تھے۔ گھر میں چونکہ والد نہ تھے میں نے دوپہر کا کھانا اُن کو کھلانا تھا۔ اُن کی گپ شپ لمبی ہوتی تھی۔ اُن کا ایک ایک نوالا ہم گن رہے تھے اور دل میں دعائیں کر رہے تھے کہ وہ جلدی کھانا تناول کریں تا کہ ہم بروقت شو پر پہنچ سکیں۔ خیر خیر سے کھانا ختم ہوا اور ابھی برتن بھی نہیں اُٹھائے گئے تھے کہ شفیق نے مجھے اشارے کرنا شروع کر دیئے۔ میں جوش میں آ گیا اور فٹ سے میاں

خان چاچا کو کہا کہ ''چاچا دعا بہ کوؤ''یعنی چاچا دعا کریں گے۔مطلب کہ بس اب آپ جائیں یا ہمیں جانے دیں! میاں خان اللہ انہیں غریق رحمت کرے نے برا نہ مانا دعا کی اور روانہ ہو گئے اور ساتھ ہی ہم سائیکلوں پر فراٹے بھرتے ،قہقہے لگاتے ،فلم دیکھنے پہنچ گئے۔شفیق اس واقعے کوسینکڑوں بار مختلف مواقع پر بے شمار بار دوست احباب کو سنا چکا ہے۔میٹرک کے فوراًبعد شیقو کو معیادی بخار یعنی ٹائیفائیڈ ہو گیا اور وہ چالیس دن بستر پر پڑا رہا۔یہ ایام میرے لئے زندگی کے انتہائی افسردہ ایام تھے۔ہم دونوں ایڈورڈز کالج میں داخل ہو گئے تھے، وہ اپنی بیماری کی وجہ سے ایف اے یعنی آرٹس میں اور میں میڈیکل میں داخل ہونے کی وجہ سے کالج میں الگ ہو گئے۔پھر بھی اکثر اوقات گھر واپس سائیکلوں پر اکھٹے آتے اور شرارتیں بھی اکھٹی کرتے۔ایک دن حسب دستور ٹانگے میں بیٹھی پردہ پوش خواتین کے پیچھے گانے گاتے ہوئے جا رہے تھے کہ ایک پردہ پوش خاتون نے چہرے سے پردہ ہٹا کر اور مجھے اپنے گھر کے نام سے پکارتے ہوئے کہا کہ ''ٹیپو اب باقی کا گانا گھر جا کر مجھے سنانا۔میں آج تمہارے گھر آؤں گی''۔میرے آنکھوں کے سامنے ندامت سے اندھیرا چھا گیا۔وہ عمر میں مجھ سے بڑی میری ایک کزن تھی لیکن وہ دن اور آج کا دن میں نے کبھی کسی پردہ پوش خاتون کا پیچھا نہیں کیا۔

ایڈورڈز کالج کے دنوں میں ہماری دوستی نیوزی لینڈ کے گورے لیکچرر مسٹر سکاٹ سے ہوگئی۔ شفیق کے بھائی رفیق (مرحوم) کی شادی تھی۔ہم نے مسٹر سکاٹ کو مدعو کیا۔بارات کے وقت دولہے کو سہرا پیش کرنے اور'ویلیں' دیتے ہوئے تمام نوجوان دست درازی کرتے اور انجوائے کرتے۔مسٹر سکاٹ نے گھبرا کر ہم سے پوچھا کہ میرے ساتھ بھی یہی ہوگا تو ہم نے کہاں ''ہاں آپ کے ساتھ بھی ہوگا''۔وہ بڑا پریشان ہوا اور کئی گھنٹے تک اپنے دونوں ہاتھ پیچھے باندھ کر پھرتا رہا۔شفیق کی والدہ کی جان لیوا بیماری کے دوران جبکہ میں میڈیکل سٹوڈنٹ تھا اکثر اُن کو طبی امداد پہنچاتا۔شفیق کی والدہ مرحومہ دل کے عارضے میں مبتلا ہوئیں۔ڈاکٹر سرجن رحمن نے پشاور آ کر انہیں آپریشن کے بعد پیس میکر ڈالا۔شیقو اُن کا ذکر ہمیشہ

بہت قدر سے کرتا ہے۔شفیق کی منگنی اُس کے ماموں بابو گل کے مشہور گھر ''نور محل'' واقعہ نشتر آباد میں ہوئی۔ منگنی میں تو میں شریک ہو گیا لیکن شادی کے موقع پر میں انگلینڈ میں تھا۔انگلینڈ سے واپس آنے کے بعد کئی سال اپنی اپنی مصروفیات اور مختلف شہروں میں ہونے کی وجہ سے ہم زیادہ مل جل نہ سکے۔جب بچے بڑے ہو گئے تو دوبارہ ملاپ کا سلسلہ شروع ہوا۔شفیق اپنی فیملی کے ہمراہ مری وغیرہ جانے کا شوقین تھا اور اکثر ایبٹ آباد میرے گھر فیملی کے ہمراہ آتا۔اُس کی بیگم 'دل آرا' ایک انتہائی خوش مزاج لیکن متین خاتون ہے اور ہمیشہ سے اپنے خاوند کی بہت خدمت شعار بھی ہیں۔شفیق کی زندگی اور شخصیت کے بارے میں میری رائے یہ ہے کہ وہ زندگی بھر میرا ایک انتہائی مخلص دوست رہا ہے۔اپنے شعبہ میں اُس نے ترقی اپنی ذہانت اور محنت کے ذریعے کی۔نیز اُس کا اپنے سینئرز کے ساتھ رویہ بھی قابل تعریف رہا۔بطور باپ اور بطور سربراہ فیملی انتہائی ذمہ دار رہا۔ریٹائرمنٹ کے بعد پشاور کے چیمبر آف کامرس کا نائب صدر بھی رہا اور دنیا کی چند ممالک کی سیر بھی کی۔گالف کھیلنے کا شوقین تھا اور اپنے عارضہ قلب کے باوجود ڈٹا رہتا اور مجھے بھی شوق دلاتا تھا۔کچھ عرصے سے مسجد میں باقاعدگی سے نماز ادا کرتا اور درس سننے اور سنانے کی جانب راغب ہو گیا ہے۔کسی تیل کمپنی میں اسے حال ہی میں دوبارہ ملازمت مل گئی ہے اور زیادہ تر وقت وہ گھر سے ہی آن لائن خدمات انجام دے رہا ہے۔اللہ اُسکی عمر دراز کرے،صحت اور خوشیاں دیں۔عاصم شفیق کا اکلوتا بیٹا ہے۔بیٹیوں میں سے صرف زینب کے ساتھ تعلیم کے سلسلے میں رابطہ رہا۔

ڈاکٹر منیر اقبال:۔

منیر اقبال فارورڈ سکول کی کلاس سوئم میں ایک سال تک میرا کلاس فیلو رہا۔ایک سال بعد ان کے والدین نے انہیں اس لئے کسی دوسرے سکول میں داخل کروا دیا کہ فارورڈ ایک انگریزی سکول ہے جس میں اُردو املا،خوشخطی لکھنے اور دینی علوم کا کوئی بندوبست نہیں یوں وہ پانچویں سے دسویں جماعت تک گورنمنٹ ہائی سکول نمبرا اور ایڈورڈز کالج میں مجھ سے ایک سال پیچھے تھے۔1966ء سے لے کر

1971ء وہ خیبر میڈیکل کالج میں میرا کلاس فیلو رہا۔اس دوران منیر اقبال کے ساتھ میرے کافی قریبی اور اچھے تعلقات رہے۔ چند واقعات کا ذکر کیا جائے تو خوب رہے گا۔ میں فرسٹ ایئر ایم بی بی ایس میں کلاس ری پرزینٹیٹو شپ اور لیڈرشپ کے حوالے سے اساتذہ اور طلباء میں غیر معروف تھا۔اُس زمانے میں مجھے چند طلباء جن میں منیر اقبال شامل تھے نے خوش آمدید کہا۔منیر اقبال اورایک دوسرے طالب علم کے علاوہ اس ٹیبل پر ہمارے ساتھ دیگر تمام طالبات جن میں پروین، زینت، ہاجرہ اورشاہدہ درانی شامل تھیں۔واقعہ یوں ہے کہ اُس سال پہلی مرتبہ طلباء اور طالبات کو(Disection) ٹیبلوں پر جدا جدا متعین کر دیا گیا تھا۔طلباء کا یہ خیال تھا کہ لڑکوں کی ٹیبل پر مرد لیکچررز (Demonstrators) توجہ نہیں دیتے۔لہٰذا اس سلسلے میں احتجاج کرنا چاہیئے تاکہ طلباء اور طالبات کے پہلے کی طرح مکس گروپ بن جائیں۔میں بطور لیڈر اس بات کو لے کر آگے بڑھ گیا۔اسی دوران کسی نے ایک خط اناٹومی کے ہیڈ آف ڈپارٹمنٹ پروفیسر طاہر حسن کو لکھا۔اس خط نے بڑی ہلچل مچادی۔اساتذہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ یہ خط کس نے لکھا ہے؟ اسسٹنٹ پروفیسر افضل نے آٹھ لڑکوں کے گروپ جس میں منیر اقبال بھی شامل تھے کو بلوایا۔انہوں نے ہمیں اردو ہینڈ رائیٹنگ میں لکھنے کو کہا۔منیر اقبال اُن کے محلے میں رہتا تھا اور ڈبل ڈیکر بس میں بھی اُن کے ہمراہ آیا جایا کرتا تھا۔لہٰذا اُس کی جان بخشی ہوگئی۔اس کے بعد دیگر طلباء نے بھی کچھ لکھا اور وہ بھی معاف ہو گئے یا غالباً ان کو لکھنے کی مہلت ہی نہیں ملی کیونکہ میرے لکھے ہوئے خط سے متعلق افضل صاحب نے یہ کہا کہ خط کی لکھائی اور طارق سعید مفتی کے خط کی لکھائی ایک جیسی ہے۔اور اس بناء پر میں معتوب ٹھہرا دیا گیا کہ یہ خط میں نے ہی لکھا ہے۔جب کہ حقیقتاً خط میں نے نہیں لکھا تھا۔ میں نے بہت یقین دہانی کی کوشش بھی کی۔اس بناء پر طاہر حسن صاحب نے اس حد تک کہا تھا کہ اللہ کی قسم آپ پاس نہیں ہو سکتے!۔میں سارا سال پریشانی میں رہا۔

ایک دن منیر اقبال اور میں نے مل کر فیصلہ کیا کہ ہم طاہر صاحب کے گھر جاتے ہیں، سنا ہے کہ

وہ گھر میں لوگوں کو بڑے اچھے طریقے سے ملتے ہیں اور اُن کی بہت قدر بھی کرتے ہیں۔یہی تجویز مجھے ہماری ایک کلاس فیلو تسنیم جو شادی شدہ تھی اور ایک ائیر فورس افسر کی اہلیہ تھیں ان کے والد ونگ کمانڈر برکت بھی ان دنوں پشاور میں تعینات تھے نے بھی دی۔ میں اور منیر اقبال ایک شام پیدل طاہر حسن صاحب کے گھر کی طرف نکل پڑے۔یہ زرعی یونیورسٹی کے قریب کھیتوں کے درمیان ایک کچے راستے سے گزر کر واقع تھا۔ہم طاہر حسن صاحب کے گھر پہنچ گئے۔گھر میں کام کرنے والی ایک خاتون باہر آئی ہم نے اُس سے پوچھا تو اُس نے کہا کہ صاحب لان میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ہم نے ادب سے سلام کیا اور اپنا نام اور شناخت بتائی۔تو وہ ہمیں لے کر ڈرائنگ روم میں چلے گئے۔ہم ڈرائنگ روم میں گئے ہی تھے تو منیر اقبال نے ہنسنا شروع کر دیا۔اُس کے ساتھ مجھے بھی ہنسی آ گئی۔ہماری ہنسی رک نہیں پا رہی تھی اور بار بار پروفیسر طاہر حسن صاحب حیرت سے پوچھ رہے تھے کہ کیوں ہنس رہے ہو۔ہمیں سمجھ نہیں آئی کہ ہم کیا بتائیں آخر کار ہم سنبھل گئے۔میز پر پڑے ہوئے ڈرائی فروٹ میں سے منیر اقبال نے ایک سخت بادام جسے باٹا بادام کہتے ہیں۔اپنے دانتوں کے نیچے زور سے پکڑ لیا تا کہ اُس کے ہنسی رکے۔اس موقع پر طاہر حسن صاحب بڑی سنجیدگی منیر سے کہا کہ منیر یہ بادام اس طرح نہیں ٹوٹے گا۔بادام توڑنے والے فورک سے اس کو توڑو۔اُس کو نٹ کریکر کہتے ہیں۔

ہم نے بمشکل طاہر حسن صاحب کے سامنے اپنی گزارش پیش کی۔میں نے اپنے کاپی میں لکھی ہوئی اردو اُن کے سامنے رکھ دیا اور کہا کہ جی آپ اُس خط اور اِس خط کو دیکھ لیں ان میں کوئی مماثلت نہیں غالباً انہیں واقعہ بھول بھی گیا تھا یا اُن کیلئے اس کی اہمیت نہ تھی۔انہوں نے مجھے کہا کہ جاؤ تم پاس ہو جاؤ گے اور اس طرح ہم واپس آ گئے۔منیر اقبال کا میرے ساتھ یہ تعاون مجھے ہمیشہ یاد رہے گا۔منیر اقبال نے ناصر الدین اعظم خان کے ساتھ ہاؤس جاب کیا اور میرے ہاؤس جاب کے بعد کچھ عرصہ طارق نشتر کے ساتھ میڈیکل آفیسر کی جاب کی۔بعد میں بچوں کے شعبہ میں ایم سی پی ایس کر کے سینئر رجسٹرار رہے۔

اُسی عہدے سے ریٹائرڈ ہوئے۔ آج کل یکہ توت گیٹ کے اندر ملک تاج کے گھر کے نیچے مصروف کلینک کرتے ہیں۔ میری ان سے آخری ملاقات چند دن پہلے ان کے گھر میں ہوئی جہاں ہم نے ان تمام قصوں پر تبادلہ خیال بھی کیا اور میں نے اپنی یاداشتوں کے حوالے سے انہیں شائع کرنے کی اجازت لی جوانہون نے بخوشی دے دی۔

نجم الہادی (کرنل ریٹائرڈ):۔

ہمارے سکندر پورہ والے گھر سے کچھ فاصلے پر وکیل انکم ٹیکس نورالہادی کا خاندان آباد تھا۔اُن کے بچوں میں سے ڈاکٹر شمس الہادی، بریگیڈیئر ریٹائرڈ سعد الہادی جو آجکل امریکہ میں مقیم ہیں، کرنل ریٹائرڈ نجم الہادی، عین الہادی جو کراچی میں رہائش پزیر ہیں اور فیض الہادی شامل تھے۔اُن کے بالکل سامنے والے گھر میں امامت، عبادت، صباحت حسین (جو لیفٹننٹ جرنل کے عہدے سے ریٹائر ہوئے) اور ہم میں سے دو بھائی یعنی میں اور خالد سعید کا ایک بڑا گروپ تھا (ماسوائے ڈاکٹر شمس الہادی کے جو برطانیہ جا چکے تھے)۔ اکثر ہم ہادی برادران کے گھر میں ملتے۔نجم الہادی سے میری انڈرسٹینڈنگ زیادہ تھی اور اب تک بہت اچھا رابطہ قائم ہے۔سعد الہادی موسیقی اور گانے کے شوقین تھے اُن سے میں نے اور میرے بھائی نے بینجو بجانا سیکھا۔ بڑے خوش گفتار انسان ہیں۔ فوج کے علاوہ اُنہوں نے گانے بجانے کی محافل اور ٹیلی ویژن میں بھی اپنا نام کمایا وہ مختلف موضوعات پر لیکچر دینے میں بھی مشہور رہیں۔نجم الہادی سے سکول کالج کے کافی عرصہ بعد تک ملاقات نہ ہوسکی۔

1991ء میں میرے بھائی کی لاہور میں اچانک وفات کے موقع پر اُنہوں نے ایمرجنسی حالات سنبھالے اور میت کو ایمبولینس میں پشاور کیلئے روانہ بھی کیا جو ہمارے لئے ناقال فراموش ہے۔ ریٹائرمنٹ کے کچھ عرصہ بعد ایبٹ آباد میں بسلسلہ پرائیویٹ سروس مقیم تھے اور اکثر گپ شپ رہتی تھی۔ پشاور میں آرمی فلیٹس میں بھی کچھ عرصہ رہے اور اب کافی عرصے سے اسلام آباد میں مقیم ہیں۔ان کا بیٹا

ذکریا میرے بیٹے سعد کا برن ہال سکول میں دوست تھا۔ دونوں خاموش طبع تھے۔ ایک بار اس نے والد کو بتایا کہ میں نے اور سعد نے آج سارا دن بڑا انجوائے کیا۔ نجم نے پوچھا وہ کیسے تو اُس نے کہا کہ ہم کالج کے اندر واقع پہاڑی پر گئے اور گھنٹوں بیٹھے رہے۔ پوچھا کیا بات چیت ہوئی؟ اس نے کہا بات تو کچھ بھی نہیں ہوئی صرف بیٹھے رہے۔ نجم الہادی پچھلے کئی سال سے رحمان میڈیکل کالج میں ہمارے لئے موٹی ویشنل سپیکر کا بندوبست بھی کرتے رہے۔ ہادی برادران بہت ذہین اور بات چیت میں کمال کی مہارت رکھتے ہیں۔ نجم الہادی بھی ایسا ہی ہے۔ اسلام آباد میں ادبی محفلوں میں شامل ہونا اور واٹس ایپ پر رنگ برنگے میسج فارورڈ کرنا اُس کا مرغوب مشغلہ ہے۔

اصغرعلی شاہ المعروف ''میر جی'':۔

سکول اور کالج کے زمانے میں، میں ایبٹ آباد اپنی خالہ کے گھر گرمی کے موسم میں جایا کرتا تھا۔ وہاں میرے خالو کچھ عرصہ وہاں کے تحصیل دار رہے۔ اُس زمانے میں میری ممانی کے بھائی سہیل کاکڑ اور اُن کا قریبی دوست پرویز ترین پولیس میں اے ایس آئی کی حیثیت سے ایبٹ آباد میں تعینات تھے۔ وہاں میری ملاقات اصغر علی شاہ (میر جی) جو پرویز کے مہمان تھے سے ہوئی۔ کچھ دن ملاقاتیں رہیں۔ پشاور آنے پر بھی رابطہ مسلسل جاری رہا۔ اگرچہ عمر میں مجھ سے دو تین برس بڑے تھے مگر جلد ہی ہمیں ایک دوسرے سے انس ہو گیا۔ مجھے اکثر وہ اپنا چھوٹا بھائی کہتے اور دوسروں سے تعارف بھی اسی حوالے سے کرواتے۔ ہمارا ایک مشترکہ دوست خورشید رؤف تھا اور میر جی جن کو ہمارے گھر میں آغا جی بھی کہتے تھے کے مزید دوستوں میں حاجی مختیار جان اور محمد حسین حسینی شامل تھے۔ اتفاق سے محمد حسین حسینی کی والدہ میری دادی کی رشتہ دار بھی تھیں۔ جب رشتہ داری کا پتہ چلا تو میرا محمد حسین حسینی کے گھر میں بطور گھریلو فرد جانا عام ہو گیا کیونکہ ان کی والدہ مجھ پر خاص مہربان ہو گئی تھیں اور یوں یہ چار پانچ دوستوں کی ٹولی فرسٹ ایئر ایڈورڈز کالج سے لے کر تمام عمر تک چلتی رہی۔ محمد حسین حسینی انتقال کر چکے ہیں۔

اصغر علی شاہ کے والد سید محمود شاہ ریتی بازار پشاور کے رہائشی اور ایک ممتاز علمی شخصیت تھے، میں نے انہیں ہمیشہ گھر کی بیٹھک جو اُن کی رہائش اور لائبریری بھی تھی میں ہی موجود پایا ہر شام اُن کا حلقہ احباب یہیں بیٹھ کر مذہبی بحث کرتا۔ اُن کی کتابوں سے جڑی ہوئی الماریوں میں سے کتابیں نکالتے اور پڑھ پڑھ کر سناتے۔ کئی دفعہ جب میر جی نہ ہوتے تو مجھے ان کے والد کی محفل میں بیٹھنا پڑتا وہ میرے لئے قہوے کے پیالی پیش کرتے۔ گویا یوں سینکڑوں بار اُن کی محفلوں میں بادل نخواستہ علمی گفت گو سے سرفراز ہونا پڑا۔ کئی بار اصغر علی شاہ نیچے آ کر مجھے ریسکیو کر کے لے جاتے۔ وقت کے ساتھ تعلقات کی گہرائی بڑھتی گئی۔ ہمارے پانچ دوستوں کی دوستی مضبوط ہوتی چلی گئی۔ کبھی کبھار دوستوں کی تعداد میں اضافہ بھی ہو جاتا جن میں میرا بھائی خالد سعید اور اُس کے دوست صلاح الدین اور انکے چھوٹے بھائی نذیر مرحوم بھی شامل ہو جاتے۔ انہی دنوں میرے پھوپھی زاد لالا اقبال مرحوم نے بھی ان محفلوں میں آنا جانا شروع کیا جن کی موجودگی سے رات بھر تاش بازی، قہوہ اور سگریٹ کے دور چلتے۔ قہقہے، قصے اور کہانیاں بھی ہوتیں۔

ہم سب کے گھر والے ان محفلوں سے پریشان بھی ہوتے لیکن سب ایک لحاظ سے مطمئن بھی تھے کہ ہم کسی اخلاقی برائی کے مرتکب نہیں ہو رہے تھے۔ آہستہ آہستہ گھروں میں آنا جانا معمول بن گیا اور ہم سب ایک دوسرے کے گھروں میں بھائی بیٹوں کی طرح ہو گئے۔ اس گروپ میں مختیار جان جو آجکل حاجی مختیار ہیں سب سے پہلے برسر روزگار ہو گئے۔ انہوں نے میٹرک کے بعد تعلیم چھوڑ دی اور ٹھیکے داری کرنے لگے۔ کئی بار ہم سب اکھٹے ہوتے اور وہ کھلاتے پلاتے۔ سال دو بعد اصغر علی شاہ میڈیکل ریپ بن کر اچھے خاصے پیسے کمانے لگے۔ اس طرح ہماری محفل میں پیسوں کی کمی کبھی محسوس نہ ہوئی۔ موقع اور وقت کی مناسبت سے ہم دو یا تین دوست اکھٹے ٹوور کرتے۔

1965ء میں میں اور اصغر علی شاہ نے ایک تاریخی دورہ بنوں و میران شاہ کا کیا۔ میران شاہ میں اصغر علی شاہ کے ایک کزن ایف سی کمانڈنٹ تھے اور محمد حسین حسینی کے بھائی سرحدی صاحب بنوں میں

بزنس کرتے تھے۔بنوں پہنچے ہماری رہائش ایف سی ریسٹ ہاؤس میں تھی۔اُسی زمانے میں یا کچھ پہلے 'فقیر اپی (مرزا علی خان)' کی حکومت پاکستان کے خلاف مہم جوئی ہوئی جسے فوج نے کچل دیا تھا لیکن پھر بھی حالات خاصے مخدوش تھے۔ہم فوج کے کانوائے میں میران شاہ کیلئے روانہ ہوئے۔راستے میں جگہ جگہ ہمیں کہا جاتا کہ "سر نیچے کرلو کیونکہ یہاں پر وزیر قبائل کا حملہ اچانک ہوسکتا ہے"۔ہم میں خوف بڑھتا چلا گیا لیکن خیریت سے میران شاہ پہنچ گئے۔میران شاہ پہنچ کر بہترین کھانا کھایا اور اُسکے بعد ہماری استدعا پر نہ چاہتے ہوئے بھی کمانڈنٹ نے بیس،پچیس ایف سی کے جوانوں کی حفاظت میں میران شاہ بازار گھومنے کی اجازت دے دی۔ہمیں محسوس ہوا کہ بازار میں تمام لوگ ہماری جسامت سے بہت بڑے بڑے تھے۔ ایک خاص شخص جو ڈیل ڈول میں باقی سب سے اونچا لمبا،آنکھوں میں سرخی لئے ہمیں آگے بڑھ کر ملا اور ہاتھ ملایا اُس کے ہاتھ بڑے اور مضبوط تھے مجھے میرا ہاتھ اُس کے ہاتھ کے مقابلے میں بہت چھوٹا لگا۔یا ہوسکتا ہے کہ خوف کی وجہ سے ہم اُنکی جسامت کو زیادہ بڑا محسوس کر رہے ہوں۔ بہر حال تمام مقامی لوگوں نے اسلحہ سینے سے سجا رکھا تھا۔

خوب لطف اٹھانے کے بعد سہ پہر ہم واپس فوجی کانوائے کے حصار میں بنوں پہنچ گئے۔شام کو سرحدی صاحب کے گھر کھانا تھا ہم نے کہا تھوڑی دیر سو جاتے ہیں۔ریسٹ ہاؤس کے کمرے میں دو چارپائیوں پر ہم سو گئے۔ مجھے محسوس ہوا کہ میران شاہ میں وہ شخص جس نے میرے ساتھ ہاتھ ملایا تھا مجھ پر خنجر سے حملہ آور ہوا ہے اور میں کھڑا ہوں اور وہ میرے پاؤں کے اُوپر حملہ کرنا چاہتا ہے۔میں نے زور سے اسے لات ماری اور اس کے منہ سے خون جاری ہوگیا وہ بھاگنے لگا اور میں نے اُس کے پیچھے چیختے چلاتے بھاگنا شروع کیا۔میری اچانک آنکھ کھلی تو پتہ چلا کہ اصغر علی شاہ مجھے جگانے کیلئے میرے پاؤں کی انگلیوں کو ہلا رہا تھا اور اس دوران میں خواب دیکھ رہا تھا۔لات دراصل میں نے اسے ماری اور اس کے منہ کے اُوپر زخم آیا جس سے خون بہہ رہا تھا وہ باہر گیلری میں دوڑ رہا تھا اور میں اُسکے پیچھے۔نیچے میدان میں سپاہی بہت

تشویش سے ہمیں دیکھ رہے تھے۔ بہر حال جلد ہی ہم نے خود کو سنبھال لیا۔ اصغر علی شاہ کو ہسپتال لے جایا گیا جہاں اسے ٹانکے لگے۔ بعد میں ہم سرحدی صاحب کے گھر کھانے پر بھی پہنچ گئے۔ دیسی روسٹ مرغیوں کا بہت ہی ذائقہ دار کھانا خوب جی بھر کے کھایا۔ اس واقعے کا اثر یہ ہوا کہ فوراً بعد کوہاٹ میں ہم نے ایک رات رہنا تھا جب ہم وہاں پہنچے تو ہمارے میزبانوں کو غالباً اصغر علی شاہ نے پہلے سے ہی کہا ہوا تھا کہ اُس کی چارپائی کمرے سے باہر ڈال دیں۔ کیونکہ نیند میں مجھ سے کچھ بھی توقع کی جا سکتی ہے۔ خوف کا یہ عالم بہت عرصہ رہا۔

بنوں شہر اُس وقت صاف ستھرا ہوا کرتا تھا۔ نالیاں پکی اور ان میں صاف پانی بہتا تھا۔ یہ شہر تاریخی طور پر انگریزوں نے ماضی کے لائل پور اور آج کل کے فیصل آباد کی طرز پر تعمیر کیا تھا۔ اس لئے اس کی گلیاں اور بازار کشادہ تھے اور شہر خوبصورت۔ ہم نے بنوں کی سیر کرتے ہوئے بازار میں پھولوں کے ہار پہنے، ڈھول تماشے کے درمیان ایک نوجوان کی شادی بھی دیکھی۔ بنوں شہر انگریزوں نے آباد کیا اور یہ افغان بارڈر کے قبائل کے خلاف انگریز ملیشیاء کا مرکز تھا۔ اسے 1848ء میں ایسٹ انڈیا کی فوج کے ایک لیفٹننٹ ہربرٹ ایڈورڈز نے دلیپ گڑھ کا قلعہ تعمیر کروایا اور یہ شہر بسایا۔ دلیپ مہاراجہ کا تعلق لاہور سے تھا۔ تب اس شہر کا نام دلیپ نگر تھا جو بعد میں ایڈورڈز آباد ہوا اور 1903ء میں اس کا نام بنوں ہو گیا۔ 1900ء کے ارد گرد اس کی آبادی 14-15 ہزار تھی۔ ہندکو زیادہ بولی جاتی تھی۔ ہندو یہاں کافی آباد ہوئے جس کے نتیجہ میں اس شہر میں پشاور و کوہاٹ کی طرح دونوں زبانیں یعنی پشتو و ہندکو بولی جانے لگیں۔ اب وہاں مقامی پشتو زبان جسے بنوسی کہا جاتا ہے بولی جاتی ہے۔ 1865ء میں یہاں پہلا سکول بنایا گیا۔ جو غالباً مشنری تھا۔ (یہ معلومات اس وقت کے ایف سی کے حوالے سے میری ڈائری میں لکھی تھیں جو نقل کر دیں)

لالا اقبال اپنی ملازمت کی وجہ سے پاڑا چنار سے چند میل پہلے آنے والے شہر صدہ میں رہا کرتے تھے۔ میں اور اصغر علی شاہ اُن کے ہاں گئے۔ اصغر علی شاہ اپنے کاروباری سلسلے میں اس علاقے کو

اہم سمجھتے تھے۔ کیونکہ لالا اقبال میڈیکل پریکٹیشنرز اور ڈاکٹروں سے خاصا قریبی تعلق رکھتے تھے۔ رات کو محفل بھی لگی، تاش کھیلنے کیلئے چوتھا پارٹنر ہونا ضروری ہوتا ہے اُنھوں نے اپنی بیگم کو سونے نہیں دیا اور کہا کہ چائے بھی بناتی رہو اور ہمارے ساتھ تاش کے پتے بھی کھیلو۔ دوسرے دن دریائے کرم پر ہم لالا اقبال کے بچوں کو ساتھ لے کر پکنک منانے گئے۔ پانی گہرا تو نہیں تھا پتھر نظر آرہے تھے لیکن تیز تھا۔ گاؤں کے چھوٹے چھوٹے بچے اس پانی کو کراس کر لیتے تھے۔ ہم پانی میں نہیں جا رہے تھے۔ میں ذرا اُوپر تک گیا اور مجھے بچوں نے غیرت دلائی کہ آؤ نا پانی کراس کرو۔ میں غیرت میں آ گیا اور آہستہ آہستہ پانی کراس کرنے لگا کہ اچانک ایک پتھر پہ میرا پاؤں پھسلا اور پانی مجھے بہا لے گیا۔ میرا سر پتھروں سے ٹکرا رہا اور میں لڑھک رہا تھا۔ اصغر علی شاہ نے مجھے ڈوبتے ہوئے دیکھا تو پانی میں چھلانگ لگا دی اور میری ٹانگ پکڑ کر گھسیٹ لیا۔ پانی سے نکل کر میری طبیعت سنبھلنے میں کچھ دیر لگی۔ بعد میں لالا اقبال کو پتہ چلا تو وہ بہت خفا ہوئے کیونکہ یہ پانی بہاؤ کے باعث بہت ہی خطرناک تھا۔

اُنہی دنوں اصغر علی شاہ نے سوزوکی موٹر سائیکل 125 سی سی خریدی۔ جس پر ہم سب رائیڈنگ کی پریکٹس کرتے۔ ایک بار مارچ کے مہینے میں اصغر علی شاہ اور میرا پروگرام بنا کہ ایبٹ آباد موٹر سائیکل پر جاتے ہیں۔ وہاں میرے خالو سعید احمد خان تحصیلدار تھے اور ہم نے اُن کے ہاں جا کے رہنا تھا۔ اپنے گھروں میں ہم نے جھوٹ بولا کہ ہم جی ٹی ایس بس کے ذریعے جا رہے ہیں۔ صبح 7 بجے مارچ کے مہینے میں جب کہ خاصی سردی تھی ہم پشاور سے موٹر سائیکل پر روانہ ہوئے۔ میں پیچھے بیٹھا تھا۔ سردی کی وجہ سے چونکہ سڑک پر پھسلن تھی پبی کے قریب ایک دوبار موٹر سائیکل غیر متوازن ہوئی۔ میں نے میر جی کو کہا کہ ایسا لگتا ہے کہ ہم کہیں گر نہ جائیں اور اسی اثناء میں ہماری موٹر سائیکل پھسل گئی ہم سڑک کے اوپر پھسلتے جا رہے تھے کافی دیر کے بعد جب ہم رکے تو دیر تک اُسی طرح بغیر ہلے جلے پڑے ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے کہ کیا ہماری ٹانگیں ٹوٹ گئی ہیں؟ کیا ہم اُٹھ کھڑے ہوسکیں گے یا نہیں؟ آخر ہمت کر کے

ہم اٹھے، ٹانگوں پر گہرے زخم آئے تھے اور زخموں سے خون بہہ رہا تھا لیکن ہمت کر کے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ شکر ہے کہ ہڈی نہیں ٹوٹی۔ موٹر سائیکل اُٹھایا جو ٹیڑھا ہو گیا تھا، آس پاس کوئی بندہ بشر نہ تھا۔ سر پکڑ کر بیٹھ گئے کہ کیا کریں واپس جائیں تو شرمندگی کا سامنا کرنا پڑے گا کیونکہ گھر جھوٹ بول کر آئے تھے۔ اس لئے گھر واپس جانے کا کا ارادہ ترک کر دیا۔ موٹر سائیکل کا ہینڈل اور پہیہ سیدھا کیا، کک لگائی تو موٹر سائیکل سٹارٹ ہو گئی۔ اسی حالت میں آہستہ آہستہ چلاتے ہوئے نوشہرہ پہنچ گئے۔ نوشہرہ کے ہسپتال میں میاں اصغر علی شاہ اپنے کام کے سلسلے میں آتے رہتے تھے۔ ہم نے تھوڑی بہت فرسٹ ایڈ لی اور موٹر سائیکل بھی ٹھیک کروائی۔ پھر سے دوبارہ آگے چل پڑے اور اٹک شہر میں رکے۔ جہاں پولیس تھانہ میں کسی حادثہ کے سلسلے میں اصغر علی شاہ نے حاضری لگوانا تھی۔ وہاں سے پھر موٹر سائیکل دبایا اور ایبٹ آباد پہنچ گئے۔ میرے خالو گھر کے باہر تحصیل کے بڑے صحن میں بیٹھے تھے۔ شام ہو گئی تھی پہلی نظر میں اُنہوں نے دیکھ کر مجھے کہا ''ٹیپو لگتا ہے ایکسیڈنٹ کیا ہے''۔ اور ہمیں ساری کہانی سنانا پڑی اگلے دو دن ایک دوسرے کی مرحم پٹی کرتے گزرے۔

اصغر علی شاہ کی شادی ان کی کزن سے ہوئی جو آغا سید چراغ شاہ کی بیٹی ہیں۔ ان کا نام حمیدہ بیگم ہے جنہیں اصغر علی شاہ، حمید خان بھی کہتے تھے۔ اگرچہ ہماری عمر کی تھیں مگر وہ عام لڑکیوں کی نسبت بہت پختہ ذہن کی مالک تھیں۔ ہم سب دوستوں کی اپنے گھر میں ہلڑ بازی خوشدلی سے برداشت کرتیں۔ خوب مزے مزے کے کھانے پکاتیں۔ ہمیں جلد ہی یہ محسوس ہو گیا کہ وہ ہماری سگی بہنوں جیسی ہیں۔ اُن کی قدر میرے دل میں آج بھی پہلے دن کی طرح ہے۔ چند سال یہ فیملی کویت میں رہی۔ کویت سے پاکستان واپس آنے پر یہ ہمارے پاس ایبٹ آباد میں کچھ دن آ کے رہے۔ بہت ہی خوشگوار وقت گزرا اور مجھے پہلی بار پتہ چلا کہ بہن حمیدہ بیگم ایک بہت اچھی الیکٹریشن بھی ہیں۔ اُنہوں نے ہماری واشنگ مشین کو جھٹ پٹ ٹھیک کر دیا۔ ان کے مشورے سے ہم نے قیمے کی الیکٹرک مشین بھی بنوائی جس کے بعد گھر میں

قیمہ بنانے لگے۔ یہ مشین آج بھی موجود ہے۔ حال ہی میں ہم نے اسے اشفاق مفتی کو تحفے میں دے دیا ہے۔ بعد میں اصغرعلی شاہ اوراُن کی بیگم بمعہ ایک بیٹی امریکہ چلے گئے، دو بیٹیوں کی شادیاں ہوگئیں۔ اب یہ بھی حسن اتفاق ہے کہ اُن کے دونوں دامادوں کا نام بھی اصغر ہے۔ اُن کا چھوٹا بیٹا علی عباس میرے پاس ایبٹ آباد آیا جہاں میں نے اُسے میٹرک میں داخل کروادیا۔ وہ کم وبیش ایک سال ہمارے گھر رہا۔ میرے بیٹے باسل کے ساتھ کمرے میں اکھٹے رہتا تھا۔ پرندوں اور جانوروں کا شوقین تھا اور اُس نے کبوتر بھی پال رکھے تھے۔ بہت ملنسار تھا۔ ہمیں اکثر یاد آتا ہے اوراس کی باتیں کرتے ہیں۔ آج کل وہ امریکہ میں مقیم ہے۔ اصغرعلی شاہ کے دونوں بیٹے بعد میں امریکہ جانے میں کامیاب ہوگئے تھے۔

میں اور میری بیگم جب 1990ء میں امریکہ گئے تو نیویارک میں اُن کے گھر پر رہے تھے۔ کئی سالوں کی دوری اور میری ٹیلیفون نہ کرنے کی سستی نے ہمیں قدرے دور کردیا ہے۔ اب کوئی خاص رابطہ تونہیں مگر دل کے قریب رہنے والوں کی یادیں کبھی بھلائی نہیں جاسکتیں مجھے معلوم ہے کہ امریکہ میں اصغرعلی شاہ ملنے والوں اورنئی نسل کو ہمارے بچپن اور جوانی کے قصے خوب دلچسپی سے سناتے ہیں۔ میری زندگی کی حسین ترین یادیں اُن کے ساتھ منسلک ہیں۔ میرا خالہ زاد اصغرجوان کا داماد بھی ہے ہمراہ فیملی نیو جرسی منتقل ہوگئے ہیں۔ پاکستان میں صرف ایک داماد اصغر اپنی فیملی کے ساتھ مقیم ہے۔ پچھلے چند سال میں ہم تمام عمر رسیدہ دوستوں کی طرح اصغرعلی شاہ نے بھی چند ایک بار اپنے آپ کو بیماریوں کے بعد اوورال کرایا ہے۔ حال ہی میں اُن کا بائی پاس ہوا اور کافی تکلیف میں رہے۔ آج کل سنا ہے بہتر ہیں۔ کبھی کبھی اپنی اس دوست کی یاد مجھے اس شدت سے آتی ہے کہ بقول شاعر:

یقین تھا کہ کوئی سانحہ گزرنا ہے
گماں نہ تھا کہ تیرا ساتھ چھوٹ جائے گا

حاجی مختیار احمد جان:۔

مختیار جان المعروف ''ماما'' جو حج کرنے کے بعد صرف ''حاجی مختیار'' کے نام سے پہچانے جاتے ہیں۔ میری پہلی ملاقات ان سے اصغر علی شاہ کے توسط سے ہوئی۔ غالباً اُس زمانے میں وہ لاہوری دروازہ پشاور میں میونسپل کمیٹی کا کوئی کام ٹھیکے پر تعمیر کر رہا تھا۔ اُس نے ہماری تواضع تکے، کباب وقہوہ سے کی پھر اُس کے بعد یہ تعلقات ایک گروپ کی صورت میں بمعہ دیگر احباب آگے بڑھتے رہے۔ اکثر وبیشتر محلہ ریتی میں اصغر علی شاہ کے گھر کے سامنے تختوں ''تھڑوں' پر رات کو دیر تک سگریٹ کے کشوں کی آڑ میں گپ شپ چلتی۔ کبھی میر جی کے گھر کے اندر نچلی منزل میں محفل گرم ہوتی اور کبھی کبھار حاجی مختیار کے گھر واقع محلہ میر جمال شاہ اندرون یکہ توت میں جس کا ایک راستہ مینا بازار سے بھی جاتا ہے۔ حاجی مختیار کے سب سے بڑے بھائی غلام جعفر بہت شُستہ انسان تھے اُن سے اکثر گپ شپ رہتی۔ بہت بعد میں وہ دل کی ایک خصوصی کینسر نما گلٹی کی وجہ سے بیمار رہے اور جوانی میں فوت ہو گئے۔ اُن کا خوبصورت مسکراہٹ والا چہرہ آج بھی نظروں کے سامنے آتا ہے۔

حاجی مختیار جو ہمیشہ سے اپنے اندر ایک فلسفیانہ ذہن رکھتا تھا پڑھے لکھے لوگوں میں اٹھنا بیٹھنا بہت پسند کرتا تھا۔ بچپن کی شرارتوں میں سے ایک شرارت ایسی ہے کہ ہم مختیار کے گھر ایک سائنسی تجربہ کر رہے تھے اور کسی جڑی بوٹی کو کشید رہے تھے۔ یہ شوق مختیار کا تھا کہ اسی اثناء شوکت رؤف مرحوم (شوکت جان جو کہ بعد میں پاکستان ٹی وی کے جنرل مینجر اور ڈائریکٹر بھی رہے) نے کشیدگی کے دوران شیشے کے مرتبان کو حرکت دی ہی تھی کہ دھماکہ ہو گیا اور دھواں سارے کمرے بلکہ سارے محلے میں پھیل گیا۔ شوکت جان بھی جل گیا لیکن خیر ہو گئی زخم زیادہ گہرے نہیں تھے۔ اُس دن کے بعد سے ہم نے سائنسی تجربات بند کر دیئے۔ شوکت جان، خورشید رؤف کے بڑے بھائی تھے۔ اُس زمانے میں مختیار جان قدرے لمبی اور پتلی جسامت کے تھے۔ شلوار قمیص ہی پہنتے تھے اور علاقے میں خوب پہچانے جاتے تھے۔ ہاں البتہ کبھی

کبھار بہت سنجیدہ ہوتے تو سامنے آنے والے ہر شخص کو جلی کٹی سنا دیتے۔ ساتھ ہی خفا بھی ہو جاتے اور اپنی خفگی ہر صورت میں جائز ثابت کرتے۔ یہ عادت اُن کی آج تک قائم ہے لیکن ہم تمام دوست اس بات کو مانتے ہیں کہ اُن کی خفگی اکثر جائز ہوتی ہے اور کسی نے بھی اُس کا برا نہیں منایا ہر صورت میں انہیں راضی رکھنے میں کامیاب ہوتے۔

کچھ عرصہ ٹھیکیداری کے بعد یہاں حالات سازگار نہ ہونے کے بناء پر وہ کراچی چلے گئے۔ کراچی میں ہمدرد لیبارٹری میں ملازمت کر لی اور چونکہ شوکت رؤف اُن دنوں پاکستان ٹیلی ویژن کراچی میں ہوتے تھے لہٰذا اُن کے توسط سے ٹی وی کے مقتدر پروڈیوسروں اور دیگر سینئیر لوگوں سے دوستی ہو گئی، خوب محفلیں جمتیں اور ان کے بارے میں قصے مزے لے لے کر ہمیں سناتے۔ 1969ء میں ہمارے کلاس ک فیلوز کو سول ہسپتال کراچی جانا پڑا۔ ٹرین کا سفر تھا۔ میرے ہمراہ چنگیز حکیم اور اشفاق احمد جو آج کل امریکہ میں مقیم ہیں بھی تھے۔ چنگیز حکیم اور میں چنگیز کے والد کے توسط سے کے۔ ٹو سگریٹ کے مالک کے ایک وسیع گھر کے مہمان خانے میں شروع کے دو تین دن مقیم رہے۔ اگر چہ رہائش شاندار تھی مگر ہاسٹل کی دوری کی وجہ سے ہم وہاں زیادہ دن نہ ٹھہر سکے اور باقی ساتھیوں کے ساتھ ہاسٹل میں منتقل ہو گئے۔

اس دور میں حاجی مختیار اکثر ہمارے پاس آ پہنچتے اور محفل سج جاتی ، الفی یعنی Alfinston موجودہ زیب النساء سٹریٹ گھومنے چلے جاتے چونکہ اُس وقت تک کلب اور لائسنس یافتہ شراب خانوں پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ لہٰذا ہم ایک شام مشہور کلب ایکسیلسیئر پہنچ گئے۔ ٹکٹ کی ایڈوانس بکنگ میں ڈنر کی پیش کش بھی تھی۔ ہمارے اردگرد تمام میزوں پر لوگوں کی بڑی تعداد تھی البتہ ساتھ والے ٹیبل پر Reserve لکھا تھا جو خالی تھی۔ پروگرام شروع ہوا اور ساتھ کھانا بھی شروع ہو گیا، روشنیاں مدھم ہو گئیں۔ کچھ لوگ ہمارے ساتھ والی خالی ٹیبل پر آ بیٹھے۔ اُن میں ایک مشہور شخصیت بھی تھی جنہیں میں اور مختیار بخوبی جانتے تھے۔ اکثر پشاور تشریف لاتے اور لوگوں کے ہجوم کو متاثر کرتے۔ میں نے مختیار کو کہنی ماری

اور آہستہ سے توجہ دلاؤ نوٹس دیا۔ وہ بھی انہیں دیکھ کر حیران ہوئے۔ یوں رات گئی بات گئی۔مختیار نے بعد میں فیصل آباد ٹیکسٹائل ملز میں بھی کچھ عرصہ ملازمت کی۔

میرے انگلینڈ جانے کے بعد سال 1973ء میں حاجی مختیار اور ڈاکٹر ہمایون شارجہ چلے گئے جہاں حاجی مختیار نے سونے کے کاروبار میں نوکری اختیار کرلی۔ چونکہ وہ ہرفن مولا تھا۔ پاکستان میں بھی اس نے سونے کا کام کیا ہوا تھا جس کا شارجہ میں فائدہ اٹھایا چندسال تک وہاں قیام کے بعد واپس پاکستان آ گیا۔ جب میں انگلینڈ میں تھا تو مجھے احساس ہوا کہ اگر مختیار جان انگلینڈ آ جاتا اس کے وارے نیارے ہو جاتے! کیوں اس سوال کا جواب رہنے ہی دیں تو بہتر ہوگا۔جب میری انگلینڈ سے 1979ء کے آخر میں واپسی ہوئی تو حاجی مختیار بھی استقبال کرنے والوں میں شامل تھے جو شارجہ سے واپس پشاور پہنچ چکے تھے۔جی پی او صدر کے سامنے انہوں نے اپنے کاروبار کے لئے دکان بھی لے لی تھی لیکن کاروبار ایک دن بھی نہ کیا۔

1980ء میں جب میں اور میری فیملی خیبر روڈ کے سرکاری فلیٹس میں منتقل ہو گئے تو پھر حاجی مختیار کے ساتھ پھر سے میل ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔میرے ایبٹ آباد منتقل ہونے کے بعد کئی سال تک حاجی مختیار وہاں آتے رہے خصوصاً اس وقت جب سردیوں یا گرمی میں میرے فیملی پشاور میں ہوتی۔ادبی سرگرمیوں سے شوق کے باعث ایک گروپ سا بن گیا تھا اور ادبی محفلیں نہ صرف میرے گھر بلکہ کلینک پر بھی منعقد ہوتیں۔مختیار بھی ان محفلوں کا حصہ رہے۔ایک خاتون جو بعد میں سینئر بیوروکریٹ بنیں کی خواہش تھی کہ ان کی شادی مختیار سے ہو جائے لیکن افسوس ایسا ممکن نہ ہوسکا اور حاجی مختیا پھر تمام عمر شادی سے گریزاں رہے۔اب وہ پچھلے آٹھ سالوں سے گھر کے ہی ہو کر رہ گئے ہیں۔ایک وجہ تو اُن کی کمر کی تکلیف ہے دوسری وجہ ان کی دین سے رغبت ہے۔میری اُن سے گاہے بگاہے ملاقات ہوتی رہتی ہے۔کسی نہ کسی اتوار کو شیرے کے پائے کھانے کا دور بھی چلتا ہے اللہ اسے صحت دے اکثر طبیعت پوچھنے پر پتہ چلتا ہے کہ

"اچھی رکھی ہوئی ہے"

محمد حسین حسینی :۔

محمد حسین حسینی موری محلہ پشاور میں رہتے تھے۔ان سے پہلی ملاقات مختیار کی وجہ سے ہوئی۔ جلد ہی گھل مل گئے۔کئی محفلیں اُن کے گھر میں ہوتی تھیں۔بی اے گورنمنٹ کالج پشاور سے کرنے کے بعد وہ کچھ عرصہ کیلئے میڈیکل ریپ بن گئے۔اُن سے میری ملاقات خیبر بازار میں الطاف میڈیکوز کی دُکان پر کئی بار ہوئی۔یہ کیمسٹ وقت کے مشہور ترین سٹاکسٹ تھے۔دکان لالہ الطاف (حاجی) اور لالا امیر کی شراکت میں تھی۔امیر زیادہ تر خاموش رہتے ۔لالہ الطاف ایک انتہائی پر اثر شخصیت کے مالک تھے جو ہر آنے والے کو آڑے ہاتھوں لیتے۔تمام میڈیکل کمپنیوں میں بھرتی اُن کی منشاء کے مطابق ہوتی تھی۔بہت سے نوجوان ڈاکٹر بھی آتے جاتے تھے۔تقریباً ہر وقت گپ جاری رہتی تھی۔کلین شیو تھے۔بعد میں داڑھی رکھنے کے بعد مذہب کی جانب مائل ہو گئے اور حاجی الطاف کے نام سے مشہور ہوئے۔یونیورسٹی ٹاؤن میں رہائش رکھتے تھے۔بعد میں کئی بار ہوائی جہازوں میں اندرون ملک یا بیرون ملک سفر کے دوران اُن سے ملاقات ہوتی۔گلے میں بستہ لٹکائے عمرہ یا حج کرنے روانہ ہوتے۔ایک دن ان کی عیادت کے لئے ان کے گھر گیا تو مغرب کا وقت تھا پہلے نماز پڑھی اور پھر ان کے حلقہ احباب میں بیٹھا جہاں دین سے متعلق گفت گو ہو رہی تھی مجھے یاد ہے کہ انہوں نے اپنے الگ ہی طریقے سے سانس کے ذریعے چھ سانسوں میں ورد کیا،ہمیں بھی تربیت دی اور مجھے احساس ہوا کہ یہ عمل کس قدر مشکل ہے لیکن اس کی وجہ سے جو جذبہ میرے اندر پیدا ہوا وہ بھی یقیناً اثر انگیز تھا۔

حسینی ایک حنفی سنی گھرانے کے فرد تھے لیکن اہل تشیع سے خاصے متاثر اور انہی کے ہو کر رہ گئے۔ اُن کے گھر کے سامنے ایک چھوٹا میدان تھا جس کے گرد چار دیواری لگا دی گئی تھی۔اس مکان میں محرم میں حضرت عباسؓ کا علم آ کر رکتا۔اور اہل تشیع سینہ کوبی کرتے ۔مرحوم حیات محمد خان شیر پاؤ اپنی انتخابی مہم کے سلسلہ میں ایک بار حسینی کی وجہ سے وہاں آئے تھے۔اُس رات وہاں بہت جوش وخروش دیکھنے میں آیا ایک

بڑا مجمع لگا تھا جس میں لوگوں کی بڑی تعداد موجود تھی۔ میں بھی ان میں شامل تھا۔ بعد میں حسینی کسٹم آفیسر بن گئے اور وہیں سے ریٹائرڈ ہوئے۔ ایک مکان انہوں نے حیات آباد میں بنایا۔ بہت خوبصورت تھا ہم کئی دفعہ وہاں جاتے۔ اپنا مکان ان کی شادی تک پرانا ہی تھا بعد میں انہوں نے موری محلے والا مکان گرا کر تین منزلہ نیا گھر تعمیر کیا اور اس میں رہنے لگے۔

حسینی کی شادی اُن کی اپنی قریبی رشتہ دار صبیحہ بی بی سے ہوئی۔ ان دنوں میرے پاس مووی کیمرہ ہوا کرتا تھا۔ میں نے اُن کی شادی کی فلم بھی بنائی۔ تب پروفیشنل فوٹوگرافر نہیں ہوا کرتے تھے۔ شادی سے ایک رات پہلے حسب دستور محفل رقص وسرور چوک ناصر خان کی ایک بڑی سرائے میں منعقد ہوئی۔ اُستاد غلام علی جو حسینی کے ذاتی دوست تھے خاص طور پر لاہور سے تشریف لائے اور اپنی پر اثر گائیکی سے سننے والوں کو خوب متاثر کیا دل چسپ بات یہ ہے انہوں نے حسینی سے گائیکی کا کوئی معاوضہ نہیں لیا۔ دو تین رقاصاؤں کا رقص بھی قابل دید تھا۔ جب شرکاء ان پر روپے لٹا رہے تھے تو میں سوچ رہا تھا کہ ان کے پاس آخر کار اتنا پیسہ کہاں سے آیا۔ اس قسم کے دو چار مجرے اور بھی دیکھنے کا موقع ملا اور وہاں بھی نوٹوں کی بارش کا یہی سلسلہ تھا۔ حسینی کے خاندان کے ساتھ میرے روابط بہت قریبی تھے۔ وہ تقریباً ہر سال گرمی میں ایبٹ آباد چند دن کیلئے ہمارے مہمان ہوتے اور ہر سال ایک بچے کا اضافہ بھی ہوتا۔ اُن کی بیگم انتہائی خوش اخلاق، محنتی، شوہر کی خدمت شعار تھی۔ حسینی کے قہقہے اور بعض اوقات گنگنانا بہت ہی اچھا لگتا۔ جس میں ایک شعر مجھے اب بھی یاد ہے کہ

جوانی آتے ہی اُن پر قیامت کی بہار آئی
نگاہ مستانہ وار اُٹھی حیاء بے گانہ وار آئی

حسینی سگریٹ ہاتھ میں لئے مخصوص انداز سے قصے وٹوٹکے سنانے اور ساتھ ہی یک لخت قہقہے لگانا شروع کر دیتے۔ ان کے بڑے بھائی سرحدی صاحب کا بھی ٹوٹکے لگانے میں اور ہنسنے وہنسانے میں

جواب نہیں تھا۔ حسینی فقیروں سے ملاقات کے بہت دلدادہ تھے۔ کچھ ذکر بابوں کے باب میں آئے گا۔ حسینی کی بیٹی کی شادی اصغر علی شاہ کی بڑے بیٹے احسن سے ہوئی اور وہ آج کل امریکہ میں مقیم ہیں۔ زندگی کے کچھ عرصہ وہ قتل کے الزام میں گرفتار ہونے کے بعد سنٹرل جیل میں رہے مجھے یقین تھا اور اب بھی میں اپنے موقف پر قائم ہوں کہ ان سے جو ملاقاتیں ہوئیں اس کے تناظر میں ان پر لگایا جانے والا الزام حقیقت پر مبنی نہیں تھا۔ جب قتل ہوا تو وہ موقع پر موجود ہی نہ تھے اور نہ جھگڑے سے ان کا کوئی تعلق تھا بہر حال انہیں دل کا عارضہ بھی لاحق ہو گیا اور اے ایف آئی سی راولپنڈی میں بائی پاس اپریشن کروانے کے دوران حرکت قلب بند ہونے سے انتقال کر گئے۔ اُن کی وفات سے میں ایک بہت عزیز دوست سے محروم ہو گیا۔ وفات کے کچھ عرصہ بعد اُن کا بڑا بیٹا محسن جو جیل میں تھا وہ بھی نامعلوم بیماری سے انتقال کر گیا اور ماں کیلئے ساری عمر کا صدمہ چھوڑ گیا۔

بشیر جان:۔

محمد بشیر سے دوستی حسینی کے توسط سے ہوئی وہ اندرون یکہ توت کے ایک محلہ میں رہتے تھے۔ اُن کے دو یا تین مرلے کے گھر میں نیچے والی منزل میں ایک بیٹھک ہوا کرتی تھی جس میں ایک ٹیلی ویژن ہوا کرتا تھا۔ بشیر اور خان گل دو بھائی تھے۔ ان کے درمیان دو یا تین سال کا فرق ہوگا۔ بشیر مجھ سے عمر میں چھوٹے تھے اور خان گل اُس سے بھی چھوٹے۔ یہ چوک یادگار میں اپنے والد کے ہمراہ صرافہ کا کاروبار کرتے تھے۔ ان کے والد حاجی صاحب کو پہلی دفعہ میں نے جب دیکھا۔ تو ان کے ہاتھ میں خوشبو سے بھری روئی تھی اسے روئی کے بوڑے بھی کہا جاتا ہے ایک بوڑا اُنہوں نے مجھے بھی دیا۔ یہ عطر بھرے ہوئے تھے۔ بعد میں پتہ چلا کہ یہ مسجد میں جا کر جمعہ کے دن خاص طور پر لوگوں میں خوشبو بانٹا کرتے تھے۔ بشیر کی والدہ کو تو ہم نے نہیں دیکھا۔ البتہ ان کی بیگم صاحبہ بہت ہی ہنس مکھ خاتون تھیں اور اب بھی ہیں بہت بعد میں ہمیں پتہ چلا کہ وہ میرے ننھیال کی طرف سے رشتہ دار بھی ہیں۔ بشیر نے غالباً میٹرک یا ایف اے

تک پڑھا تھا۔اُس کی باتیں معنی خیز، دلچسپ اور ٹھیٹھ پشوری زبان میں ہوتی تھیں ساتھ میں اُن کا لب لہجہ وقہقہہ دوآتشے کے طور پر کام کرتا تھا چونکہ صرافہ کے کاروبار میں خاصہ منافع ہوتا ہوگا۔ لہذٰا یہ دونوں بھائی سیر وتفریح کرنے لاہور جایا کرتے اور واپس آ کر ہمیں قصے سناتے ،ہم بھی بہت محظوظ ہوتے ۔تفریح وطبع کے طور پر ٹیلی ویژن پر اگر کسی خاتون کا ہلکا پھلکا ڈانس دکھائی دیتا تو فوراً جیب سے پیسوں کی گڈی نکال کر ٹی وی پر نچھاور کرنا شروع کر دیتے تھے جسے ہم سب دوست خوب لطف اٹھاتے۔تاہم وہ ایک بہترین عقیدہ رکھنے والے مسلمان تھے اور سخاوت میں بھی مشہور تھے اپنے ذہنی رجحان وایمان کے لحاظ سے بہت شدت سے پانجتن پاک (اہل بیت) کے نام لیوا تھے اور اُنہی کا خصوصی ذکر کرتے تھے اور نذر و نیاز بھی دیتے تھے ۔کاروباری لحاظ سے چونکہ ایسے شعبے میں تھے کہ ہمیں جب بھی غیر ملکی کرنسی کی ضرورت پڑی ہم نے ہمیشہ اِن سے ہی رابطہ کیا اور اُنہوں نے بڑی ایمانداری اور اچھے ریٹ پر کرنسی مہیا کی۔

1989ء میں اپنے یکہ توت والا گھر چھوڑ کر گلبہار میں عشرت سنیما کے سامنے اپنے نئے گھر میں منتقل ہو گئے جہاں دونوں بھائی علیحدہ علیحدہ رہنے لگے۔بشیر جان کے چار بیٹے عسکر، خاور، یاور اور مسعود ہیں اور ایک بیٹی مونی۔ان سب کے ساتھ رابطہ رہا۔بشیر جان چونکہ زندہ دل انسان تھے اسی لئے ہر محفل میں اپنے تجربات بیان کرتے جن پر سیر حاصل بحث ہوتی ۔اس طرح وقت گزرتا گیا۔ جب میں انگلینڈ سے واپس آیا تو وہ بھی میرے شروع کے دنوں میں میرا ساتھ دینے والے دوستوں میں شامل تھے۔ میرے بھائی خان گل نے اپنی گاڑی بیچنے کا ارادہ کیا۔تو بشیر جان نے وہ گاڑی خرید لی۔ میں نے اُن سے پوچھا تو اُنہوں نے کہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث ہے کہ " تین چیزیں آپ کیلئے بہت مبارک ہو سکتی ہیں، بیوی ،شادی اور گھر" سواری ہے، میں نے شادی کی ہوئی ہے اور مکان میرے پاس ہے۔اب میں چاہتا ہوں کہ کسی ایسے شخص کی سواری خریدوں جس کے بخت بہت اچھے ہیں اور یوں یہ گاڑی میرے لئے مفید ثابت ہو۔وہ گاڑی غالباً سیاہ رنگ کی ٹیوٹا کرولا تھی ۔ یہ گاڑی کافی عرصے تک انہوں نے اپنے پاس رکھی اور اسے

متبرک سمجھتے رہے۔بشیر جان ایک بھلا مانس انسان تھا۔آخری عمر کے چند سال اسے جگر کی بیماری لاحق ہو گئی، تکلیف میں رہے اور 2016ء میں اچانک اُن کی وفات ہوگئی۔ان کے بچوں میں عسکر سب سے بڑا اور طویل قامت ہے۔ میرے بیٹے باسل کے ہم عمر ہوگا۔اپنے والد کے نقش قدم پر چلتے ہوئے صرافہ کا کاروبار پشاور صدر مال روڈ پہ ''منی گرام'' کے نام سے کر رہا ہے۔اور اس کے رویہ میں ادب کے علاوہ خوش گفتاری، نیک نیتی اور خلوص جھلکتا ہے۔اپنے ہر گھریلو فنکشن میں مجھے اور میرے بھائی ڈاکٹر خالد کو مدعو کرتا ہے۔بشیر جان کی کمی ہر روز محسوس ہوتی ہے۔

ڈاکٹر محمد ہمایون:۔

ڈاکٹر محمد ہمایون سے میری ملاقات خیبر میڈیکل کالج کے دور میں ہوئی۔ مجھ سے ایک سال سینئر تھے اور پھر میرے کلاس فیلو بن گئے۔ یہ تو یاد نہیں کہ ملاقاتیں کیسے شروع ہوئیں لیکن اتنا یاد ہے کہ میں نے ان کے گھر واقع اندرون لاہوری گیٹ پشاور میں جانا شروع کیا۔گھر میں نچلی منزل پر ایک بیٹھک جو گرمی میں بہت ٹھنڈی ہوا تھی وہاں اکثر میں اور وہ بیٹھتے۔گپ شپ کے ماہر تھے اور اُن کا مخصوص قہقہہ جو اس زمانے میں بھی اتنا ہی دلکش تھا جتنا آج ہے۔ یہ ان کی شناخت بھی ہے۔کبھی کبھار اس کے والد بزرگوار جو خود بھی بڑی اچھی طبیعت کے مالک تھے آجاتے اور گپ شپ رہتی۔ایک بار خیبر میڈیکل کالج میں ہم بمعہ پوری کلاس جس میں طلباء اور طالبات شامل تھیں پکنک منانے گئے وہ ایک دن کا دورہ بڑا یادگار رہا چونکہ ہم نے سارا سال پڑھائی تو کی نہ تھی اس حوالے سے پکنک پر ہی فیصلہ کیا کہ میرے ماموں میاں محمد یوسف قریشی کے گھر واقع گلبہار کے گیسٹ روم میں فائنل ایئر ایم بی بی ایس کی تیاری کیلئے ڈیرے ڈالے جائیں۔ میرے انتہائی مشفق ماموں نے بڑے کھلے دل سے جگہ دے دی اور ہم تقریباً چار یا چھ ماہ وہاں مقیم رہے۔دیگر یار دوستوں کو نہیں بتایا تھا لیکن کچھ عرصہ بعد ان کو پتہ چل ہی گیا اور ان کا آنا جانا شروع ہوگیا۔اسی اثناء میں ایک بار میرے خاص دوست ہمارے ساتھ خوش گپیاں

کررہے تھے تو ماموں آ گئے اور انہوں نے دوستوں کا داخلہ وہاں ممنوع قرار دے دیا تا کہ پڑھائی کا حرج نہ ہو اور اس طرح ہم دو دوست رہ کر امتحان کی تیاری کرنے لگے۔ طریقہ کار یہ تھا کہ کتاب میں سے موضوع ایک دوسرے کو تقسیم کر کے علیحدہ علیحدہ پڑھ لیتے اور پھر ایک دوسرے کو سناتے یا ڈسکس کرتے۔ اس طریقے سے وقت بھی بچ جاتا اور ہمیں سمجھ بھی آ جاتی۔

اس دورانیہ سے بہت حسین یادیں بھی وابستہ ہیں۔ ڈاکٹر ہمایون کو اکثر مائیگرین یا آدھے سر کا درد جسے پشتو میں ''نیم سرے'' کہتے ہیں ہو جاتا تھا۔ جس کے بعد اسے چکر آنے لگتے، الٹیاں، آنکھوں کا سرخ ہو جانا اور پھر کئی دن تک تکلیف میں رہتا تھا۔ ایک دن وہ بہت تکلیف میں تھا۔ گولیاں وغیرہ کھائیں لیکن افاقہ نہ ہوا۔ میں ہمایون کو شیخ محمد والے بابے (جن کا قصہ بابوں کے چیپٹر میں بیان ہوا ہے) کے پاس لے گیا۔ اگرچہ وہ بابے کو نہیں مانتا تھا۔ میں نے اسے کہا چلو ٹانگہ میں بیٹھتے ہیں اور شیخ محمد جا کر بابے سے گپ شپ بھی لگاتے ہیں، بڑی مشکل سے راضی ہوا۔ بابے کی رہائش گاہ پہنچ کر میں تو ایک چوکی پر قریب بیٹھ گیا اور ہمایون میرے پیچھے بیٹھ گیا۔ ہم دونوں نے بہت ہی عام سے کپڑے پہنے ہوئے تھے جس سے یہ معلوم نہیں ہو رہا تھا کہ ہم پڑھے لکھے یا یونیورسٹی کے طالب علم ہیں۔ بابا حسب عادت لیموں کے سوکھے چھلکے کاٹ کر سب لوگوں میں تقسیم کرنے لگا۔ میں نے ایک چھلکا لے کر کھا لیا۔ مگر ہمایون نے چھلکا لے تو لیا لیکن کھایا نہیں۔ تقریباً سات، آٹھ لوگ وہاں بیٹھے ہوئے تھے۔ بابا اپنی سر میں مست کبھی ریڈیو سنتا تو کبھی اردو، پشتو، انگریزی میں خود سے باتیں کر رہا تھا۔ ایسے میں ہمایون کی جانب دیکھتے ہوئے اس نے آواز لگائی کہ ''ڈاکٹرا او خورہ دا ھم د سر درد یو علاج دے'' یعنی کھا لو یہ بھی سر درد کا علاج ہے۔ ڈاکٹر ہمایون کو نا بادل نخواستہ یہ چھلکا کھانا پڑا۔ ہم دُعا کے بعد اُٹھ کر آ گئے۔ کافی عرصے بعد مجھے یہ معلوم ہوا کہ ڈاکٹر ہمایون کے آدھے سر کا درد بہت ہی کم یا ختم ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر ہمایون میری شرارتوں میں بھی معاونت کرتا۔

فائنل ایئر کے یونیورسٹی کے امتحان ہورہے تھے اور ہم نے اگلے پیپر کی تیاری کرنی تھی۔ اس دن ہمایون یونیورسٹی سے واپس ہی نہیں آیا۔ دوسرے دن گائنی کا پیپر تھا۔ اور جب میں وہاں پہنچا تو امتحانی مرکز واقع پیتھالوجی بلاک کے سامنے وہ بڑی بے چینی سے ٹہل رہا تھا تیزی سے میرے پاس آیا اور مجھے کہا کہ فلاں فلاں سوال جلدی سے پڑھو اور یاد کرلو۔ میں نے کہا کیوں؟ وہ بولا کہ یہ سوالات پرچہ میں آنے والے ہیں۔ میں نے اسے سنجیدہ نہیں لیا تاہم ان سوالوں کے جواب سرسری دیکھ لئے اور تیزی سے پیپر دینے چلا گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ جو سوال اس نے بتائے تھے وہ سارے کے سارے پرچہ میں موجود تھے۔ دو تین سوال اُس میں سے میں نے تیار کئے تھے حل کر لئے اور باقی کے اپنے پاس سے کچھ لکھ لیا اس طرح ہم اس پیپر میں پاس ہو گئے۔ بعد میں پتہ چلا کہ رات کو جب وہ اپنے ہاسٹل کے دوستوں کے کمرے میں گیا تو وہ فلم دیکھنے گئے ہوئے تھے۔ اس کو یہ بات بڑی عجیب لگی۔ لہٰذا اس نے ٹوہ لگائی اور آخر کار ان کی الماری میں سے وہ ایک کاغذ نکال کے دیکھ لیا۔ جس میں کل کے آنے والے پیپر کے سوالات لکھے ہوئے تھے۔ وہ سمجھ گیا کہ پیپر انہوں نے آؤٹ کرالیا ہے۔ اس نے یہ سوال خود بھی تیار کر لئے اور وہی صبح مجھے بھی بتائے۔

ہمایون ڈاکٹر بننے کے بعد خاصی مشکلات سے گزرا۔ شروع میں ڈاکٹر سعید المجید کے کلینک میں بھی کام کرتا رہا۔ کچھ عرصہ اپنی علیٰحدہ پریکٹس بھی کی۔ لیکن پھر عرب ممالک جانے کا شوق ہو گیا کیونکہ حاجی مختار بھی وہاں گیا تھا۔ کچھ عرصہ دبئی و شارجہ میں رہا اور وہاں پر ملازمت نہ ملنے کی وجہ سے واپس پاکستان لوٹ آیا اور نشتر آباد میں کلینک شروع کر دی۔ یہ کلینک کافی کامیاب رہا۔ ڈاکٹر ہمایون سے اب کم ہی ملاقات ہوتی ہے لیکن جب بھی ہوتی ہے اسی بے ساختگی سے ہوتی ہے۔ ان کا ایک بیٹا غزالی آجکل اپنا کاروبار کر رہا ہے۔ ڈاکٹر ہمایون دل کے عارضے میں مبتلا ہوا اور بائی پاس کا آپریشن غالباً 2010ء میں ایف آئی سی پنڈی سے کروایا جس کے بعد ٹھیک رہا۔ ابھی تک ماشاءاللہ ٹھیک ہے۔ کمر میں تکلیف کی وجہ سے لمبا سفر کرنا چھوڑ دیا ہے۔ آخری بار میری ملاقات ان کی بیگم کی وفات کے موقع پر ہوئی۔

ڈاکٹر چنگیز حکیم خان:۔

ڈاکٹر چنگیز اور میں ایڈورڈز کالج پشاور میں ایف ایس سی میں اکھٹے تھے۔اسکے بھائی مثل، جاوید اور نواب علی بھی ہم سے سینئیر تھے اور سکندر ٹاؤن پشاور کے ایک گھر نما ہاسٹل میں اکثر مقیم رہتے۔ وہیں میں بھی انکے ساتھ اکثر اوقات گپ شپ کے لئے جاتا۔میڈیکل کالج میں اکھٹے داخل ہوئے تو قربت اور بڑھ گئی۔انکے والد جونوشہرہ کے بہت معروف ٹھیکیدار تھے اکثر صبح مجھے اپنی گاڑی میں میرے گھر واقع سکندر پورہ (جو کہ راستے میں پڑتا تھا) سے ساتھ لیجاتے۔ میڈیکل کالج کے دوران انتخابی مہم میں اکٹھے تھے۔چنگیز سٹوڈنٹ یونین کے جنرل سیکرٹری کے عہدے کا اُمیدوار تھا۔ہم نے اس سلسلے میں بہت ہی شدومد سے انہیں ووٹ دلانے کے لئے جدوجہد کی۔ ہمارے مدمقابل ڈاکٹر انور جان کامران تھے جو جمعیت طلباءاسلام سے تعلق رکھتے تھے۔اس زمانے میں جمعیت طلباءایک مضبوط جماعت ہونے کی وجہ سے بہت فعال تھی۔صدر کا انتخاب ڈاکٹر چغتائی جمعیت طلباء اسلام کی طرف سے لڑ رہے تھے۔ چنگیز بہت کم ووٹوں کے فرق سے ہار گیا۔ہم دونوں فائنل ائیر میں اچھے نمبروں سے پاس ہوئے۔

چنگیز ڈاکٹر بننے کے فوراً بعد لازمی ملٹری سروس کے لیئے چلا گیا جب کہ میں دل کی مرمر (Murmur) کی وجہ سے منتخب نہیں ہو سکا اور لیڈی ریڈنگ ہسپتال میں میڈیکل ڈی وارڈ میں ہاؤس جاب کرنے لگا۔ہاؤس جاب کے فوراً بعد حج پر چلا گیا اور اُس کے بعد ستمبر 1973ء میں انگلینڈ روانہ ہو گیا۔انگلینڈ کی مصروف زندگی میں چنگیز سمیت کسی دوست سے رابطہ نہیں ہو سکا۔جب میں 1977ء میں پاکستان شادی کے سلسلے میں واپس آیا تو چنگیز پشاور میں تھا غالباً سینئر رجسٹرار سرجری تھا۔اس نے اُس وقت تک ایم سی پی ایس کر لیا تھا۔ایک سرخ رنگ کی ٹیوٹا گاڑی میں گھومتا تھا۔میری شادی میں اُس نے بہت ہی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور شادی کے بعد ہنی مون کے لئے میں اور میری بیگم اسی کی گاڑی میں اسلام آباد تک گئے۔وہاں جا کر میں نے اس کی گاڑی واپس بھجوادی (ہنی مون کا قصہ کہیں اور آئے گا)۔

ایف سی پی ایس کرنے کے بعد اُس نے ایک بار مجھے انگلینڈ میں لکھا کہ وہ ایف آر سی ایس کے سلسلے میں انگلینڈ آنا چاہتا ہے۔ اور اسی سلسلے میں وہ کنگز کالج سینٹ تھامس لندن میں کوشش کر رہا ہے۔ میرے انگلینڈ سے واپس آنے پر چنگیز انگلینڈ چلا گیا تھا۔ بعد میں اُس نے ایف آر سی ایس بھی کر لیا اور واپس پاکستان آ گیا۔ پشاور میں ہم دونوں اکھٹے سینئر رجسٹرار سرجری کی حیثیت میں کام کرتے رہے۔

1980ء میں اس کی والدہ شدید بیمار ہوئیں انہیں بولٹن بلاک میں داخل کیا گیا چونکہ ان کا خاندان ایک باثر خاندان تھا اس لئے ماضی کے صوبہ سرحد اور آجکل کے خیبر پختون خوا کے سابق گورنر جنرل فضل حق تقریباً ہر روز نہیں تو ہر دوسرے دن ان کی والدہ کی عیادت کو آتے۔ تمام سینئر ڈاکٹر بمعہ پروفیسر فیروز شاہ، ڈاکٹر سراج، ناصر الدین اعظم خان وغیرہ ہر قت موجود رہتے۔ ان کی والدہ کو یرقان کی شکایت تھی بیماری کی تشخیص میں مشکلات تھیں۔ یہ طے ہو رہا تھا کہ مزید علاج کیلئے انہیں لندن لیجایا جائے یا نہیں؟ اس سلسلے میں جنرل فضل حق نے چنگیز سے پوچھا کہ کیا کسی ڈاکٹر کو بلواؤں یا تمہاری والدہ کو لندن بھجوایا جائے۔ چنگیز نے جنرل فضل حق کو میرا نام دیا تا کہ مشورہ کیا جا سکے۔ مجھے گورنر ہاؤس بلوایا گیا۔ ایم ایس ٹو گورنر نے کہا کہ آپ چنگیز کی والدہ کے کیس کی سمری لکھیں جو میں نے بنا کر دے دی اور اس نے جھٹ سے انگریزی ڈکشنری منگوائی اور الفاظ دیکھنے شروع کر دیئے۔ میں بڑا حیران ہوا اور پوچھا کہ ڈکشنری کی کیا ضرورت پڑ گئی؟ تو ملٹری سیکرٹری گویا ہوئے کہ آپ نہیں جانتے جنرل فضل حق ایک ایک لفظ پڑھیں گے۔ ساتھ ہی انہوں نے میڈیکل ڈکشنری جو وہاں موجود نہ تھی منگوانے کیلئے سٹاف کو مارکیٹ بھجوا دیا۔ میڈیکل ڈکشنری بھی آ گئی اور وہ ایک ایک میڈیکل ٹیکنیکل لفظ کو دیکھ رہے تھے اور اُس کے ہجے درست کر رہے تھے۔ جنرل فضل حق نے کچھ دیر بعد مجھے بلا لیا۔ بڑے اچھے طریقے سے بات چیت کی۔ جنرل فضل حق کی زبان کی بے باکی کا چرچا بہت سُنا تھا۔ اُنہوں نے مجھ سے پوچھا کیا اس سے زیادہ مختصر ہسٹری نہیں ہو سکتی۔ میں نے کہا نہیں۔ اُنہوں نے پن پکڑا کچھ چیزیں آگے پیچھے کیں۔ مجھے بتایا، میں

نے دیکھا کہ میری تحریر کوانہوں نے تقریباً نصف کر دیا تھا اور جو کچھ لکھا وہ بھی بالکل ٹھیک لکھا۔ میں نے کہا یہ بالکل صحیح ہے۔ اُنہوں نے ٹائپ کرنے کیلیئے دیا اور مجھے چائے یا کافی پینے کا پوچھا! میں اُن کی انگریزی میں مہارت کا معترف ہو گیا۔ انہوں نے لندن میں کنگز ہسپتال میں میرے بتائے ہوئے ڈاکٹر کو ٹیلیفون ملوانے کا کہا۔ ان دنوں براہ راست ٹیلی فون یا آج کل کے واٹس ایپ کی بجائے بین الاقوامی یا اندرون ملک ٹیلی فون کال ٹیلی فون ایکسچینج کے ذریعہ ملائی جاتی تھی۔ گورنر کے لئے لندن کی کال بھی جلدی مل گئی۔ اُنہوں نے ڈاکٹر سے بات کی اور پھر فیصلہ یہ ہوا کہ بجائے چنگیز کی والدہ کو لندن بھیجنے کے وہاں سے ڈاکٹر پشاور آجائینگے ۔ ماہر جگر و پتہ کے ایک ماہر ڈاکٹر پشاور آ گئے اور یہاں پہلی بار انڈوسکوپی کی گئی۔ مزید ٹیسٹ بھی ہوئے۔ بیماری کچھ ایسی تھی کہ اُس کا علاج زیادہ ممکن نہ تھا۔

چنگیز ترقی کرتے کرتے آخر کار میری طرح سرجری کا پروفیسر بن گیا سی پی ایس پی کا نائب صدر اور پوسٹ گریجویٹ کے طلبہ کا سپروائزر بھی رہا۔ بعد میں چیف ایگزیکٹو خیبر ٹیچنگ ہسپتال بھی بنا۔ یہ ان کی نوکری کا آخری دور تھا۔ چنگیز خان کو سی پی ایس پی کی جانب سے Living Legend کا ایوارڈ بھی دیا گیا۔ وہ جب ساٹھ سال کے قریب ہوئے تو انہیں پارکنسن کی بیماری نے آلیا۔ اللہ تعالیٰ سے ان کی صحت کے لئے دعا گو ہوں ان کے بیٹے حسام خان جو آغا خان کے گریجویٹ ہیں امریکہ سے Internal Medicine میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے واپس آئے اور رحمان میڈیکل کالج میں اسسٹنٹ پروفیسر میڈیسن رہے دو سال بہت اچھا کام کیا۔ آج کل واپس امریکہ چلے گئے ہیں۔

محمد اسلم:۔

محمد اسلم میرے دوست محمد شفیق کے خالہ زاد بھائی ہیں ۔ چار پانچ بھائیوں میں سے دوسرے نمبر پر ہیں مجھ سے عمر میں چھوٹے اور گورنمنٹ ہائی سکول نمبر 1 پشاور سٹی کے پڑھے ہوئے ہیں۔ ان کے والد اشرف صاحب ایک کاروباری انسان تھے۔ اور ان کا اشرف روڈ پشاور واقع گل بنا سپتی کا آؤٹ لٹ

تھا۔ان کی شادی سیٹھی خاندان پشاور میں ہوئی۔اوران کی بیگم سلمٰی انتہائی ہنس مکھ خاتون ہیں۔اسلم کے دو بیٹے شیراز اورعلی اور دو بیٹیاں سعدیہ اورسونیا ہیں۔ ہماری آپس میں ملاقات انگلینڈ میں ہوئی۔ میرا بیٹا باسل ان دنوں ایک سال کا تھا اوراسلم کے بچے بھی اتنے چھوٹے تھے کہ اُن سب کو بگھی میں لے جایا جاتا تھا۔پہلی بار یہ ہمارے پاس Stroke-on-Trent انگلینڈ میں آئے اور یوں ہمارے درمیان دوستی کی بنیاد پڑی۔ہمیں انہوں نے لندن مدعو کیا۔اورایک شو Oh'Culcutta دکھانے لے گئے۔اس کے بعد ہمارا آنا جانا لگا رہتا تھا۔

ایک دفعہ ہم Stroke-on-Trent کے قریب ان کو Alton ٹاور جو کہ انتہائی خوبصورت باغات پر مشتمل ہے لے کر گئے اور وہاں بہت ساری تصویریں اور ڈرامائی ویڈیو بنائیں۔محمد اسلم حبیب بینک کے آفیسر تھے اور بینک ہی کی وجہ سے انگلینڈ آئے تھے۔ترقی کرتے کرتے کئی اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔یورپ اور پھر آسٹریلیا وچین میں حبیب بینک کے سربراہ رہے۔ ہمارے روابط میں مشترک بات یہ تھی کہ ہم دونوں ٹھنڈے مزاج کے تھے۔ہماری بیگمات کی بھی آپس میں خاصی اچھی بنی جب میں پاکستان واپس آنے لگا تو 1979ء میں میری آخری پوسٹنگ دو ماہ کے لئے کینٹر بری میں ہوئی اس دوران میری بیگم اور باسل ان ہی کے گھر لندن کے میں رہے۔جن کا انہوں نے بہت خیال رکھا۔میں بھی ہفتے میں ایک بار چھٹیاں گزارنے چلا جاتا اور پھر وہیں سے ہم نے پاکستان کیلئے رخصت لی بعد میں دونوں کی مصروفیت کچھ ایسی بڑھی کہ ملاقات نہ ہوسکی۔

ریٹائرمنٹ کے بعد ہمارا رابطہ پھر سے ہوا اور ابھی تک قائم ہے۔اسلم گالف کھیلنے کے شوقین ہیں اور صبح نماز کے بعد گالف کیلئے روانہ ہوتے ہیں۔ان کے والد کے کاروبار کو ان کے بھائیوں نے اور خود انہوں نے بھی بڑھایا یوں چند ایک فیکٹریاں قائم کیں۔جن میں ان سب کی حصہ داری ہے۔ان کے ایک بھائی حاجی جاوید سے بھی ہمارے تعلق ہے جنہوں نے انجینئرنگ کالج پشاور سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی

بعد میں سیاست میں نام کماتے ہوئے مسلم لیگ کے ٹکٹ پر صوبائی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے اور اطلاعات کے علاوہ وزیر اوقاف وحج بھی رہے۔محمد اسلم آجکل اپنی ماچس فیکٹری کی نگہداشت کر رہے ہیں۔سلمیٰ زیادہ تر لندن میں خوش ہوتی ہیں۔ جہاں اُن کا گھر ہے۔اور گاہے بگاہے پشاور آتی جاتی ہیں۔

عبدالواجد ایبٹ آباد:۔

عبدالواجد ایبٹ آباد کے رہائشی تھے۔میری پہلی ملاقات لندن میں اُن کے گھر یا غالباً کریم جان ایک دیگر دوست کے گھر 1973ء میں ہوئی پھر چند بار انگلینڈ میں ملاقاتیں رہیں۔لندن میں یہ گارمنٹس کا کاروبار کرتے تھے۔بنیادی طور پر ایسوسی ایٹ انجینئر تھے۔ پاکستان میں ان کے والد مولوی عبدالمجید سرکاری ملازم تھے۔ کیہال ایبٹ آباد میں رہائش تھی۔ان کی والدہ کا تعلق پشاور سے تھا۔جس کی وجہ سے بچپن میں ان کے گھر ایبٹ آباد بھی آیا تھا۔ان کے اور ہمارے درمیان قدر مشترک یہ تھی کہ یہ خورشید رؤف وشوکت رؤف کے رشتہ کے ماموں تھے۔جب میں انگلینڈ سے واپس آکر ایبٹ آباد آباد ہو گیا۔تو سال 1982ء میں واجد بھی انگلینڈ سے کوچ کر کے اپنی فیملی کے ہمراہ ایبٹ آباد آ گئے یوں ان کے ساتھ ایبٹ آباد میں ایک نئے سرے سے رابطہ ہوا۔وہ کاروبار کرنا چاہتے تھے اور اس سلسلے میں اکثر گفتگو رہتی تھی کہ کیا کریں۔ میں نے اور انہوں نے مل کر انڈسٹریل ایریا ایبٹ آباد میں فیکٹری لگانے کی کوشش بھی کی۔کس چیز کی فیکٹری لگائی جائے،اس سلسلہ میں۔ہم پورے پنجاب میں گھومے مختلف قسم کی فیکٹریوں کا مشاہدہ کیا۔جس میں بجلی،پنکھے اور خاص طور پر سنیٹری کا سامان بنانے والی فیکٹریاں تھیں۔ہم سوچ بچار کے باوجود کسی خاص نتیجے پر نہ پہنچے اور واجد نے آخر کار بجلی کے قمقموں کی ڈیکوریشن کا کاروبار مانسہرہ روڈ منڈیاں میں شروع کر دیا۔

انہی دنوں ہمارے انگلینڈ کے ساتھی کریم جان جن کا تعلق پشاور سے تھا اپنی بیگم کے ساتھ ایبٹ آباد شفٹ ہو گئے انہوں نے واجد کے دکان کے ساتھ ہی سنیٹری کا کاروبار شروع کر دیا اور اس طرح

یہ دودکانیں ہم سب دوستوں کیلئے ملاقات کا مرکز بن گئیں۔آتے جاتے ہم یہاں رکتے گپیں ہانکتے اور روانہ ہوجاتے۔میرے ایبٹ آباد کے مزید دو دوست ڈاکٹر میجر سلیم اور ڈاکٹر منور عزیز بھی اس گروپ میں شامل ہوگئے اور ہم سب گھریلو سطح پر بھی ایک دوسرے کی زندگیوں میں شریک ہوگئے۔واجد ایک ذہین انسان تھا اور کاروباری نکتہ نظر سے معاملات کو دیکھتا۔میرے وہاں مکانات بنانے کے دوران بجلی کا سارا سامان اُسی نے مہیا کیا۔کیا اچھے دن تھے دوست دوست کی قدر کرتے تھے اور یہی وجہ تھی کہ نقد رقم کی بجائے یہ سارا سامان مجھے قسطوں پر ملا لیکن یہ اس کا فن تھا کہ مسلسل اپنے پیسے مجھ سے نکلواتا رہا۔بہت سے لوگ فکس قیمتوں کی وجہ سے اس کو گراں فروش تصور کرتے تھے۔لیکن میرے ذاتی خیال میں ایسا ہرگز نہیں تھا بلکہ یہ فکس پرائز لوگوں کے مزاج کو بھاتی نہیں تھی۔واجد کی دکان پہ سب لوگوں کا اکھٹا ہونا اس کی اچھی طبیعت کی وجہ سے تھا۔سب اکھٹے ہوتے اور قصے کہانیاں اور لطیفے سنتے اور سناتے۔میجر سلیم کے علاوہ مرحوم سردار معظم خان ایڈوکیٹ ولد سردار بہادر خان بھی ہماری محفلوں میں گاہے بگاہے شامل ہوتے رہتے۔وہ اپنے بھرپور کردار اور جوشیلے پن کی وجہ سے مشہور تھے۔

واجد اور اس کی فیملی کے ساتھ تعلق کی ایک وجہ یوں بھی ہوئی۔1983ء میں جناح آباد میں اپنا پہلا گھر تعمیر کر رہا تھا۔تو اس عرصے میں ہم Climax Fan والوں کے چار کنال کے گھر واقع جناح آباد میں بطور کرایہ دار رہ رہے تھے۔گھر کے مالک جناب حاجی عزیز صاحب جو کہ گرمی میں چند دن رہنے کیلئے آتے ان سے میرے خصوصی تعلقات ہوگئے۔یہ گھر مجھے حاجی لطیف کمرشل ریڈیوز جو کہ Climax Fan کے ڈیلر تھے نے لے کر دیا تھا۔جب میں اپنے گھر 13N جناح آباد میں شفٹ ہوگیا تو کچھ عرصہ بعد حاجی عزیز صاحب چونکہ یہ گھر بیچنا چاہتے تھے۔نے گھر فروخت کرنا چاہا۔آفر بذریعہ حاجی لطیف مجھے بھجوائی۔میں گھر بنا چکا تھا۔واجد جو اس وقت میرے پاس ہی بیٹھا ہوا تھا نے مجھے کہا کہ چونکہ میرا کوئی گھر نہیں ہے۔اور میں یہ گھر خرید لوں تو بہت اچھا ہوگا۔جب میں نے یہ بات حاجی لطیف

صاحب سے کہی تو انہوں نے کہا عزیز صاحب دیگر بہت اچھی آفر ز ہیں ۔ اگر وہ بیچیں گے تو صرف آپ کو۔ لہذٰا میں نے اس طریقے سے یہ گھر انہیں کہہ کر کہ میں ہی خرید رہا ہوں خریدا۔لیکن واجد کے نام پہ اوراسی نے پیسے ادا کئے ۔ مجھے خوشی ہے کہ اُس نے یہ گھر خریدا اوراس میں مرتے دم تک مقیم رہا۔

ان کی فیملی، میری فیملی اور میجر ڈاکٹر سلیم کی فیملی مل کر اکثر و بیشتر پکنکس اور دیگر پروگرام کرتے ۔ پشاور بھی چند دفعہ واجد کے ساتھ سفر کیا۔ ایک خصوصی ٹرپ میں واجد کی فیملی کو ہم پشاور لے گئے۔ وہ میرے سسرال دن دور ہے ۔اور پھر ہم سب پاراچنار گئے جہاں میرے برادر نسبتی منظور احمد کرمانی پولیٹیکل ایجنٹ تھے اور وہاں دودن گزارے ۔ یہ ایک اچھا اور یادگار ٹرپ تھا۔جس میں واجد کے بچوں کے ساتھ میری اچھی خاصی انڈرسٹینڈنگ بھی بن گئی ۔ واجد کے دو بیٹے اور تین بیٹیاں ہیں ۔ واجد کچھ عرصہ عارضہ جگر میں مبتلا رہ کر اپنے خالق حقیقی سے جاملا اور اس کی یادیں ہمارے دلوں میں آباد ہو گئیں۔

گویا زندگی کے تیس سال ہم نے اکھٹے ایبٹ آباد میں گذارے جس دوران کبھی کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہیں آیا۔ واجد اور ڈاکٹر منور عزیز کے ہمراہ ہفتے میں ایک بار عثمانیہ ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر اپنے دل کا بخار ہلکا کر لیتے ، ہنستے اور خوش رہتے ۔ منور کے کہنے پر میں نے 2016ء میں ان کا طبی معائنہ کیا تو پتہ چلا کہ وہ جگر کے دائمی مرض کا شکار ہو چکا ہے ۔ کافی علاج ہوا تاہم آخر کار وہ جمعرات 22 نومبر 2018ء کو اس جہان فانی سے کوچ کر گئے ۔ ان کی اہلیہ مانچسٹر انگلینڈ شفٹ ہو گئیں۔

ڈاکٹر میجر محمد سلیم (ریٹائرڈ):۔

ڈاکٹر سلیم سے میری ملاقات سال 1982ء میں اُس وقت ہوئی جب کہ وہ سی ایم ایچ ایبٹ آباد میں ریڈیالوجسٹ کے طور پر تعینات تھے ۔ میں کراچی سے نیوروسرجری کا کورس کر کے بڑی شدومد سے ایبٹ آباد میں نیوروسرجری کرنے لگا اور اس سلسلے میں دماغ کے اندر کے رگوں کے رنگین ایکسرے

(کیراٹڈ انجیوگرام) کیلیئے سی ایم ایچ جانا پڑا۔ڈاکٹرسلیم نے بہت تعاون کیا۔اور ہم نے انجیوگرافی شروع کی۔ڈاکٹرسلیم نے ایم بی بی ایس کورس ڈھاکہ میڈیکل کالج سے کیااور آخری سال میں نشتر میڈیکل کالج ملتان میں مائیگریٹ کر گئے۔بنگالیوں سے ان کے ذاتی تعلقات اچھے ہونے کے باوجودان کا خیال تھا کہ مشرقی اور مغربی پاکستان کے رہنے والوں کے درمیان وسیع نظریاتی اور ثقافتی فاصلے موجود تھی۔مغربی پاکستان کے عوام وحکومت کی جانب سے انہیں نظر انداز کیئے جانے کے بعد بنگالی مغربی پاکستانیوں کے خلاف ہو گئے تھے۔حتیٰ کہ 1971ء میں وہاں مقیم تمام مغربی پاکستانیوں کو شدید جان کا خطرہ لاحق ہو گیااور میڈیکل سٹوڈنٹس کو فوج کے ذریعے محفوظ جگہ منتقل کرنا پڑا۔

ڈاکٹرسلیم وادی جموں کشمیر سے تعلق رکھتا ہے۔جس کی باتوں سے ہم بھرپور لطف اٹھاتے۔ہم دونون کی طبیعت ایک جیسی تھی جو دوستی میں بدل گئی اور دوستی قربت میں ڈھل گئی۔ڈاکٹرسلیم کی بیگم نازی بہت باوقار خاتون ہے۔ڈاکٹرسلیم کے تین بیٹے عمر، بلال اور بدر سارے ڈاکٹرز ہیں اور ملک سے باہر مقیم ہیں۔ایک بیٹی ڈاکٹر مریم بھی امریکا میں ہے۔تینوں بچے ایوب میڈیکل کالج میں میرے شاگرد رہے۔ سلیم جلد ہی آرمی سے ریٹائرڈ ہو گئے۔اور میری تجویز پر انہوں نے ایوب میڈیکل کالج میں بطور اسسٹنٹ پروفیسر ملازمت اختیار کر لی اور اس طرح ہم اکھٹے کام کرنے کی وجہ سے مزید قریب آ گئے۔فوجی ہونے کے ناطے لگی لپٹی کے بغیر بات کرتے اور خاص طور پر میری حمایت میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھتے۔لطیفے سنانے کے علاوہ شاعری سننے اور سنانے کے بہت شوقین اور فیض احمد فیض کے انتہائی مداح ہیں تاہم دیگر شعراء کی شاعری بھی ہمیں سناتے رہتے ہیں۔میری ٹوٹی پھوٹی شاعری پر اکثر طنزیہ ہنستے ہیں لیکن خوش ہوتے ہیں۔ایک اچھے ریڈیالوجسٹ ہیں۔دوستی یاری میں بہت ہی عمدہ ہیں۔ڈاکٹرسلیم نے ایک مکان 190 جناح آباد تعمیر کیا جو ہمارے بہت قریب تھا۔

سلیم کے بچے جب ان سے دور چلے گئے تو یہ بات ان کے لئے بہت پریشانی کا باعث رہی۔

تاہم ان کی اہلیہ نے ان کا بھرپور ساتھ دیا اور دونوں ایبٹ آباد میں ہی مقیم رہے۔کچھ عرصے سے عارضہ دل میں مبتلا ہوئے اور لاہور میں ڈاکٹر خالد جاوید سے بائی پاس کا آپریشن کروایا۔میرے ساتھ مسلسل رابطے میں تھے میں نے ہر لمحہ انہیں تسلی دی ان کا بیٹا عمر انگلینڈ سے آ گیا۔اور اب وہ ماشاءاللہ صحت مند ہیں۔کچھ عرصہ دونوں میاں بیوی اپنے بچوں کے پاس امریکہ گئے مگر پھر پاکستان کی یاد ستائی اور اب واپس آ کر لاہور میں آباد ہو گئے ہیں۔واٹس ایپ پر ملاقاتیں جاری رہتی ہیں۔

سعادت خان:۔

سعادت خان کا تعلق ضلع صوابی کے گاؤں ہنڈ سے تھا۔اُن سے ملاقات انگلینڈ میں 1973ء میں ہوئی جہاں وہ طالب علمی کے ویزے پر آئے تھے۔کسی جگہ ملازمت بھی کرتے تھے۔اُن کے ایک رشتہ دار رحمان جنہیں انگریزی میں ریمن (Raman) پکارا جاتا تھا سے بھی ملاقات رہتی۔ریمن نے ایک انگریز خاتون سے شادی کی تھی اور اسے پشتو بھی سکھائی ہوئی تھی۔وہ پراٹھے بنانا جانتی تھی اور پشتو گالیاں دینا بھی۔دونوں میاں بیوی خوشگوار طبیعت کے حامل تھے۔سعادت خان کئی بار ہمارے گھر آئے۔ایک بار ویک اینڈ ڈنر کے بعد آدھی رات کو میری بیگم نے کہا کہ شاید ہمارے گھر چور داخل ہو گیا ہے۔میں نے محسوس کیا کہ نیچے کچن میں روشنی ہے۔میں نیچے گیا اور دیکھا کہ سعادت فریج کھول کر کچھ کھا پی رہا ہے۔میری بیگم میٹھا بڑا اچھا بناتی تھیں۔سعادت خان نے رات کو کھانے پر شاید میٹھا کم لیا تھا اور جب دل چاہا تو رات گئے کچن میں فریج کے اندر ہی سر داخل کر کے میٹھا کھانا شروع کر دیا۔اس بات کا ہم نے خوب مذاق بنایا۔

سعادت بڑا زندہ دل شخص تھا جب بھی آتا تو ہم سیر کے لئے باہر نکل جاتے۔ایک بار ہم اُس کے اصرار پر برمنگھم شہر فلم دیکھنے گئے۔انڈین فلم لمبی ہوتی ہے مجھے بڑی کوفت ہوئی میں فلموں کا پہلے بھی شوقین تھا نہ اب ہوں اکثر لوگوں کو کہتا تھا کہ یار مجھے ایک ستون سے باندھ لو اور فلم ختم ہونے کے بعد مجھے

کھول لینا مجھے فلم دیکھنے کی یہ اذیت قبول کرنا پڑی۔سعادت خان ویزے کے مسائل کی وجہ سے واپس پاکستان جانے پر مجبور ہوگئے۔ ان کے چار بیٹے ہیں۔صغیر اور عامر سے کبھی کبھار رابطہ رہتا ہے۔صغیرامریکی سفارت خانہ میں خدمات انجام دے رہا ہے جب کہ دیگر بچے مختلف نوع کا کاروبار کرتے ہیں۔ہمارے پشاورواپس آنے کے بعد 90-1980ء کی دہائی میں ان کے خاندان سے ہماری قریبی تعلق رہا۔ پشاور کے علاوہ وہ چندسال ایبٹ آباد میں بھی رہائش پذیر رہے۔سعادت خان نے کئی کاروبارکرنے کی کوشش کی جس میں ویڈیوشاپ،ٹریول ایجنسی ودیگرشامل ہیں۔مگرمستقل بنیاد پرکوئی کاروبارمنافع بخش ثابت نہ ہوا۔گاؤں کی زمینیں بیچ کروقت گزارتے رہے۔

چند سال گاؤں میں بھی رہے اور عمر کے آخری دنوں میں اسلام آباد مستقل رہائش پذیر ہوگئے۔کئی سالوں تک دل کی مرض میں مبتلا رہے۔ایبٹ آباد میں میرے برادرنسبتی ڈاکٹر وقار مفتی سے اپنے دل کی بیماری سے متعلق مشورہ کرنے آتے رہے۔آخردم تک خوش باش طبیعت کے حامل رہے۔ان کا انتقال اسلام آباد میں 2010ء میں ہوا۔ان کی زوجہ کا انتقال بھی ہو چکا ہے۔سعادت کا ہشاش بشاش چہرہ اکثر میرے سامنے رہتا ہے۔

عبدالواحدمیر المعروف ’’واحدسراج‘‘:۔

1982ء کا ذکر ہے کہ میں کراچی میں نیوروسرجری کورس کر کے واپس اپنی ڈیوٹی پر ڈسٹرکٹ جنرل ہسپتال ایبٹ آباد جوایوب میڈیکل کالج کا ٹیچنگ ہسپتال تھا آ گیا۔اُنہی دنوں ایک نوجوان بے ہوشی کے عالم میں سر کی چوٹ کے باعث ہسپتال کی سرجری وارڈ میں داخل ہوا۔ان دنوں سی ٹی سکین کی سہولت نہیں تھی۔دوایک دن اسے ہوش نہ آیا تواس قسم کے دیگرسیریس مریضوں کی طرح اُسے بھی یہ کہہ کر ڈسچارج کر دیا گیا کہ ’’اس کا علاج ہمارے پاس نہیں ہے‘‘۔اتفاق سے میں نے اُسے دیکھ لیا چونکہ میں ایک جونیئر کنسلٹنٹ سرجن تھا اس لئے میں انہیں وارڈ میں نہیں روک سکتا تھا۔لہذا ان کے ساتھ آنے

والوں سے ''میں نے پوچھا کیا آپ پرائیویٹ کمرے کا خرچہ ادا کر سکتے ہیں''۔ وہ متمول تھے اور کہنے لگے کہ یقینی طور پر وہ خرچہ برداشت کرلیں گے جس پر میں نے مریض کو اپنے پاس پرائیویٹ داخل کرلیا۔ اللہ کا شکر ہے کہ چند دن میں اُسے ہوش آ گیا اور وہ مکمل طور پر صحت یاب ہو گیا۔

کچھ عرصہ بعد میں اسی مریض کے گھر جو ہسپتال سے متصل کہیال میں واقع تھا ایک مریضہ مسز رمضان کو دیکھنے گیا۔ وہیں اُن کے نوجوان بھائی واحد سراج سے بھی ملاقات ہوئی۔ 1986ء میں مجھے کسی سلسلے میں شملہ پہاڑی کے دامن میں واقع ایبٹ آباد پبلک سکول جانا ہوا جس کے سامنے ایک بنگلے میں چھوٹا سا سکول قائم تھا۔ چونکہ میں ہمیشہ سے تعلیم اور تعلیمی اداروں میں دلچسپی رکھتا تھا لہٰذا اسکول کے اندر چلا گیا۔ وہاں میری ملاقات واحد سراج سے دوبارہ ہوگئی۔ اُس نے مجھے بتایا کہ بی اے کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد اُس نے اپنے شوق کی وجہ سے کسی سے شراکت پر یہ چھوٹا سا سکول قائم کیا ہے۔ اُس کے ارادے بہت اچھے تھے۔ سکول دیکھنے میں سادہ لیکن معیار میں مجھے خاصا پسند آیا صرف کنڈر گارڈن یعنی چھوٹی کلاسوں تک محدود تھا۔ اور یوں ہمارے تعلقات کا باقاعدہ آغاز ہو گیا بعد میں واحد سراج نے اپنے شراکت دار سے علیحدگی اختیار کی اور ذاتی سکول 'ماڈرن ایج' مانسہرہ روڈ سپلائی کے قریب قائم کیا۔ اُنہوں نے اپنے سکول میں ایک آڈیٹوریم تعمیر کیا جس کا افتتاح مشہور مصنف مشتاق یوسفی نے کیا۔ اس ہال کا نام یوسفی آڈیٹوریم رکھا جو ادبی، سائنسی و تعلیمی سرگرمیوں کی آماجگاہ بنا رہا۔

عبدالواحد میر نے ایوب میڈیکل کالج کی ایک طالبہ سمیرا علی بٹ سے شادی کی۔ اُن کی بیگم نے میڈیکل کی تعلیم چھوڑ دی اور ماہر تعلیم بننے کے بعد میاں کی معاونت کرنے لگی۔ واحد جو شروع سے ہی ایک روشن دماغ اور ترقی پسند ذہن کا مالک تھا جلد ہی ادبی اور سماجی حلقوں میں ایک مقبول شخصیت کی حیثیت سے اُبھرا۔ وقت کے ساتھ ساتھ اُس نے تعلیمی میدان میں دلچسپی کی وجہ سے امریکہ میں کئی کورس کئے۔ اکثر مجھے اپنے سکول میں منعقدہ تعلیمی ورکشاپس میں شرکت کرنے کی دعوت دیتا۔ وہ کئی سماجی وفلاحی

اداروں کا فعال رکن تھا اور آج کل بھی ہے۔ میں کئی سال اُن کے سکول میں منعقدہ ہر بدھ کے روز ایلاف کلب کے رکن کے طور پر جاتا رہا۔ اس فورم میں ہر مکتبہ فکر کے لوگ شامل تھے۔ یہ تنظیم ڈاکٹر محمد اکرم نے بنائی۔ وہ سوئٹزرلینڈ سے اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں اور ایبٹ آباد میں مقیم ہیں۔ تنظیم کا نعرہ ذکر اللہ، حب رسول و جذبہ جہاد تھا۔ مختلف مقتدر مقررین کو گاہے بگاہے اس میں شرکت کی دعوت دی جاتی ہے۔ اس لحاظ سے یہ تنظیم امریکہ کے تھنک ٹینک سے مماثلت رکھتی ہے۔ واحد سراج اور ان کے بیگم نے طلباء اور طالبات کے لئے کی تعلیم کیلئے الگ الگ سکول و کالج ماڈرن ایج کے نام سے شروع کئے ہیں جن میں طلباء کو اعلیٰ معیار کی تعلیم فراہم کی جارہی ہے۔

عبدالواحد میر نے پاکستان سٹوڈنٹس کوالٹی سرکل کے نام سے ایک مہم شروع کی۔ حال ہی میں انکی کتاب ایمازون نے سٹڈی کوالٹی سرکل کے نام سے شائع کی ہے۔ واحد سراج کی تعلیم دوستی، عزم و ولولے اور جذبے کو سامنے رکھتے ہوئے میں انہیں پاکستان کی تعلیمی خدمات کے تناظر میں بہت بلند مقام پر دیکھ رہا ہوں۔

پروفیسر سعید قریشی:۔

پروفیسر سعید قریشی سے ملاقات کچھ یوں ہوئی کہ میری ہمشیرہ نسبتی ان سے ایبٹ آباد میں ایم اے انگریزی کی کوچنگ لے رہی تھی۔ اس سلسلے میں وہ کئی بار میرے کلینک آئے اور مجھے احساس ہوا کہ وہ ایک عام معلم نہیں بلکہ ان کا رتبہ اس سے کہیں بڑھ کر ہے انہوں نے مجھے ایک سپوکن انگلش لینگویج ٹریننگ (SPELT) ادارہ سے متعارف کرایا۔ اگرچہ یہ ایک بین الاقوامی تنظیم یا تحریک ہے۔ لیکن ایبٹ آباد میں اس کے قیام کا سہرا پروفیسر سعید قریشی کے سر جاتا ہے۔ اس تنظیم میں انگریزی کے دیگر معلم اور معلمات بھی شامل تھیں۔ اس ادارے کو سالانہ جلسہ کی تقریب منعقد کرنے کے لئے مناسب جگہ حاصل کرنے میں مشکل پیش آتی۔ پہلی بار گورنمنٹ ہائی سکول نمبر 1 ایبٹ آباد میں تقریب منعقد کی گئی۔ اگلے

سال میری وساطت سے اسے ایوب میڈیکل کالج میں منعقد کیا گیا۔

اس ادارے کی ایک سالانہ تقریب میں غیر ملکی ماہرین امریکہ اور دیگر ممالک سے شرکت کے لئے آئے۔ سعید قریشی اس تقریب کے دوران ایک ورکشاپ میں مصروف تھے۔ میں نے سوچا کہ سعید قریشی کے ساتھ تو ویسے بھی رابطہ رہتا ہے کیوں نا میں بین الاقوامی ماہرین کی تعلیمی سرگرمی میں شرکت کروں۔ مگر مجھے محسوس ہوا کہ ان غیر ملکی ماہرین کی سرگرمیاں بڑی غیر متاثر کن تھیں اور ایسے لگا کہ شرکاء بھی صرف ایک مجبوری کے تحت بیٹھے ہوئے ہیں۔ بعد میں وقت گزارنے کیلئے سعید قریشی کی ورکشاپ میں چلا گیا جو نصف سے زیادہ ہو چکی تھی وہاں جا کر پہلی مرتبہ میں سعید قریشی کی تکنیکی صلاحیتوں کا معترف ہو گیا۔ وہ ماہرانہ انداز سے انگریزی زبان کے کسی خاص پہلو پر شرکاء کو ساتھ لے کر چل رہے تھے اور اُنہوں نے اپنے اہداف اس قدر بہترین طریقے سے حاصل کئے کہ میں داد دیئے بغیر نہ رہ سکا اس کا ذکر اُن سے اکثر کرتا رہتا ہوں۔ سعید قریشی کو ریٹائرڈ ہوئے کافی عرصہ ہو گیا ہے میرے ہم عمر ہونگے لیکن جوڑوں کی تکلیف کے باوجود ابھی تک فعال ہیں۔ اللہ انہیں سلامت رکھے۔ ماڈرن ایج کالج کا مستقل حصہ ہیں۔

پروفیسر ڈاکٹر عبدالکریم سعید:۔

عبدالکریم سعید سے ملاقات میرے ایوب میڈیکل کالج میں ملازمت کے کچھ عرصہ بعد ہوئی جب انہوں نے ہمیں بطور اسسٹنٹ پروفیسر میڈیسن جوائن کیا۔ وہ پروفیسر اے جے خان اور ڈاکٹر پروفیسر خورشید احمد کے ہمراہ ڈی ایچ کیو ہسپتال ایبٹ آباد کے واحد میڈیکل وارڈ میں تعینات ہوئے اور جلد ہی بہت مقبول ہو گئے۔ یہ خوش شکل ہونے کے علاوہ ایک انتہائی خوش مزاج انسان تھے۔ ہر دم مسکراتے اور لطیفے سناتے رہتے۔ 1982ء میں ہماری دوستی اس لئے بڑھی کہ ہم دونوں ایک میڈیکل ایجوکیشن ٹریننگ کورس میں شریک ہوئے جس کے بعد ہمارا میڈیکل ایجوکیشن کے حوالے سے رابطہ بہت مستحکم ہو گیا۔ اگلے بیس تیس سال تک ایبٹ آباد اور دیگر شہروں خاص کر کراچی اور متعدد ممالک میں منعقدہ

تربیتی کورسز میں اکھٹے رہے چونکہ ہم الگ الگ کمروں میں رہنے کی استطاعت نہیں رکھتے تھے۔

جب بھی ہم اکھٹے ایبٹ آباد شہر سے باہر جاتے تو ایک ہی کمرے میں رہائش اختیار کرتے اور پھر اس قدر عادت ہوگئی کہ جب ہمیں الگ کمرے بھی الاٹ ہوتے تو بھی ہم نے ایک ہی کمرے میں رہنا پسند کرتے۔ ایک بار کراچی کے گیسٹ ہاؤس میں، میں نے انہیں کہا کہ پاشا میں تمہارے ہر ایکشن کی پیش گوئی کر سکتا ہوں۔ انہوں نے فٹ سے میرا امتحان لینا چاہا اور کہا اچھا بتاؤ میں ابھی کمرے میں داخل ہوا ہوں اس کے بعد کیا کروں گا؟ میں نے چند لمحے سوچا اور ایک کاغذ کے اوپر کچھ لکھ کر میز پر اُلٹا رکھ دیا اور کہا کہ آپ جو ایکشن کرنا چاہتے ہیں کریں۔ وہ بیڈ پر بوٹوں سمیت لیٹ گئے اور اُس کے بعد ہنسنے لگے اور کہا بتاؤ کیا لکھا ہے؟ میں بھی ہنسنے لگا میں نے کاغذ اُلٹایا۔ اُس پر لکھا تھا کہ اب آپ بیڈ پر بوٹوں سمیت لیٹ جائیں گے، ایک دوسرے کو جان چکے تھے۔ مجھے پتہ تھا کہ جب بھی یہ تھکے ہوئے کمرے میں آتے تو جوتے اور کپڑے تبدیل کرنے کی بجائے اسی طرح لیٹ جاتے۔ اُن کی دیگر عادات میں یہ بھی تھا کہ وہ صبح دو یا تین بجے اُٹھ جاتے اور بغیر مجھے ڈسٹرب کئے سائیڈ لائٹ لگا کر اپنی پڑھائی میں مصروف ہو جاتے جب کہ میں اتنی جلدی اُٹھنے کا عادی نہیں تھا۔ ایک بار تو ایسا ہوا کہ کمرے میں سائیڈ لائٹ نہیں تھی تو انہوں نے ایک طرف چادر لٹکائی اور باتھ روم کا بلب روشن کر کے پڑھنا شروع کر دیا۔

عبدالکریم سعید کے ساتھ تعلیمی سرگرمیوں کے سلسلے میں مختلف جگہ اکھٹے رہنے کے علاوہ بہت سارے واقعات اور کئی خوشگوار یادیں وابستہ ہیں۔ ایک بار ہم قاہرہ پہنچے تو قاہرہ ایئر پورٹ پر ہم سب کو کلیئر کر دیا گیا۔ سوائے ان کے تو معلوم ہوا کہ انہیں روک لیا گیا ہے۔ لگ بھگ ایک گھنٹہ ہمیں انتظار کرنا پڑا۔ پتہ چلا کہ کھلتے ہوئے رنگ اور چھوٹی داڑھی ہونے کی بناء پر حکام کو ان کے ایرانی ہونے کا شبہ ہوا۔ اُس زمانے میں غالباً ایران اور مصر کا آپس میں سیاسی تناؤ تھا۔ شاید اسی لئے ان کے بارے میں جانچ پڑتال کرنا پڑی۔ اسی طرح جب ہم اسماعیلیہ میں کمیونٹی اورینٹڈ میڈیکل ایجوکیشن کا لیکچر سن رہے تھے کہ

ایک لفظ OSCE بار بار کہا جا رہا تھا ہمیں سمجھ نہ آئی اور میں نے پاشا سے پوچھا یار یہ کیا ہے؟ اُس نے کہا کہ مقرر Horskey بول رہے ہیں یعنی گھوڑے کی چابی۔ یہ کوئی ایسا لفظ ہے جو میڈیکل یجوکیشن میں استعمال ہوتا ہوگا۔ ہم بڑی مشکل میں پڑے رہے اگرچہ پاکستانی گروپ دیگر ممالک کے ماہرین کے ساتھ تھے ۔مگر کسی سے پوچھنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ بعد میں ہمیں اصل بات پتہ چلی کہ یہ تو Objective Sturctured Clinical Examination کی بات ہو رہی ہے۔ اس واقعہ سے خاصے عرصے تک محظوظ ہوتے رہے۔

ایک اور موقع پر ہم کسی ایئر پورٹ پہ کھڑے تھے تو دور سے ایک خاتون نے ہمیں دیکھ کر ہاتھ ہلانا شروع کر دیا۔ پاشا نے کہا میں سمارٹ آدمی ہوں اور یہ خاتون میری طرف اشارے کر رہی ہے۔ میں نے اُسے کہا'' یار تم اپنا چہرہ تو دیکھو کہ ختم ہی نہیں ہوتا۔ (پاشا کے سر کے بال ذرا کم تھے) خاتون کا ہدف میں ہوں خاتون جب زیادہ قریب پہنچی تو اچانک ہمیں احساس ہوا کہ یہ تو ہماری ایک شاگرد عزیزہ ہے۔ اُس نے دور سے دیکھ کر ہمیں پہچان لیا تھا۔

کمیونٹی اورینٹل میڈیکل ایجوکیشن پروگرام کے حوالے سے میں نے اور پاشا نے مل کر بہت محنت سے ایوب میڈیکل کالج میں اس پروگرام کو آگے بڑھایا۔ صوبائی اور قومی سطح پر بھی ہم نے اس پروگرام میں ٹرینز کی حیثیت سے اپنا حصہ ڈالا۔ اس کے علاوہ کالج آف فزیشن وسرجن پاکستان کی ٹریننگ ورکشاپوں میں اکثر ہم اکھٹے ہوتے جب بھی کوئی ہینڈ آؤٹ ملتا تو پروفیسر عبدالکریم سعید انتھک کوشش کرتے کہ ایک کی بجائے دو کاپیاں لے لیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ایک ہینڈ آؤٹ تو استعمال کر کے خراب ہو جائے گا۔ دوسرا ہینڈ آؤٹ ہم اپنے پاس ریکارڈ کے طور پر رکھیں۔ یہ عادت بعد میں مجھے بھی پڑ گئی اور آج بھی جہاں جاتا ہوں ایک کی بجائے دو پرنٹ لیتا ہوں۔

اُن سے میری آخری ملاقات لاہور میں واقع اُن کے گھر کی لائبریری میں میری ریسرچ کے

حوالے سے ہوئی جو چند گھنٹے جاری رہی۔ پاشا آج کل ریٹائرمنٹ کے بعد خوشگوار زندگی گذار رہے ہیں۔ ان کا ایک بیٹا عبیداللہ میرے بیٹے سعد کا دوست ہے۔

ڈاکٹر احمد نیاز خان:۔

ڈاکٹر احمد نیاز میرے جناح آباد ایبٹ آباد کے ہمسائے اور محسن ہیں۔ ہماری موجودگی یا غیر موجودگی میں ان کی جانب سے گھر کی نگرانی ہوتی۔ میاں بیوی دونوں انتہائی با ذوق، شرافت کا پیکر اور لوگوں کی مدد میں ہمیشہ آگے رہتے۔ وہ زیادہ وقت آئی سی آئی ملٹی نیشنل پاکستان کی ڈسپنسریز کے انچارج رہے۔ انکے روابط پاکستان بھر کے سینئیر گروپ کے سپیشلسٹ ڈاکٹروں سے رہتے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد ایبٹ آباد میری ہمسائیگی میں مقیم ہوئے۔ وہ اور انکی بیگم آمنہ ایک لمبے عرصے تک اپنے سپیشل بیٹے 'مٹھو' کی دیکھ بال کرتے رہے۔ جسکی وفات چند ماہ پہلے ہوئی جبکہ ایک اور بیٹا جو سڈنی میں مقیم تھے کورونا کی وجہ سے انتقال کر گئے۔ ان کا ایک اور بیٹا ڈاکٹر توقیر بمع فیملی انگلینڈ میں مقیم ہے۔ یہ دکھی ماں باپ بڑے حوصلے سے زندگی گزار رہے ہیں میں ہر لمحہ دعا گو ہوں کہ اللہ انہیں صحت اور لمبی عمر دے۔

کرنل صدیق (مرحوم) و کرنل علی صدیق:۔

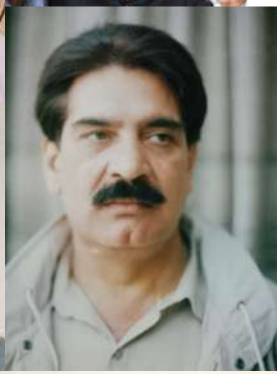
کرنل صدیق کا تعلق بہاولپور سے تھا ۔فوج کے سینئر افسروں اور جناح آباد کے انتہائی فعال رہائشیوں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ سٹریٹ 11 کے روح رواں تھے اور جناح آباد کے لئے قبرستان سمیت بہت سی سہولیات مہیا کرنے میں انہوں نے اہم کردار ادا کیا۔ وہ بلاشبہ خدمات کی انجام دہی کے حوالے سے رول ماڈل تھے۔ ان کے بیٹے کرنل علی (ریٹائرڈ) بھی میرے خاص دوست، مہربان اور کبھی کبھی میزبان بھی ہو جاتے ہیں۔ نفیس انسان ہیں۔ علاقے میں خصوصی طور پر لوگوں کی دیکھ بھال میں مصروف رہتے ہیں۔

جناح آباد کے مکین:۔

ہم جناح آباد ایبٹ آباد میں 1982ء سے مقیم ہیں۔ اس دوران ہم جناح آباد کے رہائیشوں










TOM SAWYER
ST. LOUIS




MODERNAGE



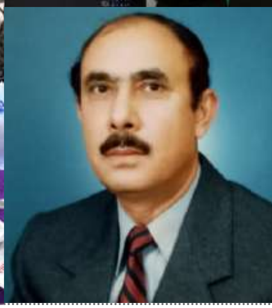


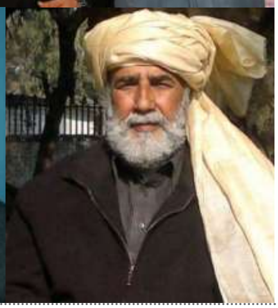












نے جناح آباد ویلفیئر سوسائٹی (JAWS) کے نام سے بنائی۔اس کے بانیوں میں میرے علاوہ ڈاکٹر سید سلطان، خواجہ کاظم، سردار آمان، کرنل مختار، میجر دورانی، منظور خان، پروفیسر ستار، انجینئر شاہد عزیز، انجینئر میر محی الدین، آفتاب جمال بنگش، امان اللہ خان (اے یو خان) مرحوم، انجینئر ملک سرور و بہت سی دیگر شخصیات شامل ہیں اس سوسائٹی کی خدمات، رنگینیوں و رعنائیوں کا چرچہ دور دور تک تھا۔خواتین کے لئے الگ سے کلب قائم تھا۔سالانہ میلے کی رونقیں اور انتخابات کی گہما گہمی کی یادیں بھی دلوں میں تازہ ہیں۔ خواجہ محمد کاظم بہت عرصے تک انتہائی فعال کردار ادا کرتے رہے اور حال ہی میں انہوں نے جناح آباد فیملی کا واٹس ایپ گروپ بنا کر پرانے اور نئے ممبران کو یکجا کرنے کی سعادت بھی حاصل کی ہے بعد میں کرنل محمد صدیق (مرحوم)، علی صدیق، بابا جانی، ڈاکٹر نیاز، متین صاحب، یوسف، سردار عارف ایڈوکیٹ، اقبال قریشی، زاہد مفتی، توفیق صاحب، سید افسر صاحب و چند دیگر صاحبان نے کما حقہ ہو اپنے فرائض نبھائے اور آج کل جان محمد بنگش اور اویس خان ایڈوکیٹ بہت تندہی سے جناح آبادیوں کی بہبود کے لئے کام کررہے ہیں۔سٹریٹ نمبر 11 کے رہائشی پچھلے کئی سالوں سے اپنی خصوصی نشست اور محلہ گیری سرانجام دے رہے ہیں۔ان میں بہتوں کے نام اوپر درج ہو چکے ہیں۔اتنی فعال سوسائٹی کی مثال شاید ہی کہیں ہو۔بہت سارے ساتھیوں کے نام یہاں لینا ممکن نہیں رہا جس کے لئے معذرت خواہ ہوں۔

موجودہ دور میں جان محمد بنگش اور اویس ایڈوکیٹ جو ہماری نوجوان نسل سے ہیں نے JAW's کو اپنی سربراہی میں لے کر نئی تازگی دی وہ بہت مستعدیِ جرات اور مستقل مزاجی سے JAW's کو آگے بڑھا رہے ہیں۔

باب نمبر 20

میرے مشعل راہ

ماں باپ دونوں طرف سے ہمارا گھرانہ پڑھا لکھا ،معاشرے میں باعزت اور وقت کے تقاضوں کے مطابق قدرے ماڈرن تھا لیکن جدی پشتی ہم عملاً مذہبی رجحان اور اقدار رکھتے ہیں۔ پھر بھی میرے دادا مفتی محمد عارف پیر مہر علی شاہ گولڑہ شریف کے مقلد تھے۔ ہمارے گھر میں اہل بیت وصحابہ کرام کے علاوہ حضرت غوث اعظم غلام جیلانی کا ذکر بھی اکثر رہتا۔ میرے دادا کے بھائی پڑھے لکھے سبز پوش فقیر تھے۔ محافل سماں بھی سجتی تھیں۔ زیارات مقدسہ پر جانا دعائیں کرنا بھی شامل تھا۔ بہت بچپن میں داتا گنج بخش کے مزار پر اپنے والدین یا ماموں کے ساتھ گیا تھا۔ ذہن میں یہ بات رچ بس گئی تھی کہ کچھ لوگ عام لوگوں سے ہٹ کر زیادہ صاحب علم وصاحب کشف ہوتے ہیں۔ اس پیش منظر کے تحت زندگی میں بہت سارے غیر معمولی دینی رجحانات اور کشف کے مالک لوگوں سے متاثر رہا اور ان کی محفلوں میں بیٹھتا بھی رہا۔ انسان نفسیاتی طور پہ کمزور واقع ہوا ہے۔ ہر مضبوط سے مضبوط ذہن کے مالک کو بھی کئی دفعہ مشکل حالات میں سہارے کی ضرورت ہوتی ہے۔ بابوں کے مرتبوں کو جانچنے کیلئے کوئی مستند فارمولا تو میرے پاس نہیں ہے۔ البتہ یہ ضرور کہوں گا کہ ان کے اندر کچھ خصوصی صلاحیتیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ودیت کی ہوتی ہیں اور بہت سارے عام ذہن یا خصوصی ذہن رکھنے والے لوگ اس سے استفادہ کرتے رہتے ہیں۔ برے وقتوں میں ان کی دعائیں لینا باعث استقامت ہوجاتی ہیں۔ اس باب میں ان بابوں کا ذکر ہے۔

مفتی عبدالصمد:۔

باباؤں سے رغبت اور تربیت مجھے گھر سے ہی ملی۔ چھوٹی عمر سے ہی قرآن پڑھنے اور دیگر علوم فارسی سیکھنے کے لئے ہمارے گھر واقع گنج سے متصل ہمارے دادا کے بھائی حافظ عبدالصمد سے شناسائی ہوئی جو غیر شادی شدہ اور درویش منش انسان تھے۔ گھڑسواری اور موسیقی کے شوقین تھے۔ میرے بھائی

خالد مفتی ان کے پاس جایا کرتے تھے انہوں نے فارسی کی چند دقیق کتب'' گلستان سعدی'' یا'' مثنوی مولانا روم'' بھی پڑھی۔

سیٹھی عبدالغفور:۔

ہمارے سکول میں ایک بابا آتے تھے جو **دن کر یچو،دن کر یچو،دن کر یچو** کہتے رہتے جسکا مطلب دانتوں کا رگڑھنا(Teeth Grinding)'یعنی جگالی کرنا تھا ہم بچوں میں وہ اسی نام سے مشہور تھے (بچے چونکہ ہمیشہ کچھ نہ کچھ کھاتے رہتے ہیں) جس کی وجہ سے اسکا یہ نام پڑا۔سکول میں آ کر بچوں سے عربی میں کچھ پوچھتے اور پھر بورڈ پر اس کا مطلب بھی لکھتے تھے۔طلباء کے ساتھ مستی کرتے اور اگر کوئی طالب علم زیادہ ہنسی مذاق کرتا تو اسے مذاق میں کہتا کہ میں تمہیں مسجد مہابت خان کے مینار سے پشاوری قہوہ پلا کر نیچے گراؤں گا اور پھر چلا جاتا۔ایک بار بازار کلاں میں جمعہ کے دن میں نے دیکھا کہ وہ سڑک کو بند کرنے کے لئے زمین پر لیٹ گیا اور لوگوں سے کہہ رہا تھا کہ اپنا کاروبار بند کر کے جمعہ کی نماز پڑھنے چلیئے۔اس کے پیغام پہنچانے کا ایک الگ ہی انداز تھا۔ان کے عربی سیکھانے کی اہمیت بہت بعد میں مجھ پر اجاگر ہوئی۔

حافظ علی احمد:۔

غالباً میری عمر چار پانچ سال ہوگی۔میں اپنی والدہ کے ہمراہ اکثر و بیشتر سرکی دروازے کے اندر عزیزوں کے گھر جایا کرتا۔وہاں بوگل عقیلہ (فاروق جان) نام کی میری والدہ کی ہم عمر،اُن کی دوست اور بھتیجی بیاہی ہوئی تھی ۔میں ان سے بہت مانوس تھا اور وہاں کئی بار پورا دن یا رات بھی رہتا۔ وہاں ایک بہت بڑا کمرہ ڈرائنگ روم سے متصل تھا جو باقی گھر سے نسبتاً نیچے تھا اور اس کو طبیلہ کہتے تھے۔ یہاں کسی حد تک اندھیرا ہوتا تھا۔اوپر والی سٹوری میں سفید داڑھی والے بہت ہی با عمر شخص رہتے تھے۔ جنہیں حافظ جی صاحب (حافظ علی احمد) کہہ کر سب لوگ پکارتے اور بہت ادب بھی کرتے تھے۔ان کے

گھر کے اندر ایک کمرہ تھا جو تاریک کوٹھڑی کہلاتا تھا۔اور بزرگوں کے زمانے سے عبادت گاہ و چلہ خانہ تھا۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ حافظ علی احمد پشاور کے جید عالم، صاحب کشف اور روحانی پیشوا تھے۔اور ببوگل عقیلہ کے سسر تھے۔حافظ علی احمد کے پوتے صاحبزادہ خورشید احمد (لالی گل) ریٹائرڈ سیشن جج ہیں اور آجکل شامی روڈ پر مقیم ہیں۔حافظ علی احمد پشاور میں ہندکو زبان بولنے والے بزرگ تھے۔کچھ عرصہ پہلے جب ایک پرانی انگریزی میں لکھی ہوئی کتاب "The King of Kabul" انٹرنیٹ پر میسر ہوئی تو پڑھنے پر یہ معلوم ہوا کہ حافظ علی احمد کے آباؤاجداد (جن کی رہائش گاہیں اردگرد کے علاقے میں تھی) اس قدر مشہور تھے کہ اُن کے پاس کابل کے شہزادے اور شہزادیاں تربیت ونصیحت کے لئے بھجوائے جاتے تھے۔انگریز مؤرخ نے بھی اُن کا نام بڑے ادب سے لیا ہے اور یہ خاص طوران کے بڑوں کے متعلق لکھا کہ وہ بے لوث انسان تھے۔جن کی طلب انگریز حکومت سے کچھ نہ تھی۔البتہ وہ افغانستان سے آکر پشاور میں مقیم ہو گئے تھے۔اپنی کشف وکرامات کی وجہ سے جانے جاتے تھے۔

حافظ علی احمد کے تین بیٹے تھے۔سب سے بڑے بیٹے صاحبزاہ سید احمد (جن کی قبر خاندانی قبرستان میں موجود ہے) کے متعلق زیادہ معلومات نہیں ۔ پروفیسر ڈاکٹر عبد الجلیل پوپلزئی (فارما کالوجسٹ) اُن کو اپنے نانا قرار دیتے ہیں۔دوسرے نمبر پر صاحبزادہ مشتاق فارن سروس میں تھے اور کچھ عرصہ کابل سفارتخانے میں بھی بطور آفیسر مقیم رہے۔ان کی بیگم فاروق جان بعرف ببوگل عقیلہ جن کا ذکر اُوپر آچکا ہے۔میری ماموں زاد بہن تھیں اور عمر میں میری والدہ کی برابر ہونے کی وجہ سے آپس میں گہری سہیلیاں تھیں۔ان کے دوسرے بھائی صاحبزادہ ممتاز جو صوبائی حکومت میں ڈپٹی سیکریٹری ریٹائرڈ ہوئے اور ان کے بیٹے صاحبزادہ خورشید ریٹائرڈ سیشن جج اور احتساب کمیشن کے ممبر بھی رہے۔

حافظ جی میری یاد میں خاصے ضعیف، کم گفتار و گوشہ نشین تھے لیکن ہر کوئی ان کا انتہائی ادب کرتا، جب میں 2005ء میں خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کے مزار پر دہلی گیا۔تو وہاں ان کے متولی سے

ملاقات ہوئی جو نظام الدین کی اولاد میں سے تھے 90 سال کے لگ بھگ ہونگے۔ انہوں نے بات چیت میں مجھ سے پوچھا کہ میں پشاور سے حافظ علی احمد کو جانتے ہیں۔ میں نے کہا جی وہ میرے بزرگ اور رشتہ دار تھے۔ یہ سن کر وہ بہت خوش ہوئے دلچسپ بات یہ ہے کہ وہ میرے سسر مفتی نثار احمد کو بھی جانتے تھے جو کہ اکثر پاکستان کے مختلف وفود کے ہمراہ ڈپٹی سربراہ کے حیثیت سے زیارات کیلئے بھارت جایا کرتے تھے۔ حافظ علی احمد دین کا درس دیتے تھے۔ جامع مسجد ڈھیری باغ بانان کے امام بھی تھے، نماز جمعہ باقاعدگی سے پڑھاتے، ان کے بہت سے شاگردوں میں جید عالم مولوی امیر شاہ مرحوم (مولوی جی) نے بہت شہرت حاصل کی۔ میرے خیال میں مجھ پر تھوڑا بہت اثر انکی شعاعوں کا ہے۔

سید گوہر علی شاہ (شیخ محمدی والا بابا):۔

''شیخ محمدی'' پشاور کے مضافات میں کوہاٹ روڈ سے گزر کر سائفن کے قریب ایک چھوٹا اور کچے گھروں سے بنا گاؤں تھا اب بدلتے وقت کے تقاضوں نے اسے بھی پکا گاؤں بنا دیا ہے۔ گاؤں کے باہر انگور کے باغات ہوا کرتے تھے۔ ان ہی باغات میں ایک پانی کا چشمہ تھا جو شیخ کا چشمہ کہلاتا تھا۔ اس میں لوگ نہانے اور تفریح کیلئے جاتے تھے۔ (پشاور میں اس طرح کا ایک اور چشمہ جو جان کا چشمہ کہلاتا تھا آج کل بھی ورسک روڈ پر خوشحال پارک کے اندر ایک سوئمنگ پول کی شکل میں موجود ہے)۔ ایک چھوٹے سے نالے کے اوپر تین یا چار فٹ اونچی کچی چھت والی چھوٹی سی جھونپڑی کے اندر داڑھی والا چھوٹے قد اور زیادہ عمر کا بابا بیٹھا کرتا تھا۔ ہمیں اُس کا پتہ ہمارے ایک دوست اللہ داد نے دیا جو بعد میں میونسپل کمیٹی پشاور کے ایڈمن آفیسر بنا۔ اس نے یہ پتہ اُس وقت دیا جب ہم دوست ایک مرتبہ شیخ محمدی کے علاقے میں پکنک منانے گئے۔ ہم بابے کے پاس پہنچ گئے۔ بابا جی ہاتھ میں ریڈیو پکڑے اُلٹی سیدھی باتیں کر رہا تھا۔ اُس کے اردگرد لکڑی کی چوکیوں پر کچھ مرد بیٹھے تھے۔ پیچھے کچھ دور سفید برقعوں میں ملبوس چند خواتین جو گاؤں کی رہائشی لگتی تھیں بیٹھی ہوئی تھیں۔ ہم بھی بیٹھ گئے اگرچہ روحانی لحاظ سے کوئی متاثر کن

ماحول نہیں تھا مگر پُرلطف ضرور تھا چنانچہ بعد آذان ہم تفریح و پکنک کے بہانے بابے کے پاس پہنچ جاتے۔ کئی بار اپنے ساتھ چپل کباب اور روٹی یا پکوڑے وغیرہ بھی لے جاتے جنہیں بابا سارے لوگوں میں تقسیم کر دیتا اور ہم بھی کھاتے۔

بابا کی شخصیت بڑی عجیب سی تھی، اکثر و بیشتر ریڈیو سے ہی کھیلتا رہتا۔ ہم ہر بار جاتے تو نیا ریڈیو سیٹ ہوتا۔ ایسا لگتا کہ اس نے ریڈیو کی مشینری وغیرہ نکال دی ہے جس کے بعد ریڈیو سے مختلف آوازیں آتیں۔ بابا خود ریڈیو کا کمپئر بن کر کہتا" دا لندن دے "(یہ لندن ہے)" دا بمبئی دے " 'جاپان دے' وغیرہ وغیرہ، کبھی اردو، انگریزی اور پشتو میں لگا رہتا۔ آخر میں جسے رخصت کرنا ہوتا اسے کہتا" دُعا بہ کوؤ" یعنی دُعا کرینگے اور سب لوگوں کو دُعا کر کے رخصت کر دیتا۔ اکثر و بیشتر اپنی پھٹے پرانے لحاف نما گدی/ چٹائی جس پر یہ بیٹھا ہوتا اس کے نیچے سے خشک لیموں یا مالٹے کے چھلکے لیتا ان کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کرتا اور لوگوں میں بانٹ دیتا جسے وہ تبرک سمجھ کر کھا لیتے۔ چائے کا دور بھی چلتا رہتا۔ چھوٹی چھوٹی چائے کی پیالیوں میں روایتی کالی چائے دی جاتی۔ اکثر سبز چائے یعنی قہوہ بھی بنتا، بابا خود بھی بنا لیتا۔ اُس کے پاس ایک چھوٹی سی پتیلی تھی جس میں چائے بنتی۔ چند کتے بھی بابا جی کے ارد گرد گھومتے پھرتے اور مزے لے کے روٹی اور کھانے پینے کی دیگر اشیاء کھاتے۔

ہم تو مزے لینے بابا جی کے پاس جاتے لیکن کافی لوگ اُس کے پاس مختلف مسائل لے کر آتے۔ خواتین بھی آتیں، وہ کھلے آسمان تلے سب کو شارٹ کٹ میں باتیں کرتا۔ سمجھا دیتا یا دُعا دیتا اور رخصت کرتا۔ بابے کو میں نے کئی دفعہ قرآنی آیات پڑھتے سنا لیکن یہ آیات کوئی ترتیب میں نہ ہوتیں۔ ہم اُسے اکثر بالکل ویسے ہی مجنوں بابا سمجھ کر محض تفریح کے لئے جاتے رہے۔ ایک بار میرے والد صاحب عین اُس وقت آ گئے جب میں اور میرا دوست ڈاکٹر ہمایوں شیخ محمدی جانے کو تیار تھے یہ ہمارا ایم بی بی ایس کا پنجم سال تھا ہم امتحانی تیاری کے سلسلے میں میرے ماموں میاں یوسف قریشی کے گھر گلبہار نمبر دو میں

رہتے تھے۔ والد صاحب نے پوچھا'' کہاں جارہے ہو'' ہم نے بتادیا انہوں نے کچھ نہ کہا۔ پتہ لے لیا دوسرے دن میرے والد آئے مجھے کہنے لگے " یار میں کل ملا ہوں شیخ محمد و کے بابا سے۔آپ اُس کے پاس جایا کریں مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے"۔ میں بڑا حیران ہوا کیونکہ میں نے اپنے والد کو کسی پیر پرستی یا بابے وغیرہ کا ذکر کرتے ہوئے نہیں سُنا تھا۔ میں نے والد سے استفسار کیا اور آخر اصرار کرنے پر انہوں نے بتایا کہ " میں نے قرآن پاک سے بابے پہ ایک سوال کیا۔ اُس نے اپنے حالت مجنوں پن میں میرے سوال کا قرآنی آیت سے ہی جواب دے دیا۔ میں نے مزید سوال آیت کی صورت میں کئے اور وہ سب کا جواب دیتا رہا" آخر میں غصہ ہو گیا اور کہا تم مجھے نہیں جانتے تو پھر یہاں کیا کر رہے ہو۔ جاؤ اور پھر نہ آنا اور میں وہاں سے آ گیا۔ اس بات سے ہمیں معلوم ہوا کہ بابے میں کچھ کرامات ضرور ہیں۔ مزید معلومات کرنے پر پتہ چلا کہ بابا نوجوانی سے ہی اپنا آستانہ یہاں لگائے بیٹھا تھا اور پچھلے چالیس، پچاس سال سے لوگوں کا اس کے پاس رش لگا رہتا۔ ہم نے دعا لینے والے سائلین سے بھی ان کی رائے پوچھی جن کا جواب خاصا مثبت تھا۔ بابا جی کی صورت میں لوگوں کو ایک مسیحا دستیاب تھا۔ یہ بھی پتہ چلا کہ بابا جی کی وجہ سے کئی بے راہ اور گمراہ ہونے والے افراد بھی دین کی جانب لوٹ آئے۔

جب میں ایم بی بی ایس کے بعد ملک سے باہر جانے کا سوچ رہا تھا تو اُس زمانے میں ایک طرف تو میرے بھائی ڈاکٹر خالد نے انگلینڈ سے میرے لئے کاغذات بھجوائے تھے جو مجھے برطانوی سفارت خانے لے جانے تھے تا کہ ویزہ لے سکوں تو دوسری طرف مجھے نائیجیریا (جہاں میرے بہت سے ساتھی جا رہے تھے) سے مجھے بھی بہت اچھی پیش کش آ گئی، ظاہر ہے میں کشمکش میں تھا اور بالآخر بابے کے پاس چلا گیا۔ دل میں سوچا کہ میں بابے کو تفصیل نہیں بتاؤں گا اور اسے تھوڑا سا ٹیسٹ بھی کروں گا۔ میں نے اُسے کہا مجھے سمجھ نہیں آتی کہ میں کہاں جاؤں۔ بابے نے پہلے تو کوئی جواب نہ دیا۔ مگر میرے بار بار اصرار کرنے پر اور بہت تنگ کرنے پر بابے نے کہا کہ جہاں بھائی کہتا ہے وہاں جاؤ۔ میں نے

پوچھا دوسری جگہ کیوں نہ جاؤں۔اُس نے کہا سات سمندر پار ہے۔گرمی ہے اور لوگ جس طرح کالے ہیں اُن کا دل بھی کالا ہے۔پھر اس بات سے مطمئن ہوکر میں نے نائیجیریا نہ جانے کا حتمی فیصلہ کرلیا۔کچھ دنوں بعد سیدھا اسلام آباد گیا۔ویزہ لیا اور برطانیہ چلا گیا۔سال دو بعد میرے بھائی خالد نے خواب دیکھا کہ شیخ محمدی والا بابا اپنی جگہ موجود نہیں ہے۔ہفتہ ڈیڑھ کے بعد پشاور سے آنے والے خط کے ذریعے معلوم ہوا کہ بابا انتقال کرگیا ہے۔

کئی سالوں بعد 2017ء کے شروع میں جب میرا بھانجا عثمان کرمانی کو نائیجیریا میں پراجیکٹ منیجر بننے کی آفر آئی۔کچھ پس وپیش کے بعد وہ وہاں چلا گیا۔خیال یہ تھا کہ بہت مالدار ملک ہے تیل نکلتا ہے۔توضرور حالات اچھے ہونگے۔اُس نے وہاں کے حالات کا بتایا تو مجھے بابے کی باتیں یاد آگئیں۔بلاشبہ وہ جگہ میرے جانے کی نہ تھی۔بہرحال بابے کی کرامات کا اثر کافی عرصے تک لوگوں کے دماغوں میں رہا۔

حضرت سید محمد امیر شاہ قادری گیلانی (مولوی جی صاحب):۔

حضرت سید محمد امیر شاہ قادری گیلانی المعروف مولوی جی (1920-2004ء) شیخ عبدالقادر جیلانی بغدادی ''غوث الاعظم'' کی 23 ویں پشت محلہ یکہ توت میں سید احمد شاہ ولد آغا پیر جان ولد آغا زمان شاہ کے یہاں پیدا ہوئے۔جدوامجد سید حسن قادری (سید حسن بادشاہ) کی خانقاہ ومسجد بیرون دروازہ یکہ توت لوگوں کے لئے چشمہ خیر وبرکت ہے۔مولوی جی صاحب کی زندگی ''در جوانی توبہ کردن شیوہ پیغمبری'' کے مصداق تھی۔

مولوی جی نے خود مجھے بتایا تھا کہ وہ حافظ علی احمد صاحب کے شاگرد خاص تھے اور انہیں اپنے روحانی مدارج کا منبع تصور کرتے تھے۔سات بیٹوں اور دو بیٹیوں کی صورت میں نعمت اولاد کی دولت سے مالا مال تھے۔ان کے بیٹے شیر آغا،جان آغا،سید آغا،سلطان آغا،تاج آغا اور نورالحسنین آغا ہیں۔مولوی جی انتہائی نرم مزاج اور بہت ہی ہلکے لہجے میں گفتگو کرنے والے عالم اور قابل قدرت مصنف

تھے۔ان کے گھر کی بیٹھک میں کئی پشتوں سے دینی محفلیں جاری تھیں۔مولوی جی نے قرآن وحدیث کی تفاسیر تحریر کیں ۔ ان میں سے بہت سی مرید خاص اور میرے ہمسائے منظور الٰہی قادری نے شائع کروائیں۔ڈاکٹر انعام قادری اور انکے بھائی نذیر قادری نے بھی چند کتابیں شائع کیں اورانہیں کے پاس ان کتابوں کی تفصیل وذخیرہ بھی موجود ہے۔پشاور میں ''مولوی جی ہسپتال'' انکے کے نام سے منسوب ہے۔یہ ہسپتال بچوں کے علاج معالجے کے حوالے سے شہرت رکھتا ہے۔

مولوی جی کی رشتہ کی بہنیں ''محلہ کالے کی کھوئی'' پشاور یکہ توت دروازے کے اندر رہتی تھیں ۔ میں اپنی والدہ کے ہمراہ ان کے گھر جاتا۔میری والدہ ان کی انتہائی تعظیم بھی کرتی تھیں اوراُن سے بہت اچھی رہنمائی بھی حاصل کرتیں۔ہمارے خاندان کی دیگر خواتین بھی اُن کے گھر جاتیں اُنہیں بڑی قدراورمنزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا۔مولوی جی کے پاس میرے خاندان کے دیگر تمام لوگ اورخصوصاً میرے سسر مفتی نثار احمد بھی جایا کرتے تھے ان پرمولوی جی کی خاص نگاہ کرم تھی ۔آپ ختم غوثیہ پڑھا کرتے تھےاورلوگوں کے گھروں میں بھی جاتے۔مہینے میں ایک بار یا پھر سال میں ایک بارمیرے سسر کے گھر 38 گلبہار نمبر ایک میں ختم غوثیہ پڑھا جاتا تھا جس میں،میں نے بھی چند بارشمولیت کی۔ مولوی جی کی ان روحانی تقریبات میں شرکت بڑی سحر انگیز ہوا کرتی تھی۔

میرا ذاتی تعلق اُن سے تب ہوا جب میں انگلینڈ سے واپس آکر ایبٹ آباد میں مقیم ہوا۔ مہمانوں کی بہت بڑی تعداد کی وجہ سے میں نے نتھیاگلی میں دو کمروں پر مشتمل گھر جوکالا باغ ۔موچی ڈھارہ میں صوبائی حکومت کی ملکیت تھا کواجارے پر حاصل کرلیا جس کے بعد مہمانوں کی آمدورفت اس گھرمیں شروع ہوگئی۔جب بھی ہمارے گھرمیں رش زیادہ ہوتا تو چند مہمانوں کو میں دعوت دیتا کہ وہاں جا کررہیں۔سب لوگ وہاں رہنے پر خوش تھے۔مولوی جی ایبٹ آباد میں اپنے بیٹے حسنین کے گھر آیا کرتے تھے مجھ سے ملاقات ہوئی تو پتہ چلا کہ وہ میرے نتھیاگلی والے گھر میں کئی سال سے گرمیوں

میں رہا کرتے اور وہیں یکسوئی سے کتابیں لکھتے۔ مجھے شرمندگی ہوئی کہ یہ گھر اب میرے نام تھا میں نے بہت اصرار کیا کہ مولوی جی مجھ سے گھر لے لیں لیکن کیا عظیم شخصیت تھے کہ انہوں نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔

1984-85ء میں مولوی جی ایبٹ آباد میں میرے جناح آباد والے گھر میں بھی تشریف لائے۔ بعد میں ان سے مسلسل رابطہ رہا۔ مجھ پر بہت مہربان تھے۔ اپنی لکھی ہوئی شمائل ترمذی مجھے عطا کی۔ انکا ملنا اس قدر محبت اور چاہت والا تھا کہ ہر ملنے والا ان کو سب سے زیادہ عزیز سمجھتا تھا۔ آپ وہ ہمہ صفت شخصیت تھے کہ جن کے اوصاف کا احاطہ کرنا بہت مشکل ہے، میں سمجھتا ہوں کہ وہ کمال درجے کی استقامت رکھتے تھے۔ علمی گفتگو کے علاوہ دعائیں اور دیگر اذکار سکھاتے۔ مولوی جی پشاور کے تقریباً ہر مکتبہ فکر کے مقبول بزرگ تھے۔ مولوی جی نے ایک بار سید مستان شاہ جی سرکار کے متعلق انتہائی مؤدبانہ الفاظ کہے تھے اور انہوں نے ان کو وقت کا قلندر یا شاید وقت کا ولی قرار دیا تھا۔ یہ دونوں صاحبان مرتبت مسجد نبوی میں کچھ عرصہ اکٹھے بھی رہے۔

پشاور میں گیلانی پیروں کی بیٹھک:۔

بچپن میں 1956-57ء کے لگ بھگ پشاور کے علاقہ جھنڈا بازار شادی پیر جو کہ ہشتنگری سے اوپر چڑھائی چڑھ کر کریم پورہ بازار کے متصل ہے۔ ایک بڑے صحن والے گھر جس کے آخر میں دو کمرے تھے میں ہم جایا کرتے تھے۔ اسے لوگ حویلی کہتے تھے۔ یہاں رات کو کبھی کبھار محفل قوالی منعقد ہوا کرتی تھی۔ جس میں لوگ دھمال ڈالنا شروع کر دیتے۔ پتہ چلا کہ چونکہ میرے دادا مقلد تھے تو میرے والد یا رشتہ دار احباب ہمیں لے کر وہاں جاتے۔ کچھ بھی ہو آج میں سوچتا ہوں کہ یہ اس زمانے میں لوگوں کی تفریح کا باعث ہوا کرتی تھی اس میں کچھ غلط نہ تھا سبھی بھرپور لطف اٹھاتے۔ آج کل اس جگہ یہ حویلی موجود نہیں ہے۔ اس حویلی کو چلانے والے پیر صاحبان سے میری ملاقات 2008ء میں کوہاٹ

سے فتح جنگ روڈ پر ٹیکسلا کی طرف آتے ہوئے کالا باغ کے علاقے میں ہوئی۔ جہاں پر معلوم ہوا کہ وہ گیلانی سید خاندان سے تعلق رکھتے ہیں اور پشاور چھوڑ کر اس علاقے میں آ گئے ہیں جہاں انہوں نے اپنا ڈیرہ بنالیا ہے۔ جو سلسلہ پشاور میں تھا اب اسی علاقے میں ہے۔

بابا ننگا سرکار ڈھلیان والے:۔

66-1965ء میں میرے دوست اصغر علی شاہ (میر جی) نے مجھے ''موری محلہ پشاور'' میں ہمارے مشترکہ دوست محمد حسین حسینی کے گھر کے سامنے ایک مکان میں بیٹھے ہوئے بڑی عمر کے دبلے پتلے عینک لگائے بابا جی جو صرف ایک کپڑا باندھے چارپائی پر بیٹھے ہوئے تھے سے ملوایا۔ بابا جی نے مجھے چارپائی پر ساتھ ہی بٹھالیا اور باقی سب لوگوں کو سامنے بیٹھنے کو کہا۔ اس مکان میں میری دو چار بار پہلے بھی بابا جی سے ملاقات ہو چکی تھی۔ اس بار خاص طور پر بابا جی سے ملنے نہیں گیا تھا بلکہ دوست کے ساتھ ویسے ہی چلا گیا۔ تھوڑی دیر بیٹھ کر اندازہ لگانے کی کوشش میں رہا کہ آخر بابا کس مسلک سے تعلق رکھتا ہے۔

بابے کے ساتھ میری ایک ملاقات ان کے گاؤں ڈُھلیاں (جو پنڈی گیپ، اٹک میں واقع تھا) میں ہوئی۔ ہم چار پانچ دوست حسینی کے ہمراہ گئے تھے۔ شام کا وقت تھا بابا ایک بڑے صحن میں ایک کچے کوٹے کے حجرہ نما گھر کے بیرونی بیٹھک میں ہم سے ملے۔ میرے دوست باہر چلے گئے غالباً اُن کا ارادہ کچھ بوٹی ووٹی (بھنگ) پینے کا تھا۔ یہ شغل اُس زمانے میں عام تھا۔ میں ان چکروں میں نہ تھا۔ میں بابے کے پاس بیٹھا رہا جو مجھ سے مختلف سوالات کرتا رہا۔ میں بھی اُس سے کافی معلومات حاصل کرتا رہا۔ مجھے یہ بابا بڑا نیک فطرت اور صحیح الدماغ انسان لگا جس کے پاس قرآنی علم خاصا تھا۔ اُس نے اکیلے میں اس طرح بات چیت کی۔ جس طرح ایک تعلیم یافتہ انسان غیر مذہبی ماحول میں مذہب کی باتیں کر رہا ہو۔ جس میں اللہ، پنج تن پاک حسن حسین اور کربلا کے علاوہ کئی اہم موضوعات شامل تھے جن پر سیر حاصل گفت گو ہوئی۔ رات کو دوستوں کے آنے کے بعد کھانا کھایا اور سب سو گئے۔ صبح بیدار ہو کر وضو

بنانے باتھ روم کی طرف گیا اور ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ مٹی کے گھڑے سے پانی لوں اتنے میں بابا جی آ گئے ان کے ہاتھ میں کٹورا تھا کہنے لگے وضو کر لو اور جو پانی بچے وہ پی لو۔ مجھے تھوڑی سی کراہت محسوس ہوئی مگر پی گیا۔ میں یہ سمجھ گیا تھا کہ بابا مجھے اپنا مرید بنانے کی کوشش میں ہے۔ بابے نے مجھے کلمہ شہادت بھی پڑھنے کو کہا جو میں نے پڑھ لیا۔ اُس کے بعد میں نے نماز پڑھی۔ بابے نے مجھے بتایا کہ اس کا بیٹا تیس چالیس سال کی عمر کا ہے لیکن اس کا جان نشین نہیں ہے اس لئے اگر وہ کوئی فرمائش کرے تو بالکل نہیں ماننی۔ معلوم نہیں اس نے ایسا کیوں کہا؟۔ اگلے دن ہم سب لوگ وہاں سے واپس آ گئے بابے کی اس بات کو میں بھول گیا۔ حسینی چونکہ اُس کا باقاعدہ مقلد تھا وہ ہمیشہ اُس کی باتیں کرتا رہا۔ لوگ ان کے گرد بیٹھ کر بابے کی محفل سجائے رکھتے تھے۔ یہ واقعات میرے انگلینڈ جانے سے پہلے کے سالوں کے ہیں۔

میں شادی کیلئے جب پاکستان آیا تو بھی حسینی کے ہمراہ بابے سے ملاقات کے لئے ڈھلیاں گیا۔ اسے تھوڑی بہت کھانسی تھی۔ ایکسرے سے مجھے معلوم ہوا کہ بابے کو پھیپھڑے کا کینسر ہے۔ میں نے حسینی کو بتایا کہ بھئی بابا چند دن کا مسافر ہے۔ اس کی جو خدمت ہو کر لو۔ انگلینڈ واپس جا کر معلوم ہوا کہ بابا انتقال کر گیا۔ اس بابے کے بہت سے مرید پشاور میں ابھی بھی ہیں۔ چوک گھنٹہ گھر کے بالکل پشت پر ایک دُکان میں بابے کی ایک تصویر لگی ہوئی ہے جو اس کے ایک مرید نے لگائی۔ بابے سے ملاقات کا مختصر زکر کرنے کا مقصد محض یہ تھا کہ وہ ایک انتہائی نیک صفت اچھا انسان تھا جس کے خیالات میں نہ کوئی شدت پسندی تھی اور نہ ہی انتہا پسندی تھی۔ بہت سے لوگوں کو اپنے مسائل کے حل کے لئے بابا کی قربت حاصل کرنا ان کا ذاتی عمل تھا۔

حضرت عبدالمعبود:۔

اسلام آباد کے ایک رہائشی دوست کے توسط سے سوات سے تعلق رکھنے والے بقول ے ایک سو چھپن سالہ شخص سے جو سوات بابا کے نام سے مشہور تھا ملاقات ہوئی۔ وہ ایک بنگلے میں مقیم تھا۔ ایک

نوجوان جواُن کی خدمت کرر ہا تھا ان کا لکڑ پوتا(Great Grand Son) تھا اور ائیر فورس افسر کا بیٹا تھا۔سفید نفیس جوڑے میں ملبوس سفید ٹوپی پہنے،سفید داڑھی کے ساتھ عبدالمعبود کے چھوٹے چھوٹے نئے دانت دکھائی دے رہے تھے۔جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ تمام دانت گرنے کے بعد دوبارہ نکلے ہیں۔صحت کے لحاظ سے بھی بابا جی ٹھیک ٹھاک تھے۔ بیڈ پر متانت سے تشریف فرماتھے۔ہم سے انھوں نے پشتو میں گفتگو کی جو خاصی دلچسپ تھی ۔ان کی وفات 1984ء میں ہوئی۔

ڈاکٹر عبدالجلیل پوپلزئی نے مجھے بتایا کہ حضرت عبدالمعبود موصل (عراق) کے رہنے والے تھے۔وہاں سے ہجرت کر کے 54-1850ء میں ہندوستان آ گئے۔یہ بھی باور کیا جاتا ہے کہ انہوں نے روس کے خلاف گوریلا جنگ امام شامل کے زمانے میں لڑی۔امام شامل خود وسطی ایشیاء کے رہنے والے تھے۔ان کی پرہیز گاری اور عبادت سے رغبت کی وجہ سے ان کو بزرگی کا درجہ دیا جاتا ہے بقول مولوی جی وہ اپنے وقت کے ولی تھے۔پروفیسر عبدالجلیل پوپلزئی ان کے بہت ہی داعی ہیں اور اکثر ان کا ذکر کرتے رہتے ہیں۔انہی کی توسط سے میرے پاس ان کی تصاویر بھی پہنچیں۔

دیر بابا:۔

1980ء کی دہائی میں اپنے بھائی کے ہمراہ لنڈی ارباب پشاور میں ایک بصارت سے محروم اور کافی عمر کے بابا جن کی مقامی لوگوں کے مطابق عمر لگ بھگ 124 سال تھی لیکن ان کی اچھی خاصی صحت اور سیدھی کمر تھی سے تعارف ہوا۔انہوں نے ایک ''پٹو'' اوڑھا ہوا تھا۔پٹو کے اندر سے میرے چہرے کو چھوا، بات چیت کی اور دُعا دی جس کے بعد ہم رخصت ہو گئے۔کئی سال گزر گئے۔ ایک دن ایبٹ آباد میں، میں نے مانسہرہ روڈ پر منڈیاں کے قریب واقع ایک جاننے والے کے گھر میں کچھ روشنی اور گہما گہمی دیکھی تو رک گیا۔معلومات کیں تو پتہ چلا ایک بابے کے گرد مجمع لگا ہے۔دیکھا تو یہ وہی دیر بابا تھا جس سے لنڈی ارباب میں ملاقات ہوئی تھی۔میں بھی خاموشی سے جا کر قریب بیٹھ گیا۔طریقہ یہ تھا کہ

جب کوئی بیٹھتا تو بابا اپنا داہنا ہاتھ سے اس کا چہرا چھوتا۔انہوں نے میرے چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہی کہا کہ ڈاکٹر صاحب آپ ہیں؟ میں نے کہا کہ جی ہاں میں وہی ڈاکٹر ہوں۔میں ان کی یاداشت اور پہچان کا قائل ہوتا ہوا وہاں سے رخصت ہوگیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ خاصے لوگ ان کے معترف ہیں اوران کے مریدوں میں شمار ہوتے ہیں۔اس وقت باباجی کی عمر 124 یا128 برس ہوچکی تھی۔

2004ء میں جب میں چیف ایگزیکٹو کے ٹی ایچ ڈاکٹر چنگیز حکیم خان جو میرے دوست تھے نے مجھے قاری عبدالرؤف مدنی کے ہمراہ پرائیویٹ روم میں ایک مریض کو دیکھنے کے لئے بھجوایا اور یہ مریض وہی دیر والے بابا جی تھے۔ایک بار پھر انہوں نے مجھے پہچان لیا۔ اسی اثنا نماز کا وقت ہوگیا۔مغرب کی نماز سب لوگ باجماعت پڑھنے لگے اور باباجی نے سیدھے کھڑے ہوکر نماز پڑھی۔اتنی لمبی اورصحت مند عمر پانے کے ساتھ ساتھ دماغی وجسمانی مستعدی کو دیکھ کرکوئی بھی شخص نہ صرف متحرک ہوجاتا ہے بلکہ اس میں جینے کا ایک نیا جذبہ بھی پیدا ہوجاتا ہے میرے ساتھ بھی کچھ ایسے ہی ہوا۔

پروفیسر رفیق خان (گوجرخان):۔

96-1995ء میں ایبٹ آباد میں اس وقت کے اے ایس پی اور آجکل کے ایڈیشنل انسپکٹر جنرل آف پولیس کاشف عالم جو رشتے میں میرے بھانجے لگتے ہیں کے ہمراہ کسی تقریب میں شرکت کرنے گیا تو معلوم ہوا کہ گوجرخان سے تعلق رکھنے والے صوفی سکالر پروفیسر رفیق خان شمع محفل ہیں۔دن کوانہوں نے جناح آباد کمیونٹی سنٹر میں لیکچر دیا جسکی تعریف میں پہلے ہی گھر میں سن چکا تھا۔بہرحال ہم وہاں پہنچے تو دیکھا کہ بہت سارے پڑھے لکھے افراد جن میں افسران اور پروفیشنل شامل تھے محفل میں موجود تھے۔ پروفیسر رفیق سے ''ون ٹوون'' ملاقات ہوئی۔محفل برخاست ہوئی تو پروفیسر رفیق ہمیں ساتھ لے کر دور پہاڑوں میں ذکروفکر کے لئے لے گئے۔

پروفیسر رفیق نے بہت فلسفیانہ باتیں کیں۔کئی موضوعات پران کی رائے سامنے آئی۔ان کے

نظریات جان کر مجھے ان کی علمی شخصیت کا بھرپور اندازہ ہوا۔رات گئے تین بجے واپس لوٹے۔معلوم نہ تھا کہ بیگم انتظار میں شدید پریشان ہوگی چونکہ پہاڑوں میں ٹیلیفون کام نہیں کر رہے تھے۔وائرلیس موبائل بھی نہ تھا اس لئے اطلاع نہیں دے سکا۔گھر داخل ہوتے ہی بیگم کا شف پر پل پڑیں کہ کم از کم بتا کر جانا چاہیئے تھا بہرطور کا شف اور مجھے یہ واقعہ آج بھی یاد ہے۔پروفیسر رفیق خان ابھی تک ایک مذہبی نظریہ فکر کے طور پر جانے جاتے ہیں۔یہ ملاقات ایک ماڈرن پڑھے ہوئے بابے کے ہمراہ تجربے سے بھرپور تھی فرق صرف الفاظ کی ادائیگی میں لگا ورنہ بات بابوں والی ہی تھی۔

پیرزین الدین گیلانی:۔

پیرزین الدین گیلانی ڈیرہ اسماعیل سے تعلق رکھنے والے ایک پڑھے لکھے اور ماڈرن سوچ رکھنے والے پیر تھے جن کی مختلف شہروں میں رہائش تھی۔میرے ساتھ اُن کی ملاقات اسلام آباد میں ہوئی، مختلف موضوعات پر گفتگو ہوئی۔چند دینی مسائل پر بات بھی ہوئی۔وہ میری رائے سے کافی متفق لگے بعد میں، میں ایبٹ آباد چلا گیا۔وہ اکثر ڈیرہ اسماعیل خان، پنڈی یا کہیں اور سے بھی میرے لئے ایبٹ آباد مریض بھیجتے۔مریض آتے اُن کا نام لیتے اور میں ان کو توجہ سے دیکھتا۔جو بھی مریض آتا وہ فیس ضرور دیکر جاتا۔کسی نے مفت علاج نہیں کرایا۔اسی طرح میری پریکٹس میں بھی اضافہ ہوا۔یہ کام کئی سال چلتا رہا۔ایک بار پھر پیر صاحب سے ملاقات ہوئی میرے ساتھ اُن کا رویہ پیری مریدی کا نہ تھا۔تاہم دوستی کا سلسلہ ضرور رہا۔اُن کا ایک پوتا ایوب میڈیکل کالج میں ایم بی بی ایس میں میرا شاگرد رہا۔پیر گیلانی صاحب اب انتقال کر چکے ہیں اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔ان کی یادیں آج بھی دل و دماغ میں تازہ ہیں۔

پیرفقیرعبدالحمید:۔

کلاچی، ڈیرہ اسماعیل خان سے تعلق رکھنے والے پیر فقیر عبدالحمید گریجویٹ تھے۔ان کے والد پیر فقیر نور محمد نے سلطان باہو پر کافی ریسرچ کر رکھی تھی اور متعدد کتابیں بھی لکھی تھیں۔جب یہ کتابیں

مجھ تک پہنچیں تو ان میں سے ایک کتاب میں نے بھی پڑھی۔جس میں انہوں نے مابعد الطبعیاتی " Metaphysical " لکھا۔بعد میں میرا اسسٹنٹ مولانا ظفر اقبال المعروف صوفی ظفر اقبال اُن کا مرید خاص بن گیا۔صوفی ظفر اقبال کو جوانی میں کسی سے مقلد ہونے کی خواہش تھی۔پیر عبدالحمید کی صورت میں اسے پیر مل گیا۔ایک مرتبہ جب پیر عبدالحمید ایبٹ آباد آئے تو تین دن انہوں نے میرے کلینک میں قیام کیا۔بہت سارے لوگ پاکستان بھر سے جمع ہوئے۔انہوں نے اپنے والد فقیر نور محمد کی کتابوں کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔ان کے والد فقیر نور محمد کے پیروکاروں کی تعداد جنوبی افریقہ تک پھیلی ہوئی ہے اور پیر عبدالحمید نے اس سلسلے کو مزید آگے بڑھایا ہے۔سنا ہے کہ ہزاروں کی تعداد میں لوگوں کو مسلمان کیا اور وہاں اکثر جاتے رہتے ہیں۔انگریزی زبان بہت اچھی طرح بولتے تھے۔میرے خیال میں وہ ایک انتہائی پڑھے لکھے انسان ہیں۔پیری فقیری کا والد کی جانب سے ملنے والا سلسلہ جاری رکھے ہوئے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ لوگوں کو نیکی کی جانب راغب کرنے کی کوشش میں مصروف ہیں۔پیر عبدالحمید کو بھی میں نے کسی سے کچھ مانگتے ہوئے نہیں دیکھا۔

مولا بخش قریشی:۔

مولا بخش المعروف قریشی صاحب سے میری پہلی ملاقات دوران تعلیم جب میں میٹرک کا طالب علم تھا ہوئی۔ وہ ہمارے گھر آئے۔ان کی باتیں بہت بے تکلف لیکن بہت پر اثر تھی ۔ بعد میں میرے بھائی خالد مفتی کے ساتھ انکے تعلقات سالہا سال اور آخر دم تک رہے۔اردو فارسی،عربی کے علاوہ سن سکرت پر بھی دسترس رکھتے تھے۔اکثر وید کے اشلوک پڑھتے اور دیگر ادیان کے ساتھ اسکا مقابلہ کرتے۔گھر میں ایک بہت جامع دینی کتب کی لائبریری بنا رکھی تھی۔لوگوں کے مسائل کے حل کیلئے اپنے علم، فہم وفراست کے قابل تحسین نسخے پیش کرتے۔حکمت ان کا خاندانی پیشہ تھا اور ذریعہ معاش بھی۔علم الاعداد کے ماہر تھے۔نوے سال سے زیادہ کی عمر پائی۔

پیر مستان شاہ المعروف حق بابا سرکار:۔

جب میں 1980ء میں واپس پاکستان آیا تو میرے بھائی خالد مفتی مجھے یکہ توت دروازے کے باہر ایک عمارت میں لے گئے۔ وہاں سر پر سبز پگڑی باندھے بہت جلالی پیر صاحب موجود تھے۔ جنہوں نے خوش اخلاقی سے میرا نام پوچھا۔ انہیں شاید میرے بارے میں پہلے سے معلوم تھا۔ ان سے بات چیت میں بظاہر معلوم ہوتا تھا کہ پڑھے لکھے نہیں ہیں لیکن بات چیت کا انداز پڑھے لکھوں جیسا تھا۔ میرے بھائی خالد مفتی لیکن ان سے والہانہ عقیدت رکھتے ہیں۔ پیر صاحب پشاور کے قریب ٹمبر پورہ گاؤں کے رہائشی تھے ان کے دادا بھی پیر تھے۔ صاحب جائیداد تھے۔ ان کے ایک بھائی بابو جان تھے۔ پلاسٹک کی کلاشنکوف ہاتھ میں رکھ کر سبز رنگ کی پگڑی پہن کر کئی بار کھلی جیپ میں کھڑے ہو کر پشاور کے بازاروں میں چکر لگاتے۔ اور لوگ ان کو ادب اور تحسین کی نگاہوں سے دیکھتے۔ پیر صاحب حالات حاضرہ پر بہت گہری نظر رکھتے تھے۔ ہر روز میرے بھائی یا کسی اور پڑھے لکھے شخص کو انگریزی کا اخبار پڑھنے اور پھر اُس کا ماخذ بیان کرنے کا کہتے۔ اسی طرح اُردو اخبار بھی پڑھواتے۔ یہ بھی ہم نے سنا کہ وہ بہت دیر نہر کے ٹھنڈے پانی میں کھڑے رہتے۔ ایک اور بابا جو تسبیح والا بابا ایبٹ آباد میں جس کا ذکر علیحدہ کروں گا بھی ایسا کیا کرتا تھا۔ پیر صاحب کی کئی باتیں میرے بھائی سے سنی جاسکتی ہیں اور وہ گاہے بگاہے بتاتے بھی رہتے ہیں۔

پیر مستان شاہ صاحب کسی شخص کو اُس کی حیثیت سے نہیں بلکہ اپنے نقطۂ نظر سے دیکھتے اور اہمیت دیتے تھے۔ بات چیت کرتے یا جب ان کا موڈ نہ ہوتا تو وہ بات چیت بھی نہیں کرتے تھے۔ کئی بار وہ کمرے میں بند ہو کر کئی کئی دن خاموشی سے گزار دیتے۔ گاؤں میں ان کے کمرے میں ایک لائبریری تھی جس میں مذہبی اور اسلامی فلسفہ اور تصوف کی کتابیں موجود تھیں۔ انتہائی مضبوط نفسیات کے مالک تھے۔ اُن کی وفات 2018ء میں پچانوے سال کی عمر میں ہوئی۔ ان کے دو بیٹے پیر سید سجاد شاہ بادشاہ اور بادشاہ عنایت شاہ بادشاہ ہیں۔ پیر مستان شاہ کی خاص عادت ہمیشہ سے یہ رہی تھی کہ وہ جگہ جگہ محفلیں، قوالی، نعت و بیان منعقد

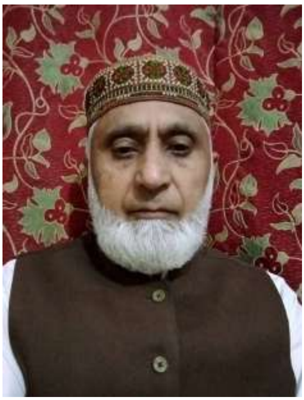
کرتے جو سلسلۂ چشتیہ کا شیوہ ہے۔اس کے علاوہ خصوصی ختم غوثیہ بھی کرتے جس میں وہ تمام ختم خود پڑھا کرتے تھے۔ڈاکٹر خالد مفتی نے اُن کے بیان کردہ اس ختم کو مجتمع کر کے ایک کتابی صورت دی ہے جسے آخری دنوں میں پیر صاحب نے مستند قرار دیتے ہوئے اسے شائع کرنے کی اجازت دی۔



حافظ علی احمد صاحب استاد محترم مولوی جی



مولوی امیر شاہ المعروف مولوی جی



صوفی ظفر اقبال



تصور حسین شاہ عرف شاہ جی

باب نمبر 21

چند متفرق و خصوصی یاداشتیں

یوں تو زندگی کی ہر کہانی کی تفصیل اہم ہوتی ہیں۔لیکن چند خصوصی لمحات یادگار رہ جاتے ہیں۔ چاہے وہ رنج و عالم کی بناء یا مسرت کے باعث ہوں۔ درجہ ذیل لمحات کا نقش میری یاداشت پر ثبت ہو گیا۔گو کہ ان کا ذکر آنے والے ابواب میں آپ کو مل جائے گا مگر ان میں سے چند ایک بوجہ ممکنہ منفی اثرات قلم بند نہیں کیئے گئے۔

☆زندگی کی پہلی یادداشت۔ بعمر تین یا چار سال نانی کے گھر میں آدھی رات کو چھوٹے سے بلب کی روشنی میں وسیع صحن کا خاموش ودھیما ماحول میرے اندر سرایت کر گیا۔

☆انھیں دنوں راستے میں چلتے چلتے ماں کا سفید شٹل کاک چھوڑ کر غلطی سے کسی دوسری خاتون کا برقعہ پکڑ لیا اور یوں وقتی طور پر کسی غیر کے گھر کے خوشنما اور خوشگوار ماحول کا تجربہ حاصل ہو گیا۔

☆ایک شادی کے ہنگامے میں۔ چھوٹے سے ٹینٹ میں کچھ دیر بند ہو گیا۔سالوں کے بعد یہ سمجھ میں آیا کہ درحقیقت یہ ٹینٹ ایک ناچنے والی کا گھگرا تھا

☆ پانچ یا چھ سال کی عمر میں بغیر چھت کے چھوٹے سائز والے گھوڑے اور تانگے میں دوسرے بچوں کے ہمراہ نانا کے گاؤں جانے کی خوشگوار یاد نے مجھے بگھی کا دلدادہ بنا دیا۔

☆چوتھی جماعت میں میرے بدن پر پہنی ہوئی سفید قمیص کے گریبان پر سوئی دھاگے سے بٹن لگاتے ہوئے میری بوڑھی نانی جان کے ہاتھوں کی خوشبو اور اُن کے شگفتہ اور پاکیزہ چہرے کے احساس نے مجھے باعمر خواتین سے اُنس کرنا سکھا دیا۔

☆ فارورڈ سکول میں پرائمری پڑھنے کے دوران پیپل کے درخت پر رہنے والی گلہری کا جنازہ جب اُستانیوں وطلباء نے منقعد کیا اور کھانا بانٹا تو سالوں بعد مجھے اپنے دوست کی بیٹی کا اسی طرح اپنی بلی کا

ماتم کرنا کچھ عجیب نہ لگا۔ بقول شاعر"

جھینگے کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے"

☆ ایک محترم استاد نے چینی کا پرمٹ مہیا نہ کرنے پر مجھ سے تمام مراعات چھین لیں۔ تب سے اب تک مراعات دینے والے انسانوں کی بہت قدر کرتا ہوں۔

☆ گھر سے چھپ کر اپنے جگری دوست کے ہمراہ ناولٹی سنیما کے چھ آنے والے درجے میں اچانک مسجد کے ایک داڑھی والے طالب کو دیکھ کر ڈر اور خوف سے کانپ گیا۔ خوف وشرمندگی کے مارے بغیر فلم دیکھے ہم فوراً گھر لوٹ آئے۔ اُس کے بعد کئی ہفتے ان صاحب کا آمنا سامنا نہ کرنے کی وجہ سے مسجد نہیں گئے۔ اب احساس ہوتا ہے کہ شاید وہ بھی ہمیں دیکھ کر اسی کیفیت سے دوچار ہوا ہوگا

☆ میٹرک کے امتحان سے پہلے کلاس کو اُس وقت جائز قرار دیئے گئے مطالبات کے حصول کے لئے طلباء کو بغاوت پہ اکسایا اور اپنے من پسند اُستاد سے شدید مار کھائی جس کی تکلیف اب بھی محسوس ہوتی ہے۔

☆ ایم بی بی ایس سال سوئم لیڈی ریڈنگ ہسپتال میں پہلے مریض کی ہسٹری لینے کے بعد پتا چلا کہ کوئی مجھ سے بھی زیادہ بیمار ولاچار بھی ہوسکتا ہے۔ یہ خیال بعد کی زندگی میں ملنے والے سینکڑوں ہزاروں مریضوں نے مزید پختہ کر دیا۔

☆ عزیزوں میں شیر وشکر بہن بھائیوں کی جان لیوا کش مکش سے نتیجہ آخذ کیا کہ محبت اور پیار کے باوجود بالغ بہن بھائیوں کو ہمیشہ حد ادب ملحوظ خاطر رکھنا ضروری ہوتا ہے۔

رحمان میڈیکل انسٹیٹیوٹ (RMI)

2009ء سے اب تک تقریبا 14 سال زندگی رحمان میڈیکل انسٹیٹیوٹ میں گزاریں جس کے اثرات مجھ پر پڑے جن میں سے چند درج ذیل ہیں۔

1۔ڈاکٹر محمد رحمان اس تمام نظام کے مؤجد اور آبیاری کرنے والے ہیں جو ان کی فکری جائزہ و عملی کارکردگی کی نمائندگی کرتا ہے۔ڈاکٹر رحمان کا بنایا ہوا یہ ادارہ بلاشبہ انسانیت کی اعلٰی خدمت کا جذبہ لئے بنایا گیا۔ادارے کا ماخذ ضمیر بہتر سے بہترین سروس آسان ترین طریقہ کار سے مہیا کرنا ہے جسے انگریزی میں ون ونڈو آپریشن کہا جاتا ہے۔

2۔آر ایم آئی میں کوئی بھی سروس باقاعدہ منصوبہ بندی اور عملی پیش بندی کے بغیر نہیں کی جاتی۔ اگر چہ ادارہ غیر منافع بخش یا خیراتی نہیں مگر یہاں آنے والوں کو نہ صرف فائدہ ہوتا ہے بلکہ یہ احساس بھی ہوتا ہے کہ ان کی رقم ٹھیک طرح سے خرچ ہوئی یا یہ کہہ لیجئے کہ جو سہولتیں فراہم کی جاتی ہیں ان پر آنے والے اخراجات تقاضوں کے ساتھ مناسب دکھائی دیتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ یہ ہسپتال مسلسل ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔

3۔ادارے کے عملے کو محسوس اور غیر محسوس انداز سے شعبہ جاتی اور ذاتی نشوونما مسلسل محسوس ہوتی ہے۔

4۔ پروفیشنل ڈسپلن بہت اچھا ہے،میڈیکل علاج کا سٹینڈرڈ اس سے منسوب ہے

5۔ٹیم لیڈر شفیق الرحمان سی ای او (CEO) ہیں۔بہت تیز رفتاری اور انتھک محنت کے باوجود اخلاقی اقدار کو مدنظر رکھتے ہیں۔عملی طور پر مریض،لواحقین اور عوامی فوائد کو ہر میٹنگ میں ترجیح دیتے ہیں اور آگے بڑھاتے ہیں۔

باب نمبر 22

تدریسی خدمات کا جائزہ

چند خصوصی خدمات مندرجہ ذیل ہیں۔

☆دسمبر 1979ء سینئیر رجسٹرار سرجری لیڈی ریڈنگ ہسپتال پشاور۔

☆مارچ 1981ء اسسٹنٹ پروفیسر سرجری ایوب میڈیکل کالج، ایبٹ آباد

☆مارچ 1984ء ایسوسی ایٹ پروفیسر سرجری ایوب میڈیکل کالج، ایبٹ آباد

☆اپریل 1991ء پروفیسر آف سرجری ایوب میڈیکل کالج، ایبٹ آباد

☆2000ء پروفیسر و سربراہ سرجری ایوب میڈیکل کالج، ایبٹ آباد

☆اپریل 2008ء پروفیسر سرجری و (Pioneer) پرنسپل KUST انسٹیٹیوٹ آف میڈیکل سائنسز، کوہاٹ

☆اپریل 2009ء تا 2019ء پروفیسر سرجری و (Pioneer) پرنسپل رحمان میڈیکل کالج، پشاور

☆اپریل 2019ء سے پروفیسر Emiratus و مشیر تعلیم رحمان میڈیکل انسٹیٹیوٹ پشاور

☆1st Feb. 1982 - 31 Jul. 1982 کے دوران نیورو سرجری میں ٹریننگ ہوئی جو میں نے جناح پوسٹ گریجویٹ میڈیکل سنٹر کے نیورو سرجری سے میں مکمل کر کے سرٹیفکیٹ حاصل کیا۔

☆دسمبر 1982ء: فیلو آف دی انٹرنیشنل کالج آف سرجن منتخب ہوا۔

☆1983ء ممبر ایڈیٹوریل بورڈ پروگریس ان میڈیکل ریسرچ میڈیکل جرنل: اس کے دیگر ممبران میں مقبول اینڈ جعفری، فرح احمد خان، ڈاکٹر محمد الیاس (محمدی) شامل تھے۔

☆اکتوبر 1985ء میں ممبر ایڈیٹوریل بورڈ پاکستان میڈیکل جرنل۔

☆1988ء تا 1996ء ایوب میڈیکل کالج کے ’’قراقرم‘‘ سالانہ رسالہ ایوب میڈیکل کالج کا میں تقریباً آٹھ سال چیف سٹاف ایڈیٹر رہا۔

☆جولائی 1988ء میں سولہویں ورلڈ کانفرنس آف انٹرنیشنل کالج آف سرجن جو میلان اٹلی میں منعقد ہوئی جسکا عنوان تھا First world post Graduate surgical meet of the Milan, University of Milan۔ جس میں میں اپنا مکالہ اپینڈیکس کے آپریشن کے ٹیکنیک کے متعلق پیش کیا۔

☆1989ء تا 2013ء تک FCPS پارٹ I & II کا سپروائزر ٹرینگ و ممتحن CPSP

☆1990ء میں مجھے اور پروفیسر عبدالکریم سعید کو بورڈ آف سٹڈیز کے سلسلے میں ایوب میڈیکل کالج کا نمائندہ بنا کر پشاور یونیورسٹی بھیجا گیا جہاں پر کنٹرولر آف ایگزامینیشن اور رجسٹرار جاوید صاحب تھے کے ساتھ معاملات چل رہے تھے جس پر مجھے کہا گیا کہ آپ بھی ہمیں جائن کرلیں میرے اساتذہ اور دیگر مقتدرین بھی موجود تھے۔ صوبے کا پہلا پرائیویٹ میڈیکل کالج، جو ہمارے بہت ہی معزز سرجن و پرنسپل ڈاکٹر محمد کبیر نے قائم کیا تھا، کی رجسٹریشن کا معاملہ تھا۔ اس وقت حالات نئے کالجوں کے بنانے کے حق نہیں تھے جبکہ آج انہی پرائیویٹ کالجوں نے اساتذہ کو نیا اور وسیع کیریئر مہیا کیا۔

☆1994ء میں پروفیسر احسان اللہ چوھدری کی سربراہی میں کالج آف فزیشن اینڈ سرجن آف پاکستان نے میڈیکل ایجوکشن کے متعلق ایک ایسوسی ایشن AMEP کے نام سے بھی قائم کیا جس کا میں فاؤنڈ ینگ ممبر رہا۔

☆1997ء: مجھے رائل کالج آف ایڈنبرا نے مجھے پاکستان میں سرجیکل ٹرینیز کا ٹیوٹر مقرر کیا جو ٹرینیز کے اسیسمنٹ کے متعلق تھا جس میں مختلف ٹریننگز کے متعلق تجاویز دینی ہوتی تھی۔

☆1997ء تا 2002ء کمیونٹی اور ینٹڈ میڈیکل ایجوکیشن (C.O.M.E.) کا صوبائی کوآرڈینٹر

☆2005ء-1997ء دی نیٹ ورک ورلڈ یونیٹی فار ہیلتھ (TUFH) ایک انٹرنیشنل آرگنائزیشن جو کہ ہیلتھ کے متعلق تمام اہم معاملات دیکھتی رہی کا میں ممبر رہا۔ اسی آرگنائزیشن کے بحرین کانفرنس میں میں نے اپنا ایک ریسرچ پوسٹر پیش کر کے پبلش کیا۔

☆ C.O.M.E. Curriculum Pakistan میں فارتھرڈ، فورڈ اینڈ ففتھ ائیر شائع ہوا جن کے Authours میں سے میں بھی ایک تھا۔ یہ دو مکالمے شائع ہوئے ایک 1998ء میں اور 2001ء میں۔

☆مئی 1999ء میں کالج آف فزیشن اینڈ سرجن آف پاکستان (CPSP) کی طرف سے ممبر آف سرجری فیکلٹی مقرر کیا گیا۔ اور بعد میں ڈین آف سرجری بھی میں مقرر کیا گیا۔

☆2000ء ایوب ٹیچنگ کمپلیکس کے پیچیدہ مسائل اور ان کا حل کے موزوں پر کتاب (Situational Analysis) لکھی جس کو صوبائی وزیر صحت اور محکمہ ہیلتھ کو بھجوایا گیا تا کہ اس کتاب کے مندراجات پر عمل درآمد کا بندوبست کیا جا سکے۔

☆اپریل 2000ء میں اپرو ڈٹرینر بنا۔

☆فروری 2001ء میں WHO کی فیلوشپ پر دو ہفتے کے لئے بحرین گیا جہاں پر ماڈیولر انٹیگریٹڈ سسٹم کی تربیت حاصل کی۔

☆2002ء: ساؤتھ ایشیا پبلیکشن کی طرف سے "STAR LAUREATE 2001" ایوارڈ کے لئے چنا گیا۔

☆2002ء: PGMI NWFP کے لئے شعبہ سرجری میں ڈائریکٹر سٹرکچرل ٹریننگ

پروگرام مقرر کیا گیا۔

☆ 2003ء میں سعودی عرب میں رہائش کے دوران Northumbria University انگلینڈ سے LLM کا پہلا سمسٹر مکمل کیا۔ پاکستان واپس آکر کچھ عرصہ جاری رکھا مگر انٹرنیٹ کی سروس نہ ہونے کی وجہ سے نہ رکھ سکا اس ٹریننگ نے میڈیکل پریکٹس کے قانونی پہلوؤں سے روشناس کرایا۔

☆ میں ہزارہ یونیورسٹی 2005ء تا 2007ء ممبر بورڈ آف فیکلٹی کلینکل سائنسز رہا جس میں مجھے یونیورسٹی فیکلٹی کی تدریسی اور انتظامیہ امور کا تجربہ ہوا۔

☆ 08-2007ء میں خیبر میڈیکل یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر داؤد کے دور میں ڈین سرجیکل کی حثیت میں فعال کردار ادا کیا۔ میں نے ان کے ساتھ مل کر ماڈیولر سسٹم یا سمسٹر سسٹم کام کیا۔

☆ خیبر میڈیکل یونیورسٹی کے دوسرے وائس چانسلر ڈاکٹر حفیظ اللہ نے بھی مجھے ایڈوائزری کمیٹی کا حصہ بنایا۔ اس کمیٹی میں پروفیسر ناصر الدین خان، پروفیسر سراج اور ڈاکٹر طارق نشتر بھی شامل تھے۔ اس کمیٹی کے ساتھ بہت سی نئی اختراعات اور شعبہ جات کے متعلق اہم اصولی فیصلے بھی طے کئے گئے۔

☆ 2014 - 2012: KMU سے میں نے MHPE کی ڈگری لی جن میں میرے اساتذہ میں سے ایک ڈاکٹر عثمان معبود جو سربراہ تھے اور دیگر میں ڈاکٹر بریخنہ، ڈاکٹر احسن، ڈاکٹر گوہر واجد (WHO)، ڈاکٹر نور محمد (KTH) اور ڈاکٹر ریحان (Riphah) سے تھے۔ Integrated Modular System کی ہوا پوسٹ گریجویٹ لیول پر چل چکی تھی لہذا انڈر گریجویٹ لیول پر کورس مرتب کرنے کی اشد ضرورت تھی جس میں ان سب کی محنت رنگ لائی اور مکس ماڈیولر سسٹم بنا کر لانچ کر دیا گیا۔

RMC کی میڈیکل ایجوکیشن سے ڈاکٹر ماہ رخ مسلسل ان کے ساتھ مجھ سے صلاح و مشورہ کرتے ہوئے حصہ بنی رہی۔ ڈاکٹر سلیم خان جو پرنسپل کوہاٹ میڈیکل کالج تھے بھی اس کمیٹی کا حصہ رہے۔ ان سب

کاوشوں کی وجہ سے مجھے رحمان میڈیکل کالج کی تعلیمی ڈھانچہ بنانے میں میری معاون ثابت ہوئی۔

☆ممبر سنڈیکیٹ کی حثیت سے وائس چانسلر ڈاکٹر حفیظ اللہ صاحب نے مجھے KMU میں مدعو کیا۔اس کمیٹی میں اعلیٰ افسران، جج صاحبان اور معززین بھی شامل تھے۔HED کے ایڈیشنل سیکریٹری ڈاکٹر خالد خان جو دلائل کی بناء پر بحث میں حصہ لیتے بھی ان میٹینگز میں آتے تھے۔ماڈل سکول سسٹم کے بانیوں اور پروپرائیٹرز میں سے ایک خواجہ یاور بھی تھے۔سنڈیکیٹ ممبر کی حثیت سے بہت قیمتی تجربہ یونیورسٹی انتظامیہ کا تجربہ ہوا۔ وائس چانسلر ڈاکٹر حفیظ اللہ نے انتہائی فعال کردار ادا کیا اور سینڈیکیٹ جمہوری طریقوں سے فیصلے کرتی رہی۔

بطور ٹرینر اساتذہ (Trachers'Trainer):

۱۔Facilitator ٹریننگ ورکشاپ CPSP ٹیچر ٹریننگ سنٹر میں مہیا کرتا تھا۔

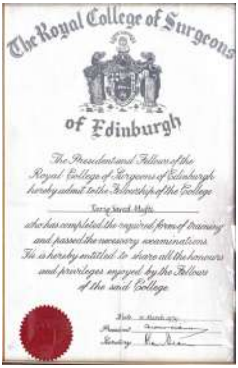
۲۔ورکشاپس مختلف ایجوکیشنل Topics پر جنرل ایجوکیشنل سکولوں میں اساتذہ کے لئے جن میں آرمی اور ائیر فورس کے تربیتی مراکز، فضل حق کالج مردان وغیرہ شامل ہیں۔

۳۔ایوب میڈیکل کالج میں اساتذہ کی تربیت بہت وسیع پیمانے پر C.O.M.E. میں ہوئی۔جن میں میرا کردار بطور Facilitator اور صوبائی منتظم تھا۔WHO کی طرف سے تھا جن میں بشیر حماد اور دیگر شرکاء بھی تھے۔

۴۔KIMS کوہاٹ میں تعلیمی تربیت کا پورا پروگرام میں تمام اساتذہ کو کرواتا رہا۔

۵۔رحمان میڈیکل انسٹیٹیوٹ ورحمان میڈیکل کالج و دیگر RMI کالجز کی شروع سے لے کر تمام اساتذہ اور باقی عملہ کی تعلیم و تربیت شامل تھا اور شعبہ ریسرچ میں ڈاکٹر افتخار کے ساتھ بطور معاون ٹریننگ دیتا رہا۔

۶۔شعبہ تعلیم KMU سے 14 - 2012ء میں نے MHPE کیا اور اس تمام عرصے میں میں نے پوری ٹیم کے ساتھ کام کیا اور اس طرح میں KMU کا موجودہ نظام تعلیم کلیدی کردار ادا کیا۔



The Royal College of Surgeons of Edinburgh

The President and Fellows of the Royal College of Surgeons of Edinburgh hereby admit to the Fellowship of the College

Tariq Saeed Mufti

who has completed the required form of training and passed the necessary examinations. He is hereby entitled to share all the honours and privileges enjoyed by the Fellows of the said College



College of Physicians & Surgeons Pakistan

Know all men by these Presents, that we, the President and Council of the College of Physicians and Surgeons Pakistan admit

Dr. Tariq Saeed Mufti

a Fellow of the College

in the subject of Surgery

In witness thereof, we have subscribed our names and caused the seal of the College to be hereunto affixed this 30th day of

President

Member Executive Committee

Registrar of the College



UNIVERSITY OF PESHAWAR

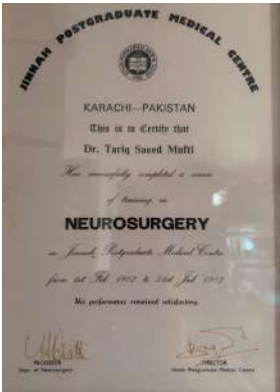
This is to certify

that Tariq Saeed Mufti

of the KHYBER MEDICAL COLLEGE, UNIVERSITY OF PESHAWAR

BACHELOR OF MEDICINE & BACHELOR OF SURGERY

Vice-Chancellor



JINNAH POSTGRADUATE MEDICAL CENTRE

KARACHI—PAKISTAN

This is to Certify that

Dr. Tariq Saeed Mufti

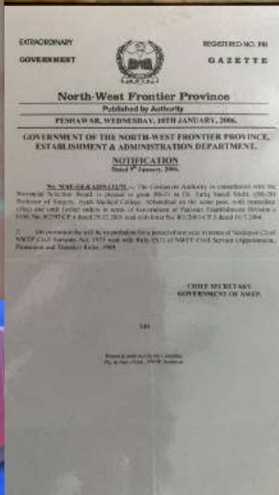
Has successfully completed a course of training in

NEUROSURGERY

at Jinnah Postgraduate Medical Centre

His performance remained satisfactory.

DIRECTOR



EXTRAORDINARY

GOVERNMENT

GAZETTE

North-West Frontier Province

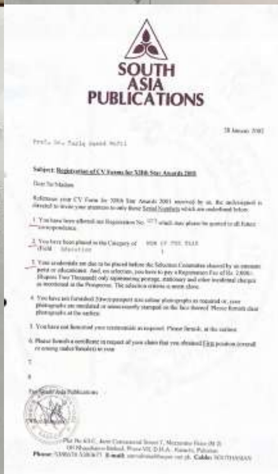
Published by Authority

PESHAWAR, WEDNESDAY, 18TH JANUARY, 2006.

GOVERNMENT OF THE NORTH-WEST FRONTIER PROVINCE, ESTABLISHMENT & ADMINISTRATION DEPARTMENT.

NOTIFICATION

CHIEF SECRETARY
GOVERNMENT OF NWFP.



SOUTH ASIA PUBLICATIONS

Prof. Dr. Tariq Saeed Mufti







kmu

Certificate

Conferment of the title

PROFESSOR EMERITUS

Presented to

Prof Dr Tariq Saeed Mufti

for the dedicated efforts, outstanding contribution and meritorious services in the field of medical profession, education and research.

Registrar
Khyber Medical University

Vice Chancellor
Khyber Medical University

باب نمبر 23

میرے منسلک سماجی وفلاحی ادارے

اگرچہ میں بیشتر لوگوں کی طرح زندگی میں سماجی خدمات وقتاً فوقتاً سرانجام دیتا رہا ہوں مگر اس سلسلے میں دو اداروں کے ساتھ باقاعدہ منسلک ہوں۔

ا۔ ہورائزن (NGO)

۲۔ پاک آئزش ریہیب سنٹر

ہورائزن (Horizon):

1987ء میں ڈاکٹر خالد مفتی کی ذیر قیادت قائم ہونے والا فلاحی ادارہ ہورائزن انسان دوستی پر قائم ایک غیر سیاسی، غیر منافع بخش رجسٹرڈ تنظیم ہے۔ جو ذہنی طور پر بیمار اور منشیات کے عادی افراد کے علاج اور معاشرے میں ان کی بحالی کے لیئے خدمات سرانجام دے رہا ہے اس میں صحت کے پیشے سے منسلک افراد اور رضا کاروں کو تربیت فراہم کی جانے کے علاوہ تحقیقی مواد بھی حاصل کیا جاتا ہے جو متعلقہ ذہنی مسائل کے آئندہ لائحہ عمل کا ایک ضروری حصہ ہے۔ ہورائزن اپنے تخلیقی منازل طے کرتے ہوئے موجودہ دور میں نہ صرف مقامی وقومی سطح پر بلکہ خطہ کے علاقائی مما لک اور بین الاقوامی سطح پر بھی ایک پر اثر تنظیم کے طور پر ابھری ہے۔

ہورائزن کے اغراض و مقاصد میں تمام متعلقہ اداروں کے ساتھ ہم اہنگی پیدا کر کے ذہنی صحت سے متعلق آگاہی فراہم کرنا، مریضوں کی دیکھ بال اور تحقیق وتخلیق کو فروغ دینا ہے۔اس سلسلہ میں مندرجہ ذیل مقاصد کو ترویج وتکمیل کے مرحلوں تک پہنچانا شامل ہے۔

1) ذہنی صحت کی تعلیم کا پروگرام تیار کرنا، ذہنی امراض سے بچاؤ کی تدابیر کرنا اور ان کو تمام متعلقہ پیشہ ور افراد یعنی ڈاکٹروں، ماہر نفسیات، سماجی کارکنوں، نرسوں، پیرامیڈیکس اور کمیونٹی ہیلتھ ورکرز تک پہنچانا۔

2) ذہنی صحت اور منشیات کی لت میں مبتلا مریضوں کی نگرانی اور بعد از علاج تجزیہ اور بہتری کے لیے تجاویز مہیا کرنا۔

3) تمام متعلقہ اداروں کے ساتھ مل کر بہتر خدمات کی فراہمی کو یقینی بنانا۔

یہ مقاصد بلند حوصلہ رکھنے والے تربیت یافتہ، پیشہ ور افراد اور رضا کاروں کے ذریعے حاصل کیے جاتے ہیں۔ جو کارنز میٹینگز، میڈیکل کیمپس، الیکٹرانکس اور پرنٹ میڈیا پر اپنی پر اثر گفتگو اور مشاورت کے ذریعے اثر انداز ہوتے ہیں۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے اساتذہ اور علماء یا مذہبی راہنماؤں کی خدمات بھی حاصل کی جاتی ہیں۔

ہورائزن کی کارکردگی کی چند جھلکیاں:۔

قیام سے لے کر اب تک اس تنظیم نے نہ صرف اپنے طور پر بلکہ بین الاقوامی اداروں کے تعاون سے بہت ہی مفید، پر جوش اور چیلنجنگ منصوبے شروع کیے ہیں۔ ان میں UNDCP(IDDRP) ILO، کولمبو پلان بیورو WHO ، پاکستان سائیکاٹرک سوسائٹی اور ورلڈ سائیکیٹرک سوسائٹی (WPA) شامل ہیں۔

پشاور میں منشیات کے بڑھتے ہوئے استعمال کو روکنے کا پختہ عظیم لیے ہورائزن نے ایک مظبوط حکمت عملی تیار کی۔ جس میں متعلقہ خاندانوں اور متاثرہ کیمونٹی کو شامل کیا گیا اس پروگرام کو کامیاب ریلیف پروگرام بنانے کے لیے ریڈ کریسینٹ سوسائٹی، سماجی بہبود اور اس وقت کی صوبائی حکومت کے محکمہ صحت کے اشتراک منصوبہ ترتیب دیا گیا۔ تب سے اب تک ہورائزن روزانہ کی بنیاد پر انسداد منشیات کی مہم چلا رہا ہے۔

ایشیائی علاقائی پروگرام برائے کمیونٹی ڈرگ بحالی (1990 تا 1992) تعاون GO/ILO/Horizon، منشیات کے عادی افراد کی معاشرے میں بحالی کا ایک مشترکہ پراجیکٹ تھا جسے I LO/UNDCP کے آخری سہ فریقی اجلاس، نومبر 1992، کھٹمنڈو میں بہت سراہا گیا۔ اسی طرح کمیونٹی انٹروینشن ٹیم ILO, IDDRP, (UNDCP) CIT کے تحت منشیات کی مانگ میں کمی کا پراجیکٹ بھی ہورائزن کے ساتھ ایک مشترکہ منصوبہ تھا۔

ہورائزن نے 8 اکتوبر 2005 میں ہزارہ اور آزاد کشمیر میں زلزلہ کے بعد ذہنی صدمہ (PTSD) سے متاثر ہونے والے افراد کی مدد میں اہم کردار ادا کیا۔ ہورائزن کی جانب سے ایک ٹیم

لوگوں کی ذہنی صحت کی بحالی کے لیے بالاکوٹ میں تھی۔اس نے ذہنی صحت کے بحالی کے دوران جو اعداد و شمار یکجا کیئے وہ ایک اہم تحقیقی مواد ثابت ہوا۔اس دوران نہ صرف مریضوں کا علاج کیا گیا بلکہ WHO کے تعاون سے ان کی دیکھ بال کرنے والے رضا کاروں کی تربیت بھی کی گئی۔

ذہنی صحت کی بحالی کے کیمپ منعقد کرنا ہمیشہ سے ہی ہورائزن کی خصوصیت رہے ہیں۔ جو نہ صرف مریضوں کا علاج کرتے ہیں بلکہ عملے کو تربیت بھی فراہم کرتے ہیں۔ اور ساتھ ہی لوگوں میں منشیات کے خلاف آگاہی بھی پیدا کرتے ہیں۔ان کیمپوں سے اب تک لاتعداد لوگ فائدہ اٹھا چکے ہیں۔ آج کل ہورائزن WPA/PPS Fountain House Lahore کے تعاون سے پروفیسر ڈاکٹر خالد مفتی (as focal person) اور افضل جاوید کی قیادت میں افغانوں میں ذہنی صحت کے متاثرین کو ٹیلی سائیکاٹری پروگرام کے تحت ان کی دہلیز پر مفت علاج فراہم کر رہا ہے۔

ہورائزن ایگزیکیٹوز میں نامور سماجی، تعلیمی، ریٹائرڈ افسران والنٹیر یری شخصیات شامل رہی ہیں۔موجودہ ایگزیکیٹیوز میں مایہ ناز بین الاقوامی شخصیت، شاعر اور لکھاری ناصر علی سید، سائیکاٹرسٹ پروفیسر ڈاکٹر خالد مفتی، ڈاکٹر علی مفتی، مشہور کالم نگار اور لکھاری مشتاق شباب اور کرنل (ریٹائرڈ) اے۔ زیڈ۔ بابر کے علاوہ معاشرے کے مختلف طبقوں سے تعلق رکھنے والی بہت سی قابل ذکر شخصیات شامل ہیں۔ جو ہورائزن کے اغراض و مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے اپنی انتھک رضا کارانہ خدمات سرانجام دے رہی ہیں۔ میری ذمہ داری ریسرچ کی ٹریننگ اور ترویج ہے۔

سنڈیکیٹ آف رائٹرز پشاور، ایک مشہور تعلیمی شخصیت و شاعر جناب خاطر غزنوی (مرحوم) نے شروع کی اور ان کی وفات کے بعد یہ تنظیم چیئر مین ہورائزن پروفیسر ڈاکٹر خالد مفتی کی دعوت پر جناب ناصر علی سید کی سربراہی میں حق بابا آڈیٹوریم واقع عبادت ہسپتال نشتر آباد پشاور بڑی تندہی سے مصروف عمل ہے۔ادبی محافل کے علاوہ ذہنی صحت و منشیات کے خلاف جدوجہد اس تنظیم کی افعال کا بنیادی حصہ ہیں جو ہورائزن کے مقاصد حاصل کرنے میں بھی ایک اہم کردار ادا کرتا ہے۔




ANNUAL
BODY




صحت نشہ نہیں


HORIZON




Horizon










Lifetime










PAK-IRISH REHABILITATION CENTRE
PIRC
2006 TO 2022
P I R C
WELCOME
to
PIR
THIS ROOM HAS BEEN DEDICATED TO
PROF. DR. TARIQ MUFTI

پاک آئرش مرکز برائے بحالی معذوراں، پاکستان (رجسٹرڈ ٹرسٹ)

8 اکتوبر 2005ء کے ہولناک زلزلے کے نتیجے میں 80000 سے زیادہ افراد کی ہلاکت شمالی پاکستان بشمول اسلام آباد، ایبٹ آباد، بالاکوٹ، کاغان اور آزاد جموں وکشمیر میں واقع ہوئی۔اس کے علاوہ اداروں وگھروں کا نقصان اندازے سے باہر ہے۔ ہزار ہا لوگ ٹانگوں و بازوں کی معذوری سے متاثر ہوئے اور سینکڑوں لوگ ریڑھ کی ہڈی کی چوٹوں کی وجہ سے معذور ہو گئے۔ان تمام لوگوں کی مدد کے لئے دنیا بھر سے بے پناہ کاروائیاں اور امداد وصول ہونا شروع ہوئیں۔آئر لینڈ کے ایک خصوصی گروپ بنام ''ساؤتھ ایشیا آرتھوکویک اپیل، ڈبلن، آئر لینڈ'' کی التجا پر چندہ واشیاء اکھٹی کی گئیں۔مس وینڈی فیئر (Miss Wendy Fair) کی لیڈرشپ میں فنڈز وتمام جراحی اور تکنیکی اشیاء جو بحالی معذوراں کے لیئے کارآمد تھیں پاکستان پہنچائی گئیں۔مظفر آباد آزاد جموں وکشمیر میں ایک فیلڈ ہسپتال بمع آپریشن تھیٹر قائم کیا گیا۔اس کاروائی کے بعد اضافی رقم کے استعمال کے لئے پانچ (05) ٹرسٹیز، مسٹر عبدالواحد میر (معروف ایجوکیشنٹ)، ڈاکٹر جاوید احمد بٹ (آئرش ڈاکٹر اور اپیل گروپ کے ممبر)، میں یعنی پروفیسر ڈاکٹر طارق مفتی (سرجن، ایبٹ آباد، پاکستان)، ڈاکٹر بشیر الدین کنٹ (معروف سرجن آزاد کشمیر) اور مسٹر احمد حسین مجاہد (سرکاری ادارے کے سینئیر ملازم) کی نگرانی میں 'پاک آئرش مرکز برائے بحالی معذوراں، ایبٹ آباد، پاکستان قائم کیا گیا۔دائرہ کار تمام قطع عضو (Limb loss) یعنی ہاتھ اور پاؤں کے معذور افراد کو خودمختار اور باعزت زندگی گزارنے کے قابل بنانا تھا۔اس مقصد کے حصول میں انتہائی مخلص اور جان فشاں (Dedicated اور Devoted) کارکنان کو شامل کیا گیا۔

مسٹر بابر خلیل، ایک تجربہ کار، محنتی اور مخلص اور Orthotic کے ماہر کی ڈائریکٹر شپ کے تحت پانچ سے چھ ارکان کی ایک ٹیکنیکل ٹیم بنائی گئی۔جنہوں نے پیشہ ورانہ خدمات کی وساطط سے معذور افراد کی بحالی کا کام شروع کر دیا، جو آج تک جاری ہے۔شروع میں یہ ادارہ ایک نجی مکان میں اپنی خدمات انجام

دے رہا تھا۔علاوہ ازیں ایک موبائل یونٹ جو کہ ایک ضروری سامان سے لیس ایک منی بس (کوسٹر) باقائدہ تیار کی گئی جو دور دراز علاقوں میں جا کر مریضوں کو ان کے رہایش پر ہی پیشہ ورانہ خدمات (مصنوعی اعضا، مثلاً ہاتھ، پاؤں، وغیرہ) ان کی ضرورت کے مطابق مہیا کرتی تھی، یہ ایک منفرد قسم کی خدمت تھی۔ جو کہ زلزلہ متاثرین کو دی جاتی رئی۔ 27 مارچ 2008ء کو ایبٹ آباد میں ایک تین منزلہ عمارت کھڑی کر دی گئی۔اس عمارت میں قائم مرکز میں ہر نوع کی Orthotics and Prosthetics خدمات مہیا کی جاتی ہیں۔ان میں قابل ذکر اور منفرد پہلو یہ ہے کہ یہ تمام خدمات بغیر کسی معاوضہ کے بالکل مفت مہیا کی جاتی رہیں اور ابھی بھی مستحق مریضوں کو بلا معاوضہ اور دیگر افراد کو ایک جیسے طریقہ پر پیش کی جاتی ہیں۔بعض صاحب حیثیت مریض اگر اپنی خواہش پر اصل خرچے کی بنیاد پر معاوضہ ادا کرنا چاہیں تو ادا کر سکتے ہیں۔اس وقت تک کئی ہزار لوگوں کو خدمات مہیا کی گئی ہیں۔(جن کے اعداد شمار آخر میں درج ہیں) اور اب تو پورے پاکستان کے متاثرین اس ادارے سے فوائد حاصل کرتے ہیں۔اس تنظیم نے پہلا سلیکان کا پاؤں 24 اکتوبر 2022ء میں بنا کر لگایا۔

یہاں بہت سے سکولوں اور کالجوں کے طلباء و دیگر گروپس کے لئے تربیتی ورکشاپس بھی منعقد کی جاتی ہیں۔کچھ سال پہلے بیرون ملک صحافیوں نے ہماری اطلاع کے بغیر اس ادارہ کی ایک فلم بنا کر تمام یورپین میڈیا پر چلا دی جس سے متاثر ہو کر یورپی یونین کے سفیر نے رابطہ کر کے پاک آئرش مرکز برائے بحالی معذوراں، ایبٹ آباد، پاکستان کا معائنہ کیا۔اور اسکی خدمات کو سراہا۔**PIRC کی خدمات کے کچھ اعداد و شمار درجہ ذیل ہیں**

جنوری 2006ء سے نومبر 2022ء تک علاج کردہ مریضوں کی تعداد (حوالہ ڈائیریکٹر PIRC)

آرتھاٹیکس مریضوں کی تعداد:	112404
پروستھیٹکس مریضوں کی تعداد:	37468

ٹوٹل علاج کردہ مریضوں کی تعداد: 149872

ٹوٹل نمبر اپلائنسز جو مریضوں کو بنا کر دیئے: 285740

فزیوتھراپی کے مریضوں کی تعداد: 87927

سائیکالوجی کے مریضوں کی تعداد: 22921

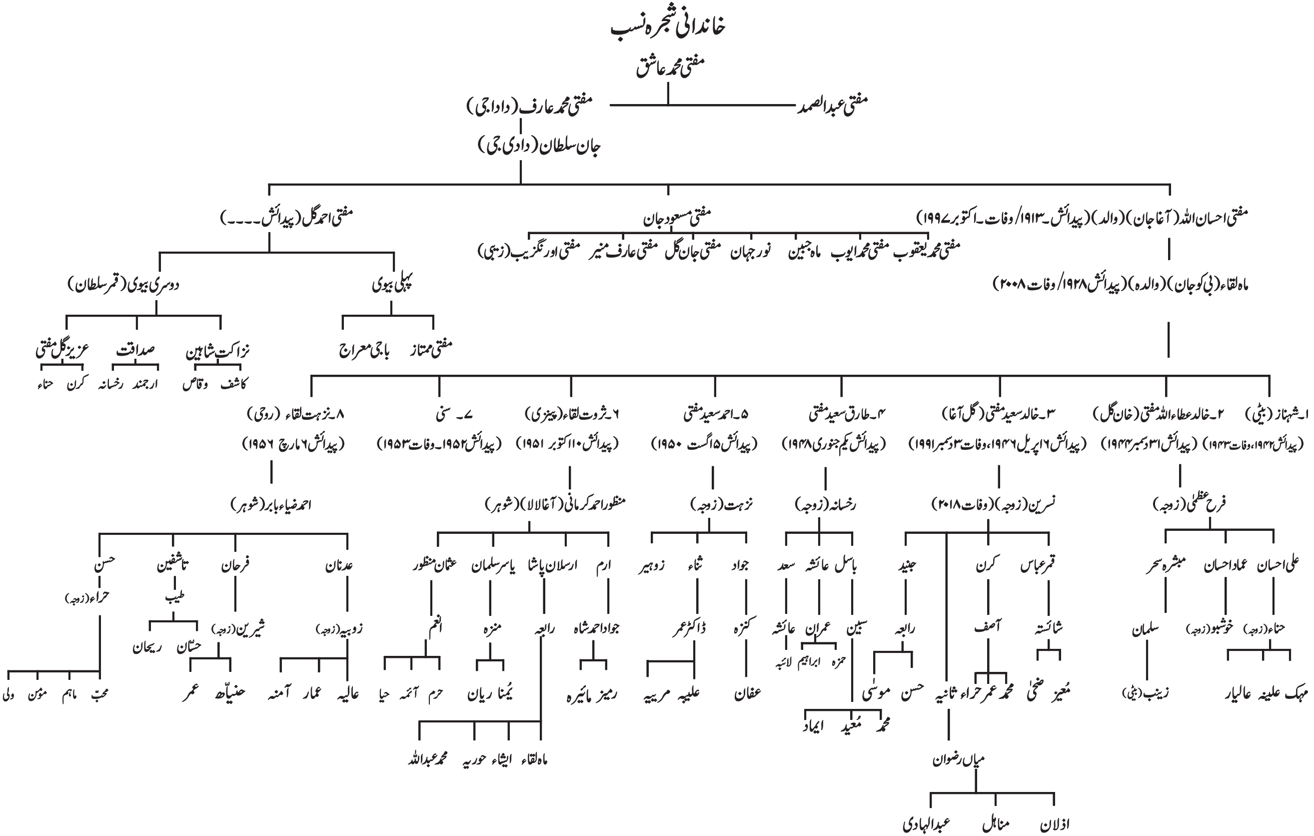
اس ادارے کی موجودگی اور کارکردگی ایک وسیع علاقع کے لئے نعمت سے کم نہیں۔

میری خدمات کے اعتراف میں چند خصوصی اعزازات

☆ کالج آف فزیشن اینڈ سرجن پاکستان کی طرف سے اعزازی ایف سی پی ایس 2001ء

☆ خیبر میڈیکل یونیورسٹی کے چانسلر کی طرف سے اعزازی پروفیسر ایمریٹس 2016ء

☆ رحمان میڈیکل انسٹیٹیوٹ کی طرف سے لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ 2023ء


خاندانی شجرہ نسب
مفتی محمد عاشق
مفتی محمد عارف (دادا جی)
مفتی عبدالصمد
جان سلطان (دادی جی)
مفتی احمد گل (پیدائش ـــــ)
مفتی مسعود جان
مفتی احسان اللہ (آغا جان) (والد) (پیدائش ـ۱۹۱۳/ وفات ـ اکتوبر ۱۹۹۷)
ماہ لقاء (بی کو جان) (والدہ) (پیدائش ۱۹۲۸/ وفات ۲۰۰۸)
مفتی اورنگزیب (زیبی)
مفتی عارف منیر
مفتی جان گل
نور جہان
ماہ جبین
مفتی محمد ایوب
مفتی محمد یعقوب
دوسری بیوی (قمر سلطان)
پہلی بیوی
عزیز گل مفتی
صداقت
نزاکت شاہین
باجی معراج
مفتی ممتاز
حناء
کرن
رخسانہ
ارجمند
وقاص
کاشف
۸۔ نزہت لقاء (روحی)
(پیدائش ۶ مارچ ۱۹۵۶)
۷۔ سنی
(پیدائش ۱۹۵۲ ـ وفات ۱۹۵۳)
۶۔ ثروت لقاء (پینزی)
(پیدائش ۱۱ اکتوبر ۱۹۵۱)
۵۔ احمد سعید مفتی
(پیدائش ۱۵ اگست ۱۹۵۰)
۴۔ طارق سعید مفتی
(پیدائش یکم جنوری ۱۹۴۸)
۳۔ خالد سعید مفتی (گل آغا)
(پیدائش ۱۶ اپریل ۱۹۴۶، وفات ۳ دسمبر ۱۹۹۱)
۲۔ خالد عطاء اللہ مفتی (خان گل)
(پیدائش ۳۱ دسمبر ۱۹۴۴)
۱۔ شہناز (بیٹی)
(پیدائش ۱۹۴۲، وفات ۱۹۴۳)
احمد ضیاء بابر (شوہر)
منظور احمد کرمانی (آغا لالا) (شوہر)
نزہت (زوجہ)
رخسانہ (زوجہ)
نسرین (زوجہ) (وفات ۲۰۱۸)
فرح عظمیٰ (زوجہ)
حسن
تاشفین
فرحان
عدنان
عثمان منظور
یاسر سلمان
ارسلان پاشا
ارم
زوہیر
ثناء
جواد
سعد
عائشہ
باسل
جنید
کرن
قمر عباس
مبشرہ سحر
عماد احسان
علی احسان
حراء (زوجہ)
طیب
شیرین (زوجہ)
زوبیہ (زوجہ)
انعم
منزہ
رابعہ
جواد احمد شاہ
ڈاکٹر عمر
کنزہ
عائشہ
عمران
سبین
رابعہ
آصف
شائستہ
سلمان
خوشبو (زوجہ)
حناء (زوجہ)
ریحان
حسان
لائبہ
ابراہیم
حمزہ
محبت
ماہم
مومن
ولی
حنیاؑ
عمر
عالیہ
عمار
آمنہ
حرم
آئمہ
حیا
یمنا
ریان
رمیز
مائیرہ
علیبہ
مریبہ
عفان
موسیٰ
حسن
ثانیہ
حراء
عمر
محمد
ضحیٰ
معیز
زینب (بیٹی)
مہک
علینہ
عالیار
ماہ لقاء
ایشاء
حوریہ
محمد عبداللہ
محمد
معید
ایماد
میاں رضوان
اذلان
مناہل
عبدالہادی

کلام ناتمام - تاثرآت

آپ بیتی جتنی سچی اور حقیقی زندگی کے قریب ہو اتنی ہی دلچسپ ہوتی ہے۔ یہ آٹو بائیو گرافی ڈاکٹر طارق مفتی کے بچپن، جوانی اور 40 برس پر محیط جراحی، انتظامی وتدریسی سفر کی داستان اور ماضی کے واقعات کا ایک خوبصورت گلدستہ ہے۔ 1950 اور 1960 کی دہائیوں میں پشاور شہر کے کلچر، روایات اور رسومات کی دلکش انداز میں نقشہ کشی کی گئی ہے۔ شائد موجودہ نسل کو "جھنڈوں کا میلہ" اور تاریخی "پیپل کے درخت" (جس سے مشہور پیپل منڈی منسوب ہے) کے بارے میں علم نہ ہو۔ گورنمنٹ پرائمری سکول گنج گیٹ میں داخلہ کے پہلے دن ہی کلاس ماسٹر کی ٹاٹ پر بیٹھے طلباء کو مار پیٹ سے خوف مصنف کے لیئے ایک اچھے پرائیوٹ سکول میں داخلہ کا سبب بن جاتا ہے۔ مصنف پرانی یادوں کے تذکرہ میں قصہ خوانی بازار، گھنٹہ گھر، مینا بازار، چوک یادگار اور اندرون شہر کی گلیوں کی سیر کرواتا ہے۔ کتاب میں پرائمری سکول، گورنمنٹ ہائی سکول نمبر 1، ایڈورڈ کالج اور خیبر میڈیکل کالج پشاور کے ادوار کا ذکر دلکش پیرائے میں کیا گیا ہے۔ بہت سے اساتذہ کی یادیں ہیں لیکن زیادہ محبت سے ذکر سید یوسف علی شاہ کا ہے جو نہ صرف ریاضی اور سائنس جیسے مشکل مضامین انتہائی خوبصورتی سے پڑھاتے بلکہ روزمرہ کے معمولات کا عملی طور پر سبق دیتے۔ مصنف نے اپنے گھر میں برآمد ہونے والے ایک سانپ کا تفصیلی خاکہ لکھا ہے لیکن نہ جانے کیوں زندگی کے اتنے طویل سفر میں اُنکو کسی آستین کے سانپ کا واقعہ نہی ملتا۔ کتاب کے آخر میں مصنف نے اپنے ذاتی مشاہدات، خاندان، احباب، پیر فقیر اور ہندکو کے بانی شاعر "سائیں" کا تذکرہ اس خوبصورت انداز میں کیا ہے جو قارئین کیلئے فیض نظر ثابت ہوگا۔

پروفیسر نورین وودود

ڈین، گندھارہ یونیورسٹی، پشاور

میں پروفیسر ڈاکٹر طارق سعید مفتی کو ماہر شعبہ سرجری، بطور استاد و منتظم تعلیمی امور تو کئی عرصہ سے جانتی تھی مگر اس آپ بیتی ''کلام ناتمام'' میں مصنف نے اپنی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو جس مسحور کن انداز میں صفحۂ قرطاس پر بکھیرا ہے۔ اس سے کتاب کا ہر صفحہ میرے لیئے دلچسپی کا باعث بن گیا مزید یہ کہ کہیں بھی اُکتاہٹ کا احساس نہ ہوا۔ انھوں نے اپنی بچپن سے لے کر اب تک کی یاداشتوں کو بخوبی اپنے الفاظ میں یوں بیان کیا کہ جس سے تجسس کا عنصر غالب رہتا ہے۔ ان کی اس سرگزشت کے تاریخی حقائق کا موازنہ جب میں نے ان کے زیر سایہ گزرے ہوئے سالوں سے کیا تو حیرت انگیز طور پہ ہر لفظ سچائی کی تصویر نظر آئی۔ انکی لیڈرشپ کوالٹی، سکھانے کا خوبصورت انداز، مشکل سے مشکل کام کو آسان بنانا، صبر وضبط اور ایمانداری کتاب میں بنظر اُتم موجود ہے۔ مختصر یہ کہ بظاہر مصنف کا مقصد نہ صرف کماحُقہ پورا ہوتا دکھائی دیتا ہے بلکہ قارئین کو بھی احساس تشنگی باقی نہیں رہتا۔ مصنف نے اپنے خاندان اور دیگر نسبتوں کے متعلق خاطر خواہ معلومات قلم بند کر کے آنے والی نسلوں اور قارئین کے لئے وجہ تسکین مہیا کر دیا ہے۔

سفینہ کوثر

اسسٹنٹ مینجر لائبریری، رحمان میڈیکل انسٹیٹیوٹ، پشاور

سابقہ لائبریرین گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج فار گرلز ضلع ہری پور